رئیس امروہوی

فن و شخصیت

مرتبہ

صہبا لکھنوی

○ رئیس امروہوی

○ فن و شخصیت

رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

رئیس امروہوی کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے نیازمندانِ رئیس نے رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ قائم کیا ہے جس کے مقاصد یہ ہیں :۔

- علم و ادب کا فروغ
- سلسلۂ درس و تدریس
- دارالمطالعوں کا قیام
- نفسیات و مابعدالنفسیات کے علم کا احیاء
- انسان دوستی اور احترامِ آدمیت کے پرچم کو سربلند رکھنا
- رئیس امروہوی کے مزار کی تعمیر و توسیع۔

ٹرسٹ کے منتخب اراکین :۔

○ جناب میر خلیل الرحمٰن ۔ چیرمین ○ پروفیسر بزم انصاری ۔ منیجنگ ٹرسٹی ○ جسٹس صلاح الدین مرزا ۔ ٹرسٹی ○ جناب اشفاق احمد میمن ۔ ٹرسٹی ○ جناب سید محمد تقی ۔ ٹرسٹی ○ بیگم رئیس امروہوی ۔ ٹرسٹی ○ جناب محمد محمود احمد ٹرسٹی ○ جناب عبدالحفیظ باحلیم ۔ ٹرسٹی ○ جناب ایم ایم ۔ بخشی ۔ ٹرسٹی ○ جناب اقبال مہدی ۔ ٹرسٹی ○ جناب ڈاکٹر محمد سلیمان ٹرسٹی ○ جناب سلام دادا بھائی ۔ ٹرسٹی ○ جناب عبدالقادر توکل ۔ ٹرسٹی ○ جناب حاجی محمد شفیع اسٹیل والا ٹرسٹی ○ جناب عبدالنعیم ۔ ٹرسٹی اور ○ جناب اختر فیروز ۔ ٹرسٹی جنرل سکریٹری۔

ٹرسٹ کی مجلسِ انتظامیہ میں :۔

پروفیسر بزم انصاری ۔ صدر، جسٹس صلاح الدین مرزا ۔ نائب صدر، جناب اختر فیروز جنرل سکریٹری، جناب یوسف القادری ۔ ڈپٹی جنرل سکریٹری، جناب ایم ۔ ایم ۔ بخشی جناب عبدالقادر توکل ۔ ناظم مالیات، جناب شان الحق حقی ۔ ناظم ادبیات، جناب شاہد احمد خاں ۔ سکریٹری نشر و اشاعت، محترمہ شاہانہ رئیس، جناب منظر علی خاں، جناب محمد عالمین، جناب ایم ۔ بی ۔ صدیقی، جناب عبدالنعیم، جناب ایم ۔ آئی ۔ ارشد، اور جناب سید عارف اللہ شامل ہیں۔

رئیس امروہوی

فن و شخصیت

مُرتّبہ

صہبا لکھنوی

ناشر

رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ کراچی

جملہ حقوق بحق رئیس امروہوی ٹرسٹ محفوظ

○ پہلی بار ــــــــ اگست ۱۹۹۰ء

○ سرورق ــــــــ اقبال مہدی

○ کتابت ــــــــ عبدالرحیم انصاری

○ طباعت ــــــــ مشہور آفسٹ پریس کراچی

○ تعداد ــــــــ گیارہ سو

○ قیمت ــــــــ [redacted] روپے

○ ناشر ــــــــ رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

۱۵/۱۔ بلاک ڈی۔ ۴۔ ۱۰ ارشد پلازہ پہلی منزل

ابن سینا روڈ۔ ناظم آباد۔ کراچی۔ فون: ۶۱۰۴۹۶

ترتیب

	گفتنی، ناگفتنی	صہبا لکھنوی	9
	نادر و یادگار تصاویر	ادارہ	١٧
	رئیس امروہوی - ایک جائزہ	صہبا لکھنوی	٣٣
	پیغامات، تاثرات، تذکرے، تبصرے	مشاہیر اہلِ قلم	٤٦
فکر و فن، جائزے	رئیس کی شاعرانہ عظمت	سید ذہین شاہ تاجی	١٠٨
	فن کاری ابلاغ	پروفیسر شور علیگ	١١٥
	رئیس امروہوی کی یاد میں	ڈاکٹر حنیف فوق	١٢٣
	اپنی خاکستر جاں میں مدفون	ڈاکٹر ابوالخیر کشفی	١٢٩
	رئیس امروہوی ۔ جام جہاں نما	محمد علی صدیقی	١٣٩
	رئیس امروہوی کے قطعات	اکرام بریلوی	١٧٠
	گہرے سمندروں کا سفر	شبنم رومانی	١٧٩
	رئیس امروہوی کے نام ایک خط	حمایت علی شاعر	١٨٨
	رئیس امروہوی، فکر و فن کی روشنی میں	نقاش کاظمی	١٩٥
	رئیس امروہوی کا فارسی کلام	ڈاکٹر خیال امروہوی	٢٠٠
	رئیس امروہوی کی روحانی قوتیں	اقبال عثمانی	٢١١
خودنوشت، انٹرویو	رئیس کا زائچہ	سید محمد حسین رضوی	٢١٦
	بقلم خود	رئیس امروہوی	٢٢٣
	رئیس کی کہانی، رئیس کی زبانی	"	٢٢٧
	بلفظ خود و بقلم خود	"	٢٣٨
	رئیس امروہوی مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ انٹرویو	آسیہ سحر	٢٥٩
	رئیس امروہوی مرحوم سے آخری انٹرویو	فیاض اعوان	٢٦٨
	خود تماشا ہوں خود تماشائی	رئیس امروہوی	٢٨١

شخص و عکس، یادیں اور باتیں	حضرت رئیس امروہوی کی تحریک کے بارے میں	سید محمد تقی	۳۰۰
	موت کے بعد	" "	۳۰۶
	کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں	زاہدہ حنا	۳۱۲
	لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں	شاہانہ رئیس	۳۲۱
	میں رئیس صاحب کا کالم ہوں	سید قاسم محمود	۳۲۶
	رئیس امروہوی ۔ ایک نادر شخصیت	پروفیسر بزم انصاری	۳۳۱
	رئیس القلم	" " "	۳۳۷
	بابا، حضرت رئیس امروہوی کا خاکہ تھا	منظر علی خاں	۳۴۱
	رئیس امروہوی ۔ ایک نابغہ روزگار شخصیت	فہمی اکبر آبادی	۳۵۲
	اپنا لہو تلاش کروں	ڈاکٹر عالیہ امام	۳۶۶
	رئیس بھائی	ڈاکٹر اسلم فرخی	۳۷۰
	ایک رئیس القلم چلا گیا	مختار زمن	۳۷۵
	شہید انسانیت	ایم۔ یوسف قادری	۳۸۲
	عظیم ادبی شخصیت رئیس امروہوی مرحوم	کوثر رضوی	۳۸۶
	رئیس امروہوی کینیڈا میں	پروفیسر ضیا علیگ	۳۹۳
خراجِ عقیدت، نذرانے	بزم انصاری، شان الحق حقی، راغب مراد آبادی، محشر بدایونی، ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی، حفیظ شاہد، عروج زیدی، ظہیر نفیسی، اسلم غازی، سید قدرت نقوی، راغب مراد آبادی، قمر ہاشمی، عبدالعزیز خالد، مشتاق شاد، بشیر فاروق، نازش رضوی، شمس تسنیم، خورشید احمر، اختر سعیدی، شاہانہ رئیس امروہوی		۴۱۹ تا ۴۴۱
انتظاریہ	میر خلیل الرحمٰن، ایم۔ ایم بخشی، عبدالحفیظ باطلیم، اختر فیروز، شاہد احمد خاں، حاجی محمد شفیع		۴۴۲

○

انتساب

اُن تمام دانشوروں کے نام جو ساری عمر حسن، خیر اور نیکی کے مبلغ رہے لیکن انسانیت دشمن افراد کے ہاتھوں قتل ہوئے

maablib.org

صہبا لکھنوی

گفتنی، ناگفتنی

۱۹۴۰ء میں رئیس بھائی سے میری پہلی ملاقات دہلی میں روزنامہ "انصاری" کے دفتر میں ہوئی تھی، اور پہلی ملاقات میں ہی برادرانہ روابط قائم ہوگئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں جب کراچی آیا تو جن ممتاز شخصیتوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں قدرت اللہ شہاب، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، رئیس امروہوی، پروفیسر ممتاز حسین، شوکت صدیقی، ابن انشا، مجتبیٰ حسین، ابراہیم جلیس، ظہور نظر اور ریاض روفی وغیرہ شامل تھے۔ ان تمام مشاہیر سے ماہنامہ افکار، بھوپال کے وسیلے سے قلمی تعلق قائم تھا اس لیے کراچی کی ملاقاتیں دوستی اور محبت کے رشتوں میں استحکام کا ذریعہ بن گئیں۔ پھر جب ۱۹۵۱ء سے افکار کراچی نے اپنا ادبی سفر نئے سرے سے شروع کیا تو سبھی رفیقوں نے ممکنہ تعاون سے دریغ نہیں کیا۔ خصوصیت کے ساتھ رئیس بھائی نے بہت حوصلہ بڑھایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بقول کسے

مصرع خاک کے ذرے ہوائے تند میں برباد تھے

ادبی رسالوں کا قحط تھا۔ لے دے کے "ماہِ نو" تھا جو حکومت کا رسالہ تھا، اور ماہنامہ عصمت اور ماہنامہ ساقی صبر آزما حالات سے دوچار تھے۔ ایسے میں افکار کا اجرا حوصلہ آزما ہی نہیں، صبر و استقامت کا متقاضی بھی تھا۔ راقم الحروف نے رات دن محنت کر کے افکار کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھا۔ بالآخر مولانا رازق الخیری، مدیر عصمت

اور شاہد احمد دہلوی، مدیر "ساقی" کی سعی و کاوش سے ـــــ انجمن ادبی رسائل پاکستان کا قیام ۱۹۵۳ء میں عمل میں آیا تو مولانا رازق الخیری اس انجمن کے صدر، شاہد احمد دہلوی، جنرل سکریٹری اور راقم الحروف سکریٹری منتخب ہوئے اور ہم نے علمی، ادبی، فنی رسالوں کی بقا کے لیے اجتماعی کوششوں کا آغاز کیا اور تمام متعلقہ شعبوں کے سربراہوں سے براہ راست روابط پیدا کر کے ادبی رسالوں کے کچھ مسائل حل کرا لیے۔ اسی سلسلے میں رئیس بھائی سے بھی متعدد بار ملاقاتیں کیں اور ان کے ماہرانہ مشوروں سے استفادہ کیا۔ وہ ان دنوں ہفت روزہ "شیراز" نکالتے تھے۔

بات کچھ دور جا پڑی ـ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ رئیس بھائی چونکہ "جنگ" سے وابستہ تھے لہٰذا ان کی معاونت انجمن کے مقاصد کے حصول میں کام آئی۔ کراچی کی متعدد شخصیتوں سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ لہٰذا ان کے بھرپور تعاون سے انجمن کی سرگرمیوں کو مہمیز نصیب ہوئی ـــــ اور اس کے کئی بڑے اجتماعات منعقد ہوئے۔

رئیس بھائی ـــــ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ان کے دوستوں، پرستاروں، شاگردوں اور نیازمندوں کا وسیع حلقہ تھا۔ وہ نہایت سادہ مزاج، ہمدرد، مشفق اور قلندرانہ صفات کے حامل تھے۔ قدرت نے انھیں قادر الکلامی اور زود گوئی کی لازوال صفات سے متصف کیا تھا۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، صحافی اور ماہرِ نفسیات ہی نہیں ـــــ حیات و کائنات کے نبض شناس بھی تھے۔ اردو اور فارسی پر کامل دسترس کے علاوہ انگریزی پر بھی انھوں نے بطور خود عبور حاصل کر لیا تھا اور فلسفہ و حکمت کے مسائل بھی ان کی تحریروں میں ـــــ ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے غماز تھے۔ جوش جیسے عظیم المرتبت شاعر نے رئیس بھائی کی ادبی عظمت کا جس طرح اعتراف کیا ہے وہ ہماری ادبی تاریخ کا روشن باب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"رئیس کو میں جس قدر سمجھتا ہوں اس کا خلاصہ یہ
ہے کہ انھوں نے غزل کے روایتی اور رَوندے ہوئے
کوچے میں کبھی قدم نہیں رکھا ـــــ انھوں نے قافیوں

کی انگلی پکڑ کر کبھی سفر نہیں کیا ـــــ انھوں نے حیات،
مسائلِ حیات اور اسرارِ کائنات پر براہ راست غور
کر کے جو نتائج اخذ اور جو تاثرات قبول کیے ہیں ان کو
نہایت روانی اور گوہر فشانی کے ساتھ ادا کیا ہے اور
اسی بنا پر ان کی شاعری ـــــ شعر و حکمت کا ایک ایسا
نقطۂ اتّصال بن گئی ہے جس پر ہماری زبان اور ہماری
شاعری ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔"

روزنامہ "جنگ" میں روزمرہ کے اہم واقعات اور مسائلِ حیات پر رئیس بھائی کے قطعے نے نہ صرف "جنگ" کی انفرادیت اور مقبولیت میں اضافہ کیا بلکہ رئیس بھائی کی اعلیٰ فنی صلاحیت کا بھی عوام و خواص نے اعتراف کیا ـــــ خود جوش صاحب ان کی اس صلاحیت کار کے اس درجہ مدّاح و قدردان تھے کہ رئیس بھائی کی قطعہ نگاری کے بارے میں انھیں یہ کہنا پڑا ـــــ

"ذرا سوچیے تو سہی روزانہ مسائل پر قطعہ کہنا
اور پھر چھپتا ہوا قطعہ کہنا آدمی کا نہیں دیو کا کام ہے
اور اسی ایک بات پر نگاہ کر کے اس امر کا کان پکڑ کر
اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ رئیس کو الفاظ، طرزِ بیان اور
خیالات پر اس بلا کی قدرت اور فرماں روایانہ اقتدار
حاصل ہے کہ آج کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رئیس ہی وہ تنہا
شاعر ہے جس نے ڈنکے کی چوٹ ثابت کر دیا ہے کہ زودگوئی
اور معیاری شاعری میں تضاد و عناد نہیں ہے۔"

اس مضمون کے آخر میں جوش نے رئیس کے ایک شعر کے بدلے میں اپنا تمام کلام دینے کی پیش کش کا جس طرح اظہار کیا ہے ـــــ اس کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی

تھیں ـــــ فرماتے ہیں :۔

"اب میں آخر میں ان کا ایک انوکھا اور حقائق
در آغوش شعر نقل کر کے اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں ۔
شعر یہ ہے ؎

شاید اسے عشق بھی نہ سمجھے
جس کرب میں عقل مبتلا ہے

اس شعر کا سمجھنا اور اس کی داد دینا آسان کام نہیں۔
"اگر میرا تمام کلام لے کر رئیس اپنا یہ شعر دے
دیں تو میں اپنے کو قارون زماں سمجھنے اور
؏ ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد
کے نعرے لگانے لگوں۔"

جوش اور رئیس ـــــ دونوں ہی اپنے عصر و عہد کے باکمال اور قدآور شاعر ہیں ۔ اگرچہ دونوں کے فکر و میلان کی راہیں الگ الگ ہیں ۔ ان دونوں میں بڑی مماثلتیں ہیں ـــــ دونوں بے حد زود گو تھے ـــــ دونوں اردو اور فارسی پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبّت کرتے تھے ـــــ زبان و بیان کی صحت کا دونوں خیال رکھتے تھے ـــــ اور کراچی کے قیام کے دوران ہفتے میں ایک بار جوش ـــــ رئیس کے یہاں ضرور جاتے تھے اور دو ڈھائی گھنٹے کی نشست میں ادبی مسائل اور حالات حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے ـــــ ایک دو بار راقم الحروف کو بھی ان محفلوں میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی ۔

جوش کے پاکستان آجانے پر جب ان کے خلاف مراسلات کا سلسلہ شروع ہوا تو رئیس ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ان کا دفاع کیا ۔ جوش کی اس مخالفت کے دور میں جب راقم الحروف نے "جوش نمبر" کا اعلان کیا تو رئیس بھائی نے سب سے زیادہ میری حوصلہ افزائی کی اور ایک کے بجائے دو نظمیں جوش کی ادبی عظمت کے

اعتراف میں لکھ کر اشاعت کے لیے عنایت کیں۔ یہ نظمیں "جوش نمبر" میں شامل ہیں جو ۱۹۶۱ء میں پہلی بار اور کئی قیمتی اضافوں کے بعد دوسری بار ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا اور جامعہ کراچی کے بی اے آنرز اور ایم اے اردو میں شاملِ نصاب ہوا۔

۱۹۶۱ء میں جب ہم نے "جشنِ جوش" کا انعقاد کیا تو یہ رئیس بھائی ہی تھے، جنھوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور راجہ صاحب محمود آباد کی صدارت میں ــــ شیخ عبدالخالق عبدالرزاق کی پُرشکوہ کوٹھی پر تقریباً پندرہ سو ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کے اجتماع میں ــــ زندہ دوستی اور اعترافِ عظمت کی یہ پہلی مثالی پیش کش جوش کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

جوش کی طرح رئیس بھائی بھی ہمیشہ اپنی ذات، اپنے فکر و فن اور اپنی ادبی عظمت سے بے نیاز رہے ــــ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ "جشنِ جوش" کے بعد جب نیازمندانِ رئیس نے ۱۹۷۱ء میں "جشنِ رئیس" کا اہتمام کیا تو زندہ دوستی کی نئی روایت کو استحکام ملا۔ رئیس بھائی کی خواہش پر ہم سب نے مل کر "جشنِ رئیس" کو بھی کراچی کی ادبی تاریخ کا حصّہ بنایا۔ جشن کے بعد راقم الحروف نے رئیس بھائی سے ایک دوبار عرض کیا کہ آپ کے بارے میں جتنا کچھ مواد مل سکے مجھے فراہم کردیں تو میں ایک جامع کتاب مرتب کردوں۔ لیکن وہ ــــ "ہاں بھائی ضرور" کہہ کر بات ختم کردیتے تھے۔ آخر اپریل ۱۹۸۰ء میں ــــ "جشنِ ندیم" ابوظبی اور دوبئی میں منعقد ہوا تو ندیم بھائی کی صدارت میں جمیل الدین عالی کی تحریک پر آئندہ "جشنِ رئیس" کا اعلان ہوگیا تو جشن کے کرتا دھرتا اظہار حیدر نے رئیس صاحب کے سلسلے میں کچھ ذمّے داریاں اس حقیر کے بھی سپرد کردیں۔

کراچی آنے کے بعد پھر "ہجومِ افکار" میں گھر گیا۔ ایک دن ابوظبی سے اظہار حیدر کا فون آیا کہ "جشنِ رئیس" کے سلسلے میں سرگرم ہوجاؤں تو میں نے جلد ہی رئیس بھائی سے ملاقات کا وقت طے کرکے شاید جون ۱۹۸۰ء میں محمد علی صدیقی اور سحر انصاری کے ہمراہ رئیس بھائی سے تفصیلی گفتگو کی۔ ابوظبی کے جشن میں جانے والوں کی فہرست بنائی گئی۔ یہ طے کیا کہ کون کون کس کس موضوع پر مضامین لکھیں گے۔ حالاتِ زندگی مرتب کرنے کا

فیصلہ ہوا جس کی تمام تر ذمے داری اظہار حیدری نے مجھ پر ڈال دی تھی۔

رئیس بھائی نے کہا کہ میں از سرِ نو حالات قلمبند کر کے بھیج دوں گا ۔ اس موقع پر میں نے پھر گزارش کی کہ اگر اب بھی آپ کے بارے میں کچھ مواد مہیا ہو جائے تو "جشن رئیس" کے موقع پر ایک کتاب "ارمغانِ رئیس" کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کر دی جائے ۔ رئیس بھائی نے کہا کہ دوبارہ ملاقات ہوگی تو جو چیزیں دستیاب ہو گئی ہیں ـــــ مہیا کر دوں گا ۔

شاید جولائی ۱۹۸۳ء کے آخر میں اظہار حیدری ابوظبی سے کراچی آئے تو رئیس بھائی کے یہاں ملاقات کا دن اور وقت طے ہو گیا ۔ چنانچہ پانچ بجے کے قریب میں رئیس بھائی کے یہاں پہنچ گیا تو انھوں نے ایک بڑا لفافہ میرے حوالے کر دیا ۔ کھول کر دیکھا تو اس میں برِ صغیر پاک و ہند کے تمام قابلِ ذکر ادیبوں ، شاعروں اور دانشوروں کے ان کے مجموعے "الف" "جشن رئیس ، کراچی" اور مجموعہ "پسِ غبار" سے متعلق پیغامات ، تاثرات ، تذکرے اور تبصرے اور ایک دو مختصر مضمون شامل تھے ۔ میں نے عرض کیا کہ اب کام شروع کر دوں گا ۔

کچھ دیر کے بعد اظہار حیدری ، اقبال مہدی دو فوٹو گرافروں کے ساتھ تشریف لے آئے اور ہم رئیس بھائی کی بیٹھک سے نکل کر سید محمد تقی کے لان میں آ گئے جہاں سات آٹھ کرسیاں سلیقے سے آراستہ تھیں ۔ لان میں پہنچ کر پہلے رنگین کیمرے سے تصاویر اتاری گئیں ـــــ پھر بلیک اینڈ وائٹ کیمرہ استعمال ہوا ۔ کچھ تصاویر رئیس بھائی کی تنہا اتاری گئیں ۔ کچھ تقی بھائی کے ساتھ ـــــ کچھ ہم سب کے ساتھ ۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو چائے آ گئی اور چائے کے دوران "جشنِ رئیس" کے سلسلے میں گفتگو ہوتی رہی ۔ کوئی دو گھنٹے بعد ہم لوگ رخصت ہوئے ۔

گھر پہنچ کر رئیس بھائی کے عطا کردہ مسودات کا میں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا اور انھیں سلیقے سے ترتیب دے کر ـــــ "ارمغانِ رئیس" کی تیاری شروع کر دی ـــــ یہی نہیں بلکہ افکار میں اس کا اعلان بھی کر دیا ۔

اگست ۱۹۸۸ء کے دوران دو تین بار رئیس بھائی کے فون آئے تو میں نے عرض کیا کہ کتابت شروع کرا دی ہے۔ ادھر مصروف رہا اس لیے حاضر نہ ہو سکا ——— انشاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ آپ نے ۱۹۸۶ء میں میرے سوالنامے کے جواب میں جو حالات تحریر کیے تھے ——— وہ میں ستمبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں "بقلم خود" کے عنوان سے شائع کر رہا ہوں۔ چنانچہ اشاعت کے بعد یہ شمارہ میں نے منظر علی خاں کے ہاتھ رئیس بھائی کو بھجوا دیا۔

قدرت کا عجب نظام ہے۔ انسان کیا کچھ سوچتا ہے ——— کیسے کیسے منصوبے بناتا ہے لیکن آنِ واحد میں سارے خواب بکھر جاتے ہیں۔

ادھر ہم لوگ "جشنِ رئیس" کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ ستمبر کی بائیسویں تاریخ کو ایک شقی القلب نے رئیس بھائی کو گولیوں کا نشانہ بنا کر انھیں قتل کر دیا اور شہر کراچی ہی نہیں برِ صغیر ان کے غم میں سوگوار ہو گیا۔

رئیس بھائی کا یہ قتل ایک بلند پایہ اور نابغۂ روزگار شخصیت کا قتل ہی نہیں بیسویں صدی کی تہذیب و انسانیت کا قتل ہے۔ اس قتل سے یہ گتھی آج تک نہیں سلجھی کہ جس شخصیت کا بظاہر کوئی دشمن نہ تھا ——— وہ دشمن کب سے گھات لگائے تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ "جشنِ رئیس" برپا ہو سکے۔ لیکن قاتل کو شاید یہ علم نہ ہو کہ انسان تو مر سکتا ہے ——— اس کے کارنامے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ چنانچہ رئیس بھائی ——— بچھڑتے کے باوجود ہزاروں لاکھوں دلوں میں، علم و ادب کے ایوانوں میں کل سے زیادہ آج زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

"ارمغانِ رئیس" کو میں نے ایک فریضہ سمجھ کر مرتب کیا تھا جسے اُن کی نا وقت جدائی کے بعد ——— "رئیس امروہوی ——— فن و شخصیت" ——— کے عنوان سے پیش کر رہا ہوں یہ تبدیلی دو وجوہ سے کرنی پڑی۔ نیاز مندانِ رئیس نے ——— ان کی پہلی برسی ستمبر ۱۹۸۹ء میں وسیع پیمانے پر منانے کا اہتمام کیا اور مجھ سے خواہش کی کہ پہلی برسی پر یہ کتاب شائع ہو جائے ——— دوسرے کم وقت کے سبب پاک و ہند کے تمام رئیس دوستوں سے

مضامین اور مقالوں کی فراہمی کسی طور ممکن نہ تھی۔ چنانچہ رئیس بھائی کے عطا کردہ مواد کے بعد جو کچھ ان کی وفات کے بعد ان کے قریبی عزیزوں، رشتے داروں اور احباب نے مضامین تحریر کیے (اور جو ظاہر ہے روزنامہ "جنگ" میں چھپے) انھیں محفوظ کرنا ضروری سمجھا۔ ادھر ادھر جو چند مضامین رسالوں میں شائع ہوئے اور جو راقم الحروف نے بطورِ خاص لکھوائے وہ سب اس کتاب میں شامل ہیں —— پھر بھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ رئیس بھائی کی پچاس سالہ خدمات کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ لیکن بس اتنا اطمینان ضرور ہے کہ رئیس بھائی سے کیا ہوا وعدہ پورا ہو گیا ہے اور مستقبل میں رئیس بھائی پر کام کرنے والوں کے لیے بنیاد فراہم کر دی گئی ہے۔ ان پر مختلف جہتوں سے کام کرنے کی ضرورت ہے —— اگر کچھ حوصلہ مند نوجوان رئیس بھائی پر تحقیقی کام جامعات میں شروع کر دیں تو گزشتہ نصف صدی میں رئیس امروہوی کی گراں مایہ خدمات کا سیر حاصل جائزہ مرتب ہو جائے گا یہ کام صرف جامعات میں ہی ہو سکتا ہے۔ نیازمندانِ رئیس کو اس جانب بھی توجہ دینا چاہیے۔

آخر میں رئیس بھائی کے تمام ورثا، احباب، نیازمند، رئیس میموریل اکیڈمی کے سربراہ بزم انصاری (جو رئیس بھائی کے سب سے قدیم اور معتبر نیازمند ہیں) میر خلیل الرحمٰن اور ان کا اخبار "جنگ" ہم سب کے دلی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے رئیس بھائی کی یاد تازہ رکھنے کے لیے —— رئیس میموریل اکیڈمی اور رئیس ٹرسٹ قائم کر دیے۔ زندہ قومیں اور افراد اپنے مشاہیر کو اور ان کے لازوال کارناموں کو اسی طرح خراجِ عقیدت پیش کرتی ہیں۔

۱۴ راگست ۱۹۸۹ء مطابق ۱۱ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

رئیس کے والد محترم علامہ سید شفیق حسن ایلیا (فوٹو: ۱۹۳۶ء)

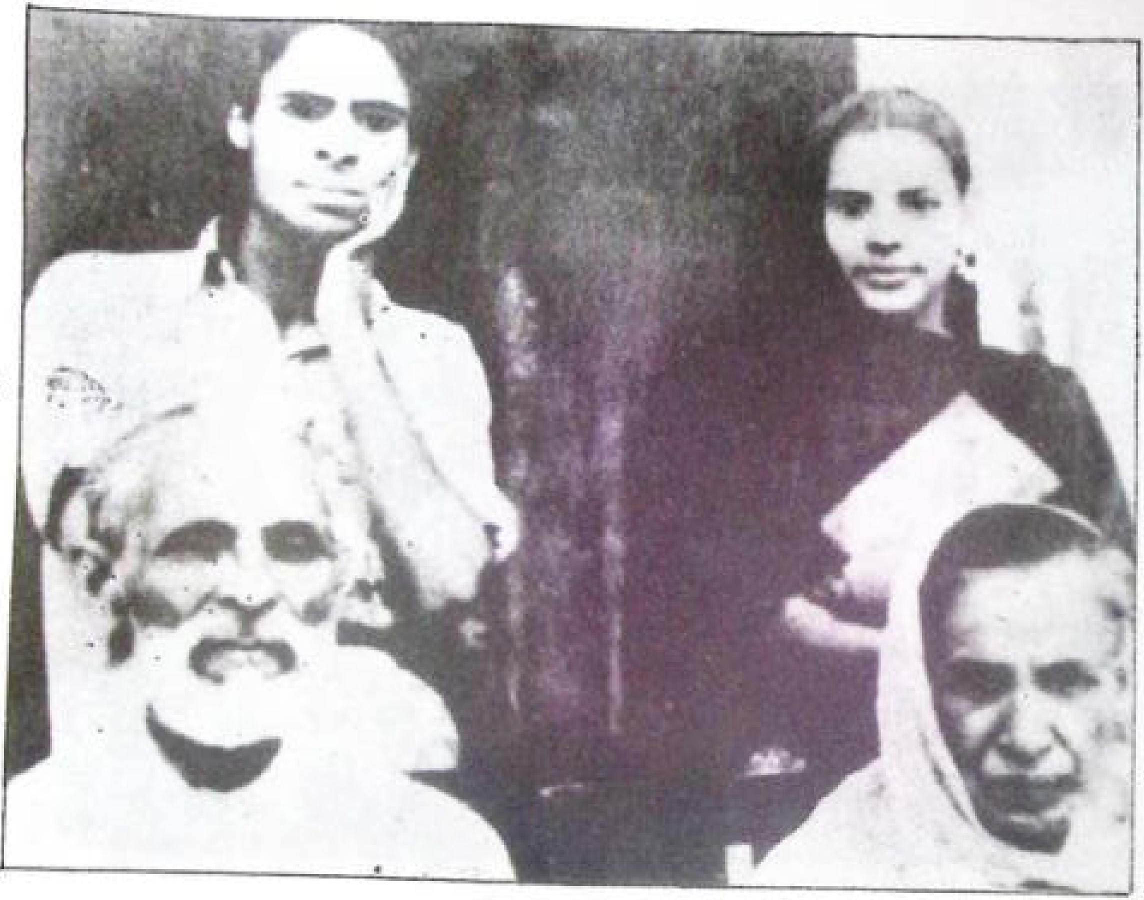

رئیس کی بہن - نجفی شفاعت
چھوٹے بھائی - جون ایلیا
رئیس کی والدہ محترمہ نرجس خاتون
والد، علامہ سید شفیق حسن ایلیا
(فوٹو: ۱۹۳۶ء)

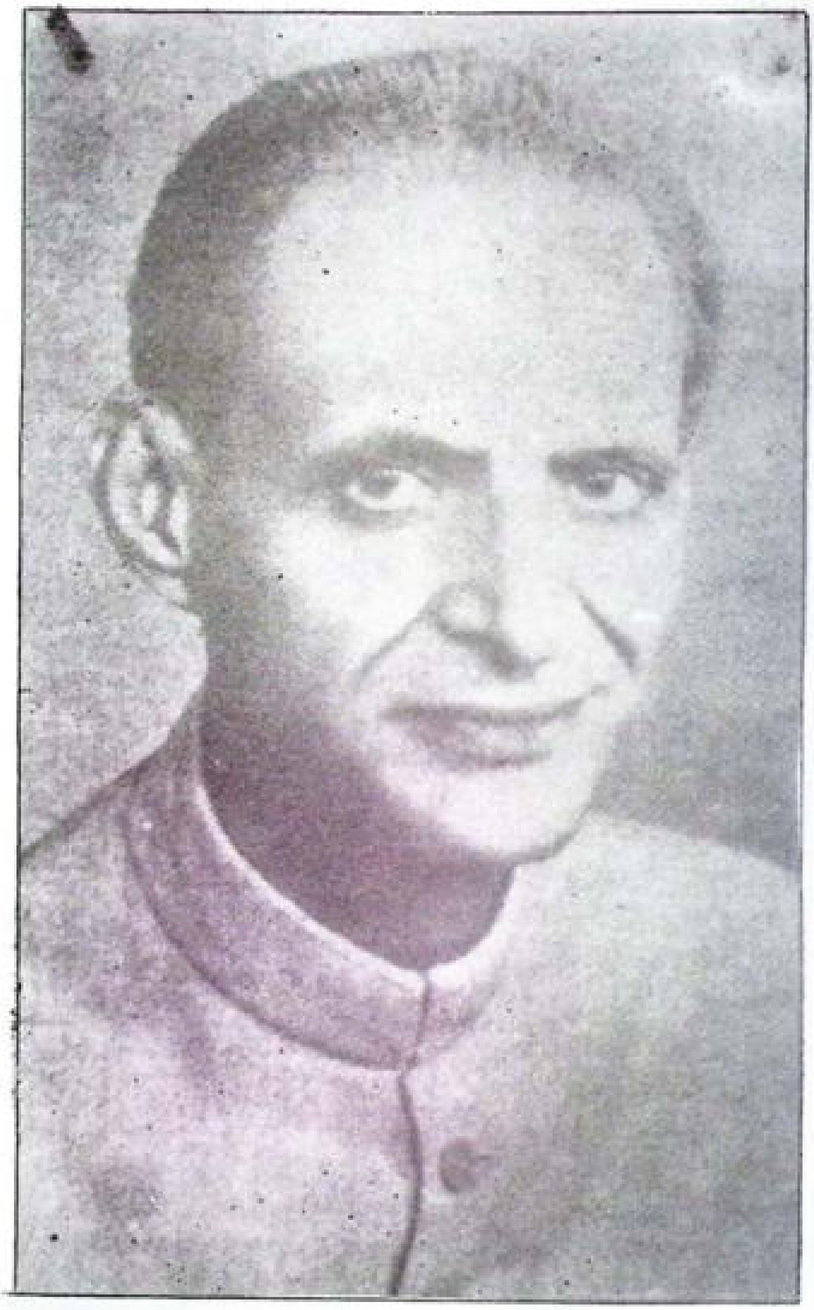

رئیس امروہوی ـــــــ عہدِ جوانی

رئیس امروہوی ـــــــ عہد پیری

جنت زینب ۔ بیگم رئیس امروہوی ۔ نواسہ ، نواسی کے ساتھ

رئیس اور رئیس کی بیٹیاں رشبادہ ۔ ریحانہ ۔ فرزانہ ۔ صائمہ ۔ غفران ۔ داماد سبط اختر
نواسوں اور نواسیوں کے ساتھ

ایک یادگار تصویر رئیس امروہوی اور نیمی الہ آبادی (فوٹو: ۱۹۴۳ء)

(دائیں سے) عبدالرحمٰن ۔ رئیس امروہوی ۔ نیمی الہ آبادی فوٹو: ۱۹۷۳ء

(دائیں سے) محمد علی صدیقی ۔ رئیس امروہوی ۔ خلیق زبیری ۔ کمال امروہوی اور دیگر احباب

(دائیں سے) روحی بانو ۔ کمال امروہوی ۔ رئیس امروہوی

(دائیں سے)

سید محمد تقی ۔ راغب مرادآبادی

اور رئیس امروہوی

شان الحق حقی اور رئیس امروہوی

سید محمد تقی کے مکان پر۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے عصرانے میں (دائیں سے)، انجم اعظمی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی
صہبا لکھنوی اور رئیس امروہوی (فوٹو: ۱۳ جولائی ۱۹۷۶ء)

۱۸ ستمبر ۱۹۸۳ء کو بین الاقوامی اردو کانفرنس منعقدہ ٹورنٹو میں (دائیں سے)، صہبا لکھنوی
رئیس امروہوی۔ عروج زیدی اور محمد علی صدیقی

کنور مہندر سنگھ بیدی کی کتاب "یادوں کا جشن" میں رئیس امروہوی۔ گوپی چند نارنگ۔ بزم انصاری۔ نازش رضوی
یوسف القادری۔ دیگر احباب کے ساتھ

پاکستان رائٹرز گلڈ کی ایک ادبی تقریب میں (دائیں سے) افسر ماہ پوری۔ جلیل ساگر۔ رئیس امروہوی۔
ڈاکٹر جمیل جالبی۔ حق نواز اختر۔ مظفر علی خاں اور نقاش کاظمی

ترقی اردو بورڈ (جواب اردو ڈکشنری بورڈ ہے) کی ایک نایاب تصویر میں (دائیں سے) جون ایلیا۔ سید محمد تقی۔ رئیس امروہوی۔ بزم انصاری۔ شکیلہ خانم اور دوسرے۔ (فوٹو بہ شکریہ: سید انیس شاہ جیلانی)

غالب لائبریری کے افتتاح کے موقع پر (دائیں سے) رئیس امروہوی۔ محسن بھوپالی اور شبنم رومانی
(فوٹو: ۲۲ جولائی ۱۹۷۰ء)

رئیس امروہوی اکیڈمی کے زیرِ اہتمام منظر علی خان کی کتاب "مگر ذکر کیے بغیر" میں
منظر علی خان اور رئیس امروہوی (فوٹو: ۱۹۸۳ء)

اپنے عزیز شاگرد یوسف القادری کو خصوصی انٹرویو دینے کے بعد۔ گارڈن کے ایک اسٹوڈیو میں۔
(فوٹو: ۶ جنوری ۱۹۸۹ء)

مبارک اردو لائبریری ۔ محمد پور میں رئیس امروہوی ۔ سید انیس شاہ جیلانی (دائیں سے پہلے)
دیگر احباب کے ساتھ (فوٹو بشکریہ: سید انیس شاہ جیلانی)

(دائیں سے) کنور مہندر سنگھ بیدی ۔ سردار جعفری اور رئیس امروہوی دیگر شعرا کے ساتھ ایک مشاعرے میں

امروہہ کی ایک ادبی تقریب میں ۔ (دائیں سے) محمود احمد، کمال امروہوی ۔ مہمان خاتون ۔ رئیس امروہوی اور اختر نیر دز

رام پور کے مشاعرے میں (دائیں سے) بزم انصاری - رئیس امروہوی - صدر اردو اکیڈمی رامپور

شہادت سے چند ماہ پہلے۔ جشن رئیس امروہوی (ابوظبی) کے منتظمین کے ساتھ (دائیں سے) سید محمد تقی
رئیس امروہوی - اظہار حیدر - صہبا لکھنوی اور اقبال [illegible] (فروری ۱۹۸۸ء)

ایک ادبی تقریب میں رئیس امروہوی۔ گوپی چند نارنگ۔ بزم انصاری۔ نقاش کاظمی اور دیگر احباب کے ساتھ

ایک ادبی تقریب میں۔ رئیس امروہوی۔ سید محمد تقی۔ ڈاکٹر حنیف فوق۔ شبنم رومانی۔ ڈاکٹر عقیلہ کیانی۔
سلطانہ مہر۔ ڈاکٹر شمیم آرا عارف۔ انور نزہت۔ قمر سعید باردی۔ شان الحق حقی۔ اکرام بریلوی۔
منظر علی خاں۔ احمد الطاف۔ نازش رضوی اور دیگر احباب سجاد حیدر زیدی فوٹو، ۲؍ستمبر ۱۹۸۶ء (ع)

صہبا لکھنوی

رئیس امروہوی

زندگی، فن و شخصیت کا جائزہ

پیدائش : ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء بہ مقام امروہہ (ضلع مراد آباد)
وفات : ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء بہ مقام کراچی

خاندانی نام ــــــ سید محمد مہدی عرف اچھن

قلمی نام ــــــ رئیس امروہوی

والد ــــــ علامہ سید شفیق حسن ایلیا ــــ دوسرا تخلص اختر

والدہ ــــــ نرجس خاتون

بھائی بہن ــــــ سید محمد تقی عرف چھبن ۔ سید محمد عباس عرف بچھن
جون ایلیا (سید حسین اصغر)، نجفیہ خاتون

ابتدائی تعلیم دادا سید نصیر حسن کی نگرانی میں ہوئی ۔ اُس زمانے میں مکتبوں کا رواج تھا ۔ چنانچہ رئیس کے لیے بھی ایک مکتب گھر میں قائم کیا گیا جس میں رئیس اور ان کے چچا زاد بھائی کمال امروہوی شریک ہوتے تھے ۔ بعد میں اسی مکتب میں سید محمد تقی بھی شامل ہو گئے ۔ خلیفہ جعفر حسین ان کو تعلیم دیتے تھے ۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم کے بعد انگریزی پر رئیس نے بطور خود عبور حاصل کیا ۔ تعلیم کا سلسلہ

سنہ ۱۹۳۰ء تک جاری رہا۔

رئیس کے تایا اور خالو ۔۔۔۔۔۔ والد کے بڑے بھائی سید نفیس حسن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اُن کی بیوی رئیس کی والدہ کی بڑی بہن تھیں۔ انھوں نے رئیس کو پالا اور پروان چڑھایا۔ چنانچہ والدین کی محبت اور شفقت کے ساتھ ساتھ تایا، خالو اور خالہ کا پیار بھی رئیس کو نصیب ہوا۔ رئیس کا بیان ہے کہ انھیں اپنی والدہ سے حقیقت پسندی کا اور والد سے رقّتِ قلب، قناعت، ایثار اور راضی بہ رضا رہنے کا تحفہ ملا جس پر وہ آخری سانس تک عمل پیرا رہے۔

پہلا شعر

رئیس کے بقول سنہ ۱۹۲۵ء اور سنہ ۱۹۲۶ء کے دوران انھوں نے پہلا شعر کہا تھا ؂

یا تو کچھ میں ہی غلط سمجھا ہوں
یا حقیقت میں بہار آتی ہے

تین اشعار کی یہ غزل "پسِ غبار" میں شامل ہے۔

ادبی زندگی کا آغاز

دس سال کی عمر تک شعر موزوں کرنے کی مشق کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ سنہ ۱۹۳۱ء سے ان کا ابتدائی کلام روزنامہ اسد، روزنامہ سرفراز، لکھنؤ۔ ہفت روزہ حمایت اسلام، لاہور۔ رسالہ حیات، امروہہ۔ ماہنامہ ادراک، امروہہ۔ ہفت روزہ اتحاد، انصاف، قرطاس اور پبلک گزٹ وغیرہ میں شائع ہونے لگا۔

شادی

جون سنہ ۱۹۳۴ء میں رئیس کی شادی ان کی چچا زاد بہن بنت زینب سے ہوئی۔

اولاد

رئیس کی پانچ صاحبزادیاں ہیں۔ نرینہ کوئی اولاد نہیں۔

پاکستان میں آمد

۱۹؍ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بی او اے سی کے طیارے سے رئیس دہلی سے کراچی آ گئے۔

صحافت و ادارت

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۹ء کے دوران رئیس نے بے شمار مضامین نظم و نثر تحریر کیے جو اس دور کے مقتدر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں امروہہ کے دو اخبارات قرطاس اور مخبرِ عالم کے ادارتی فرائض انجام دیے اور ستمبر ۱۹۳۹ء سے باضابطہ صحافت کو بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ ماہنامہ "مسافر" کو دوبارہ مراد آباد سے جاری کیا۔ پھر یوپی مسلم لیگ کے واحد روزنامہ "جدت" مراد آباد کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ اس کے علاوہ جن دیگر جرائد

پہلا افسانہ

رئیس کا پہلا افسانہ بعنوان "سنگ تراش" ۱۹۳۱ء میں ماہنامہ "حیات" امروہہ میں شائع ہوا۔

کے مدیر رہے ان میں رسالہ "حیات" امروہہ، روزنامہ انصاری، دہلی، ہفت روزہ "کہکشاں۔ دہلی اور رسالہ "مشہور" دہلی شامل ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ـــــ کراچی آنے کے بعد تین سال تک بہ حیثیت مدیر روزنامہ "جنگ" کراچی سے وابستہ رہے۔ لیکن بطور کالم نویس اور قطعہ نگار آخری سانس تک روزنامہ "جنگ" سے منسلک رہے۔ اس کے علاوہ غالب، کراچی اور ہفت روزہ شیراز کراچی بھی آپ کی ادارت میں کچھ عرصے تک شائع ہوئے۔

رئیس کے آباؤ اجداد اور امروہہ

دہلی سے ۸۰ میل مشرق میں اور لکھنؤ سے ڈھائی سو میل مغرب میں ایک بستی ہے امروہہ ـــــ

رئیس کے آباؤ اجداد حجاز، عراق، ایران اور افغانستان کے بیابانوں اور شورہ زاروں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے خاندانِ تغلق کے عہد میں ملتان پہنچے۔ جدِ اعلیٰ کا نام سید حسین شرف الدین تھا جنہیں "شاہ ولایت" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ رئیس

کے بقول ایک خاندانی تذکرے میں لکھا ہے کہ ولایتش از گنگ تا سنگ بود (ان کی ولایت کا دائرہ گنگا سے کوہ ہمالہ تک محیط تھا) حضرت کا مزار مبارک امروہے کے مغرب میں واقع ہے۔ احاطۂ مزار میں بچھو ڈنک نہیں مارتے (حضرت کی یہ کرامت مشہور ہے) درگاہ شریف کی حدود میں بچھو کا ڈنک نہ مارنا گویا اپنی فطرت سے بغاوت ہے سہ

نیش عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

امروہے میں سادات، نقوی، زیدی، رضوی، تقوی وغیرہ اور شرفاء کے متعدد خاندان آباد تھے۔ سادات بارہہ کی طرح سادات امروہہ "بادشاہ گر" کا تو اعزاز نہ پا سکے البتہ منصب داران شاہی کی فہرست میں ان کے نام نمایاں مقام پر درج ہیں۔

امروہے کی چند بلند مرتبت شخصیتوں میں سید محمد میر عدل، شاہ شرف الدین شاہ ولایت، شاہ ابن بدر چشتی کرمانیؒ، شاہ عبدالہادی صدیقیؒ، مولانا احمد حسینؒ، مصحفی، نواب مشتاق حسین وقارالملک، حکیم فرید احمد عباسی، شفاءالملک حکیم رشید احمد خاں، مولانا محمود احمد عباسی، پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر، سید محمد تقی اور خود رئیس امروہوی شامل ہیں۔

سیاسی زندگی

رئیس کا کہنا ہے کہ وہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کانگریس سے وابستہ رہے اور جواہر لال نہرو کے ساتھ بہت کام کیا، لیکن جب انھیں اندازہ ہوا کہ کانگریس مسلمانوں کے ساتھ مخلص نہیں تو وہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ میں بطور رضاکار شامل ہوگئے۔ کانگریس میں شمولیت کے سلسلے میں ان کا بیان ہے کہ قائداعظم، راجہ محمود آباد اور چودھری خلیق الزماں بھی ابتدا کانگریس سے وابستہ تھے۔ مگر بعد میں کنارہ کش ہوگئے۔ انھوں نے قریب و دور سے جن گراں مایہ شخصیات کو دیکھا یا ان کے ساتھ کام کیا یا ملاقات کی ان میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی،

حسرت موہانی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، علامہ مشرقی، قائد اعظم، راجہ محمود آباد، کامریڈ ایم۔ این۔ اے، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو مفتی احمد سعید، خان لیاقت علی خاں، کفایت اللہ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تلمذ اور ادبی ورثہ

رئیس کا کہنا ہے کہ انھیں شعر و ادب میں جو کچھ ملا وہ ان کے والد بزرگوار علامہ سید شفیق ایلیا کا فیضان ہے۔ علامہ مرحوم ایک مستند شاعر تھے (افسوس کہ ان کی بیاض نایاب ہو گئی) لیکن شعر کو "دوں مرتبۂ علم و ادب" قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ادبی ذوق کے ساتھ فلسفیانہ رجحان انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملا۔ انھیں مطالعۂ مذاہب، ہیئت و نجوم اور فلسفہ و الٰہیات سے خصوصی شغف تھا اور ان موضوعات سے ان کے دونوں بھائیوں سید محمد تقی اور جون ایلیا نے بھی اثرات قبول کیے۔

رئیس کا بیان ہے کہ ابتداً وہ اپنے کو فلسفے کے سلسلے میں تہی دامن سمجھتے تھے۔ ناگاہ اور یکایک ان کی روح پر بھی فلسفے کا عکس پڑا اور نفسیات سے (جسے وہ پہلے فلسفے کی ایک شاخ سمجھتے تھے) ایسا ذوق پیدا ہوا کہ روزنامہ جنگ کے لاکھوں قارئین سحر زدہ رہ گئے اور لوگ نفسیات اور مابعد النفسیات (یہ اصطلاح بھی ایجاد بندہ ہے) اور نام نہاد روحانیت کے طلسم میں ایسے گرفتار ہوئے کہ آخر دم تک آزاد نہ ہو سکے۔

رئیس کا سرمایۂ ادب

نثر میں رئیس نے فلمی اور ریڈیائی ڈرامے، تاریخی اور مذہبی مضامین اور سیاسی شذرہ نویسی کے علاوہ نفسیات، مابعد النفسیات، جنسیات، توجہات، مراقبہ، ہپناٹزم، جنات، عالمِ برزخ، حاضراتِ ارواح، عالم ارواح وغیرہ پر مبنی کئی کتابیں تحریر کیں۔

نظم میں ناٹک سے شروع کر کے غزل، قصیدہ، مثنوی، ساقی نامے، مسدس، مخمس، سہرے، سہاگ، قطعات، تاریخ وفات تک ——— سبھی کچھ اتنی بڑی تعداد میں لکھے ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔

بچپن کے دلچسپ شوق

رئیس کو بچپن میں انجن ڈرائیور بننے کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے کان بھی چھدوایا تھا اور کان میں سونے کا بندہ پہنتے تھے۔ بندہ بعد میں اُتر گیا لیکن سوراخ آخر دم تک رہا۔ انھیں درختوں پر چڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ قدرت نے انھیں بڑا تیز ذہن دیا تھا۔ جب ان کی

قطعہ نگاری کا آغاز

رئیس نے ۳۱ جنوری ۱۹۳۰ء سے قطعہ نگاری کا آغاز روزنامہ جنگ۔ کراچی سے کیا جو تادم زیست جاری رہا۔ قطعہ نگاری میں رئیس کا کوئی حریف پیدا نہ ہو سکا —— روزناموں کی روایت میں اوّلین قطعہ نگار کی حیثیت سے ہمیشہ ان کا نام زندہ رہے گا۔

پہلا قطعہ

جس نے امیدِ زیست باندھی تھی
لے اُڑی اس کو موت کی آندھی
گولیاں کھا کے، گالیاں کھا کے
چل بسے آخ مہاتما گاندھی

عمر چودہ برس کی تھی تو انھوں نے طلسم ہوشربا کی طرز میں ایک کہانی شروع کی تھی جسے وہ عرصۂ دراز تک سناتے رہے۔ ہر روز تازہ دم ہو کر بیٹھتے اور وہیں سے سلسلہ شروع کر دیتے جہاں سے چھوڑا تھا۔ اس میں بادشاہوں کی جنگ، عمرو عیار کی جنگ، افراسیاب اور بیسیوں قسم کے ہنگامے شامل تھے۔

امروہے میں ایک ڈرامیٹک سوسائٹی تھی جس کا نام "بزم حق نما" تھا۔ ڈرامے بے انتہا شوق سے دیکھتے تھے۔ اس کی تقلید میں انھوں نے بھی ایک ڈرامہ

"کارنامۂ حق" لکھا تھا۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں شہزادہ ایران کا پارٹ ادا کیا۔ گھر میں ایک مصنوعی تھیٹر ——— بانس کھڑے کر کے اور ان پر رضائیاں ڈال کر بنایا اور ان پر پردے ڈال دیے۔ ایک پیسہ ٹکٹ مقرر کیا۔ سید محمد تقی ٹکٹ چیکر بنائے گئے اور تمام محلّے کے اندر مشہور کر کر یکٹر ایکٹر اچھن (یعنی رئیس) اور مشہور کر یکٹر ایکٹر جدن (یعنی کمال امروہوی) اندر فلاں فلاں ڈرامے میں حصّہ لے رہے ہیں۔ چھبّن (یعنی سید محمد تقی) سے پیسے جمع کرنے میں کیا غلطی ہوئی کہ رئیس نے انھیں پیٹ دیا۔ ڈرامہ بہت کامیاب ہوا۔ پچیس تیس چھوٹے بچے سامعین تھے جنھیں بتایا گیا کہ تالیاں بجا کر داد دیں۔

باضابطہ شعری سفر کی پہلی منزل

سنہ ۱۹۳۱ء میں جس غزل سے رئیس کی باضابطہ غزل گوئی اور مشاعروں میں غزل خوانی کا آغاز ہوا۔ اس کا مطلع ہے:

قصّہ نہ پوچھ مجھ سے شب انتظار کا
ہر اشک آئینہ ہے مرے حالِ زار کا

یہ غزل ان کے شعری مجموعے "پسِ غبار" میں شامل ہے۔

رئیس کے شاگرد اور انجمن آرائیاں ——— رئیس کا بیان ہے کہ ——

"بلاشبہ ہندوستان اور پاکستان میں بہت سے لوگ فنِ شعر میں میرے شاگرد رہ چکے ہیں ——— ان میں متعدد صاحبِ دیوان بھی ہیں، لیکن میں نے نہ تو ان کی کوئی فہرست بنائی نہ کبھی برملا علمِ استادی بلند کیا۔

معاملے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ میں نے اکثر و بیشتر مروّتاً اور بعض حالات میں معاوضتاً کئی شعرا کو مکمل دیوان (جو تمام

اصنافِ سخن پر مشتمل تھے) لکھ کر دیے، لیکن میں اس دریا دلی اور فضول خرچی پر قطعاً شرمندہ نہیں۔

اس وقت بھی چالیس پچاس شاعر اور شاعرات میری تحویل میں ہیں۔ یہی حال انجمنوں کا ہے۔ میں جہاں جہاں رہا کوئی نہ کوئی انجمن میری دم میں بندھی رہی۔ دوستوں کو کیسے بتاؤں کہ انجمن طرازی اور شاگرد سازی سے ذاتی طور پر مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

پہلے مثنوی نگار

رئیس کا بیان ہے کہ شمالی ہند میں اردو کے پہلے مثنوی نگار سید اسمٰعیل تھے جن کا تعلق امروہے سے تھا۔

میر تقی میر اور میر سعادت علی

رئیس کے خاندان کے ایک بزرگ میر سعادت علی کا میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں ذکر کیا ہے جن کے مشورے سے انھوں نے فارسی کے بجائے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔

میر کے شاگرد

رئیس کے دادا کے استاد عبدالرسول نثار کو میر تقی میر کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کراچی کی بے شمار فلاحی، سماجی اور ادبی انجمنوں کے رئیس یا تو سرپرست رہے یا صدر ——!

سیر و سیاحت

بھارت کے متعدد شہروں کے علاوہ رئیس نے دو بار امریکہ اور کینیڈا کے تقریباً تمام بڑے شہروں کا دورہ کیا اور

مشاعرے پڑھے ـــــ لندن بھی وہ گئے اور وہاں بھی مشاعروں میں شرکت کی۔ ابوظبی میں وسیع پیمانے پر "جشن رئیس" کے انتظامات ہورہے تھے کہ انھیں شہید کردیا گیا بشاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔

دولاکھ خطوط

روزنامہ جنگ سے طویل عرصے تک وابستگی کے دوران روزانہ قطعات کے علاوہ وہ ہر ہفتے رئیس کے مختلف موضوعات پر کالم بے حد

رئیس کی یادگاریں

رئیس اپنی زندگی میں ہی شہرت اور نیکنامی حاصل کرچکے تھے۔ ان کی زندگی میں "رئیس اکیڈمی" "رئیس فاؤنڈیشن" (جس کے قیام کا سہرا ان کے دیرینہ رفیق بزم انصاری کے سر ہے)، دو کالونیاں، متعدد تعلیمی ادارے (اسکول، لائبریریاں) رئیس کے نام سے منسوب ہیں۔

ان کی وفات کے بعد "رئیس امروہوی میموریل اکیڈمی" "رئیس ٹرسٹ" کا قیام عمل میں آچکا ہے ـــــ اور ککاخان کوآپریٹو سوسائٹی (جس کے وہ بانی چیرمین تھے) گلزار ہجری میں "رئیس امروہوی میموریل ہال" ان کے نام سے منسوب کردیا ہے۔ بلدیہ کراچی بھی کسی سڑک کو رئیس امروہوی کے نام سے منسوب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

مقبول تھے، اور پڑھنے والے ان سے متعدد مسائل مثلاً سیاسی مسئلوں، سماجی مسئلوں، نفسیاتی الجھنوں، جنسی مسئلوں اور روحانی مرحلوں کے بارے میں استصواب کرتے تھے۔ انھیں روزانہ پچیس تیس خطوط ملتے تھے جن کے وہ پابندی سے جواب دیتے تھے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ خود کو تمام اصناف کا ماہر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک اندازے کے

مطابق رئیس نے دو لاکھ کے لگ بھگ خطوط کے جوابات تحریر کیے۔

ادبی نقطۂ نظر

رئیس کا کہنا ہے کہ کسی منظم مکتب فکر سے غیر متعلق رہنے کے باوصف ان کا ہمیشہ سے ایک ہی تخلیقی نقطۂ نظر رہا ہے اور وہ یہ کہ شعر نہ تو کوئی غیر مادی نتیجۂ فیضان ہے اور نہ محض تقلیدی اسلوب بیان۔ اگر شاعر

چند مقبول و پسندیدہ اشعار

اشعار

- اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

- خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

- مرے رموز کا عرفاں کسے نصیب کریں
سروش روح ازل ہوں سما سے آیا ہوں

- ہر عہد کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ

- اہرمن ہے نہ خدا ہے مرا دل
تجرۂ ہفت بلا ہے مرا دل

- کہاں ہم اختتام نغمہ کے بعد
اگر ہوں گے تو صرف آواز ہوں گے

- لکھ لکھ کے اشک و خوں سے حکایات خونچکاں
آرائش کتاب بشر کر رہے ہیں ہم

یا فن کار محض اپنے "داخل" اور "اندرون" میں گم ہو کر رہ جائے اور سماجی تضادات، معاشی طبقوں کی کشمکش، سیاسی نظریوں کی آویزش اور جدید تاریخی تحریکوں، سائنسی انکشافات اور فلسفیانہ مکاتب فکر کو نظر انداز کر کے حسن اور عشق (اور وہ بھی آسمانی رجا ودانی قسم کا حسن و عشق) اور محض حسن و عشق کو

اپنا نظریۂ فن قرار دے لے تو کم سے کم وہ اسے ہم شاعر یعنی چوتھائی فن کار سے زیادہ ماننے پر تیار نہ ہوں گے۔ ہر تخلیقی فن کار کو تاریخ کا آلۂ کار بلکہ صحیح لفظوں میں موسم پیما ہونا چاہیے۔ اور اپنی شاعری کی بنیاد گرد و پیش کی زندگی کی سطح پر رکھنی چاہیے ورنہ وہ شاعر ہی نہیں، روایتی بھانڈ اور میراثی ہے۔ غزل ان کی محبوب ترین صنفِ سخن ہے نظم کی طرح۔ لیکن گل و بلبل، شمع و پروانہ اور قفس

قومی نغمے اور مخصوص کردار

کردار :۔ اعلیٰ حضرت نواب اچھے مرزا

نغمے :۔

- اللہ کے وعدے پہ مجاہد کو یقیں ہے
  یہ فتحِ مبیں، فتحِ مبیں، فتحِ مبیں ہے
- خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام
  شہریوں کو، غازیوں کو، شہسواروں کو سلام
- اے ارضِ لاہور، اے اہلِ لاہور
  داتا کی نگری، اے شہرِ لاہور
- شاہیں بچوں کا جذبہ پرواز دیکھیے
  اپنے فضائیہ کے یہ انداز دیکھیے

و زنداں کی غزلوں سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ محض فنی روایات کی جگالی، محض اساتذہ کے مضامین کی چوری، لاحول ولا قوۃ۔ یہ کوئی شاعری ہے۔ یہ عہد سخت سماجی کش مکش کا عہد ہے۔ جو شاعر اس سماجی کش مکش کی روح سے واقف نہیں، اسے ہضم نہیں کر سکا، نہ وہ شاعر ہے نہ انسان، جی چاہتا تھا کہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھوں، مگر میرے خیال میں ایک کتاب سے کم پر میرا

ذہن سمجھوتہ نہ کرے گا، لہٰذا اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

تصانیف

شعری مجموعے :۔ • مثنوی لالۂ صحرا (۱۹۵۶ء) • پس غبار (۱۹۶۹ء) • قطعات (جلد اوّل ۱۹۶۹ء) • قطعات (جلد دوم ۱۹۶۹ء) • حکایتِ نے (۱۹۷۵ء) • بحضرت یزداں (۱۹۸۴ء) • انا من الحسین (سن درج نہیں۔ اپنی خود نوشت میں ایک کتاب "حسین اور حسینیت" کا ذکر کیا ہے، لیکن اس نام کی کوئی کتاب دستیاب نہیں اس لیے گمان یہی ہے کہ رئیس نے "حسین اور حسینیت" کا نام تبدیل کر کے "انا من الحسین" رکھا ہو) • ملبوسِ بہار (۱۹۸۳ء) • آثار (۱۹۸۵ء) • نجم السحر (۱۹۸۶ء) • قطعات جلد اوّل۔ دوم۔ سوم۔ چہارم (۱۹۸۶ء) • ضمیرِ خامہ (۱۹۸۶ء)

ترتیب :۔ • معراجِ نفسِ رسولؐ ۔ علامہ سید شفیق حسن ایلیا ۔ ترتیب ۔ رئیس امروہوی

نثری تصنیف :۔ • اچھے مرزا (۱۹۷۵ء) اور • نفسیات و مابعد النفسیات تین جلدیں • عجائبِ نفس ۔ چار جلدیں • لے سانس بھی آہستہ ۔ دو جلدیں • جنسیات دو جلدیں • عالمِ برزخ ۔ دو جلدیں • حاضراتِ ارواح ۔ دو جلدیں • عالمِ ارواح ۔ دو جلدیں (یہ کتابیں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۸۵ء کے دوران رئیس اکیڈمی نے شائع کیں۔)

زیرِ ترتیب :۔ • کلیاتِ رئیس امروہوی تیاری کی منزل میں تھی کہ رئیس کا بلاوا آگیا اور وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے • المیۂ مشرقی پاکستان ۔ دو جلدیں (سن معلوم نہ ہو سکا) • اقبال پر ایک کتاب (جس کا ذکر خود نوشت میں ہے) دستیاب نہ ہو سکی • انقلابِ فرانس پر ایک کتاب مکمل کی تھی (اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ چھپی یا نہیں)، اس کے علاوہ زیرِ ترتیب کتابوں میں ادبی مقالات، فیچر اور طنزیہ مضامین شامل تھے۔

○

● پیغامات، تاثرات

● تذکرے، تبصرے

پیغامات، تأثّرات، تذکرے، تبصرے

جوش ملیح آبادی

میں رئیس کے بارے میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں، بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے، وقت کہاں سے لاؤں بہرحال رئیس کو میں جس قدر سمجھتا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے روایتی اور روندے ہوئے کوچے میں کبھی قدم نہیں رکھا۔ انھوں نے قافیوں کی انگلی پکڑ کر کبھی سفر نہیں کیا، فرضی عشق، فرضی معشوق، فرضی رقیب، فرضی خزاں، فرضی بہار، فرضی وصال و فراق کی فرضی محفلوں میں باقر علی کی مانند داستان گری کا ارتکاب انھوں نے کبھی نہیں کیا ہے۔ انھوں نے حیات، مسائلِ حیات اور اسرارِ کائنات پر براہِ راست غور کر کے جو نتائج اخذ اور جو تاثرات قبول کیے ہیں ان کو نہایت روانی اور گوہر فشانی کے ساتھ ادا کیا ہے اور اسی بنا پر ان کی شاعری شعر و حکمت کا ایک ایسا نقطۂ اتصال بن گئی ہے جس پر ہماری زبان اور ہماری شاعری ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ اس کے دوش بدوش حالاتِ حاضرہ اور مسائلِ سیاسی پر بھی وہ نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کے قطعات ہر روز شائع ہوتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہنگامی خشک اور جھٹروس مسائل میں بھی وہ بسا اوقات ایسی چمک دمک پیدا کر دیتے ہیں کہ آنکھوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر مجھ ناچیز یعنی جوش ملیح آبادی کے شانے پر اس پابندی کا کوہِ گراں رکھ دیا جائے تو اخبار کے واسطے ہر روز بلاناغہ ایک قطعہ نہ سہی چار پانچ نثر کے فقرے

ہی روز لکھ دیا کرے تو مجھ کو یقین ہے کہ یا تو میں العظمۃ للہ کا نعرہ لگا کر کپڑے پھاڑ ڈالوں اور شہر چھوڑ کر جنگلوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوں یا پھر گلیوں گلیوں مخلوقِ خدا کو ڈھیلے مارتا پھرنے لگوں۔ ذرا سوچیے تو سہی روزانہ مسائل پر قطعہ کہنا اور پھر جچتا ہوا قطعہ کہنا آدمی کا نہیں دیو کا کام ہے اور اسی ایک بات پر نگاہ کر کے اس امر کا کان پکڑ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ رئیس کو الفاظ، طرزِ بیان اور خیالات پر اس بلا کی قدرت اور فرمانروایانہ اقتدار حاصل ہے کہ آج کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رئیس ہی وہ تنہا شاعر ہے جس نے ڈنکے کی چوٹ ثابت کر دیا ہے کہ زود گوئی اور معیاری شاعری میں تضاد و عناد نہیں ہے۔ رئیس امروہوی مضامین کے ہر گھوڑے پر خواہ وہ کتنا ہی پشتک مار، خواہ کتنا ہی بدلگام اڑیل اور شریر ہو بڑی چابکدستی کے ساتھ سوار ہو جاتے اور اس کو ایسے کاوے دیتے ہیں کہ وہ پسینے پسینے ہو کر ان کا مطیع ہو جاتا ہے اور ان کی لگام پر دلکی یا پوئی چلنے لگتا ہے۔ رئیس کی یہ چوتھی خصوصیت ایسی ہے کہ جس نے ان کو زبردست شاعر منوا کر دم لیا ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عشق و جنون کی اس پُرشور منڈی میں جہاں قلندرانِ عالم اپنے اپنے کرتب دکھا رہے ہیں، درسِ عقل و تبلیغِ فکر کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اس چار پانچ ہزار سال کی پرانی منڈی میں جہاں عقل کا نام لینے پر سر قلم کر دیے جاتے ہیں، جہاں سقراط کو زہر کا پیالہ پلا دیا گیا اور عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا دیا گیا، عقل و فکر کی تبلیغ کرنا کس قدر خطرناک کام ہے۔ رئیس قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے سر سے کفن باندھ کر اس جان لیوا کوچے میں قدم رکھا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعر کے جوہر کے ساتھ ساتھ قدرت نے اس کے سینے میں شیر کا دل بھی رکھ دیا ہے۔ اب میں آخر میں ان کا ایک انوکھا اور حقائق در آغوش شعر نقل کر کے اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ شعر یہ ہے ؎

شاید اسے عشق بھی نہ سمجھے
جس کرب میں عقل مبتلا ہے

اس شعر کا سمجھنا اور اس کی داد دینا آسان کام نہیں ہے۔ اگر میرا تمام کلام لے کر

رئیس اپنا یہ شعر دے دیں تو میں اپنے کو قارونِ زماں سمجھنے اور

؎ ہمائے اوجِ سعادت بدام ما افتد

کے نعرے لگانے لگوں۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

آپ نے اپنا مجموعۂ کلام جس نام اور جس اہتمام سے شائع کیا ہے اس کی تحسین آسان نہیں اور پھر جو کچھ "الف" کے ورق پلٹنے سے اشعار کی صورت میں دیکھتا ہوں تو ایک ایک شعر میں ہزار ہزار شان نظر آتی ہے۔ آپ کے قدیمانہ فن کے دریا میں "ذہنِ جدید" کی لہروں کا شمار کہاں تک کیا جائے؟ میں نے اس ایک "الف" میں الف الف کی شان پائی ہے۔

فیض احمد فیض

آپ کی تحریریں اب تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ جب بھی فراغت نصیب ہوئی تو آپ کے پُرمعنی اور پُرمغز کلام پر تفصیل سے کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

ذوالفقار علی بھٹو

(چیرمین پاکستان پیپلز پارٹی)

آپ نے جس اچھوتے انداز میں واقعاتِ روزمرّہ، اقتدار پسند، سماج دشمن عناصر اور جدید معاشرے پر پھبتیاں کسی ہیں، وہ آپ ہی کا حصہ ہیں۔ امید واثق ہے کہ دنیائے ادب آپ کی کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گی۔ میری دلی دعا ہے کہ آپ آئندہ بھی ملک اور قوم اور معاشرے کو سنوارنے، جگانے اور سدھارنے میں کوشاں رہیں گے اور ایک قومی شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام

دیتے رہیں گے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

نیاز فتح پوری

متاعِ غم ہے کسی کو بہت عزیز اے دل
بہ احتیاطِ محبت ہیں صرف کر آنسو
تو اپنے جلوۂ آوارہ کو تلاش نہ کر
مری نگاہ کے سانچے میں ڈھل گیا ہو گا

میں نے سب سے پہلے رئیس امروہوی کو ۱۹۵۲ء میں دیکھا تھا اور یہیں کراچی میں خوش رو، گورے چٹے، بے چین قسم کے ذہین اور خوش قیافہ انسان، آنکھوں میں غزالانہ وحشت اور باتوں میں شاعرانہ لطافت، اداؤں میں یکسر دعوتِ خلوص و محبت۔

رئیس کا سن ولادت ۱۹۱۴ء ہے اس لیے وہ ۱۹۵۲ء میں بھی مجھ سے تیس (۳۰) سال چھوٹے تھے اور اب بارہ سال گزر جانے کے بعد بھی اتنے ہی چھوٹے ہیں، لیکن شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ اس وقت بھی مجھ سے بڑے تھے اور اس وقت تو خیر بہت ہی بڑے ہیں۔ میں شعر سمجھنے کی کوشش ہی میں اُلجھا رہا اور وہ شعر کہتے کہتے مشاعرِ حیات تک پہنچ گئے۔ ہر چند کہ وہ اپنی ان شاعرانہ مساعی کو از راہ انکسار "الف" ہی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن عظمت کے لحاظ سے مجھے غالب کا شعر یاد آجاتا ہے ۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یعنی جب ان کے "الف" ہی کا یہ حال ہے تو "ی" تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ غالباً عالمِ بالا اور ملاءِ اعلیٰ سے بھی گزر چکے ہوں گے۔ یہ مجموعہ بلکہ تذکرہ ہے مشاعرِ حیات کا، اور مظاہرہ ہے مدارجِ درک و شعور کا، جو اس نوع کی ظنّی اور فنّی تقسیم سے بے نیاز

ہے۔ یوں تو اصنافِ سخن متعدد ہیں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور خدا جانے کیا کیا، لیکن شعر نام ہے دراصل محض ذہنی احساس و ابداع کا، خواہ وہ کسی صنفِ سخن سے تعلق رکھتا ہو، اور رئیس کی شاعری یہی لغز و ابداع ہے۔ غالب نے تو اپنی شاعری کا آغاز تالیفِ نسخۂ ہائے وفا سے کیا تھا لیکن رئیس کے یہاں اس کی ابتدا آرائشِ کتابِ بشر لیے ہوئے ہے، کہتے ہیں کہ ؎

لکھ لکھ کے اشک و خوں سے حکایاتِ زندگی

آرائشِ کتابِ بشر کر رہے ہیں ہم

رئیس کی شاعری کی بابت صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جانا کہ وہ عمومیت و سطحیت سے بلند ہے، بڑی پست بات ہے۔ ان کے یہاں تو بات چلتی ہے فراز سے، اور ختم ہوتی ہے مدارجِ علو کے تعین پر، جسے تصوف کی زبان میں "اوّل و آخر منتہیٰ" کہتے ہیں۔ رئیس نے جس شان کے ساتھ دنیائے شعر و سخن میں قدم رکھا ہے اس کا ذکر خود انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

عکّر دیارِ شاہدِ بلقیس ادا سے آیا ہوں

اور دیارِ بلقیس سے آنے والا شاعر اگر دعوائے سلیمانی کرے تو اسے یہ کہنا زیب دیتا ہے کہ ؎

تخمینۂ حوادثِ طوفاں کے ساتھ ساتھ

بطنِ صدف میں وزنِ گہر کر رہے ہیں ہم

یوں تو شاعری نام ہے حسنِ خیال، حسنِ فکر و تصور اور حسنِ شعور و ادراک کا، لیکن اگر ذریعۂ ابلاغ و اظہار حسین نہ ہو تو محض فکر و تصور بے کار ہے۔ رئیس کی شاعری میں یہ دونوں باتیں بڑے توازن کے ساتھ پائی جاتی ہیں یعنی وہ جتنا اچھا سوچتے ہیں اتنا ہی اچھا اسے ظاہر بھی کر سکتے ہیں مثلاً بہار کو لیجیے کہ اس کا تصور ہر شاعر نے کیا ہے، لیکن رئیس نے جس زاویے سے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ کس قدر دلچسپ و وسیع ہے، کہتے ہیں کہ ؎

صبا چمن سے نوید شگفت لائی ہے
کسی کلی کا جگر خون ہو گیا ہوگا

اور اس سلسلے میں جب وہ مطالعۂ مظاہر سے ہٹ کر خود اپنی ذات کے مطالعے پر آجاتے ہیں تو ان کی شاعری میں بڑا وسیع مفکرانہ عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ مثلاً سے

خود اپنے ہی قلبِ خوں چکاں میں
خنجر کی طرح اُتر رہا ہوں

رہِ طلب میں مرے پیش رو جو چھوڑ گئے
برہنہ پا انھیں کانٹوں پہ چل رہا ہوں میں
فروغِ صبح سے کہہ دو کہ انتظار کرے
چراغِ شام کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

فکرِ انسانی اکثر و بیشتر "زائیدہ تاثر" ہوتی ہے اور شعر اسی "تاثر" کے اظہار کا نام ہے، لیکن جب یہ تاثر ماورائی حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو شعر بھی ماورار شاعری کچھ اور چیز ہو جاتا ہے۔ غالبا ایام اور الہام ہی کی طرح یکسر لطف و التیام، رئیس کا ایک شعر اسی قبیل کا ملاحظہ ہو سے

گرا ہے شاخِ گل سے ایک پتّہ
کسی نے کیا مجھے آواز دی ہے

رئیس نے اس شعر میں کیا پوری غزل میں احساس کی اس منزل کو پیش کیا ہے جسے انگریزی میں

IN TUNE WITH THE INFINITE

کہتے ہیں رئیس کے اس رنگ کے اشعار اتنی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں کہ پورا دیوان "ملکوتی آپ بیتی" نظر آتا ہے یا خود ان ہی کی زبان میں۔

ع بازگشتِ صدائے گنبدِ راز

اس مجموعے میں ہمیں وہ واردات حُسن و عشق بھی نظر آتے ہیں جو معمولات شاعری میں داخل ہیں، لیکن رئیس نے انھیں بھی بڑے غیر معمولی دلچسپ انداز اور اچھوتے زاویوں سے پیش کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ رئیس کی شاعری نہ محض تغزّل ہے نہ محض تفکّر، بلکہ وہ ایک نیا تجربہ ہے، ادبِ منظوم کی دنیا کا، اور یہ تجربہ اس قدر لطیف و دل کش ہے کہ اگر رئیس ہی پر ختم ہو گیا تو افسوس ہو گا۔

رشید احمد صدّیقی

جن اشعار پر نشان لگائے تھے ان کا حوالہ درج ذیل ہے اور اشعار بھی بہت اچھے ہیں۔ کارڈ میں لتنے ہی کی گنجائش ہے، اس لیے ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ حقۂ منظومات میں چند ایک کو چھوڑ کر بقیہ کے بارے میں چاہتا ہوں کہ کبھی اتفاق ہو تو زبانی گفتگو کروں، تحریر میں بڑی دیر لگتی ہے اور بحث بھی تشنہ رہ جاتی ہے، لیکن زبانی گفتگو کا موقع شاید کبھی نہ آئے، اس لیے مجبوری ہے۔ اشارتاً عرض کر سکتا ہوں کہ منظومات کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن کی خاطر خواہ داد آپ کو چالیس سال سے کم عمر کے ناظرین سے ملے گی، اور یہ بھی کوئی کم امتیاز نہیں۔ ایک شاعری نوجوانوں کے لیے بھی تو ہوتی ہے۔ حسب ذیل شعر بہت پسند آئے ؎

قلزم بے کنار جلوہ و رنگ
دیدۂ ضو فشاں میں ڈوب گیا

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

نوکِ ہر خار و خس ہے خون آلود
رہِ صحرا برہنہ پا تو نہیں

پروفیسر سید احتشام حسین

آپ کے کلام میں کیسی خیال انگیزی اور بلندی ہے ۔ غزل میں تغزّل کی روح اور فکر میں گہرائی! شاعری میں اور کیا چاہیے ۔ میرا ذوق ہمیشہ یہی تقاضا کرتا ہے کہ شعر میں کوئی بات ہونی چاہیے محض لطفِ بیان کافی نہیں، اور آپ کے یہاں اس کی فراوانی ہے یعنی ماورائے سخن بھی ایک بات رہتی ہے ۔ فلسفیانہ مسائل کو پیش کرنے میں جہاں اچھے خاصے شاعروں کو عجزِ بیان کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں آپ کامیاب ہیں۔

ڈاکٹر محمود حسن خاں

رئیس امروہوی بلاشبہ ایک ہمہ گیر ذہن و دماغ کے مالک ہیں ۔ وہ نہ صرف ایک صحافی، شاعر اور صاحب طرز انشا پرداز ہیں، بلکہ مانے ہوئے ماہر نفسیات بھی ہیں۔ اسی لیے زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات پر ان کی نظر بڑی گہری ہے ۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

جناب رئیس کے قطعات میں برجستگی، زبان اور بندش کی خوبیاں تو خیر موجود ہی تھیں، مزاح و طنز بھی ان کا خمیر ہے ۔ لیکن ان کی تاریخی حیثیت بھی مسلّم ہے ۔ قیام پاکستان سے اب تک مختلف مسائل پر ان کے تاثرات کی دستاویز اس اعتبار سے اہم ہے کہ وہ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کے ایک حسّاس نمایندے کے جذبات و احساسات کا آئینہ ہے ۔ ظاہر ہے کہ نظریات و خیالات کے اختلاف کے کے باعث کسی واقعے کے متعلق مختلف افراد کا ردِ عمل یکساں نہیں ہو سکتا اور یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام قارئین شاعر کے جملہ تاثرات سے متفق ہوں ۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ان کے اظہار کے اسالیب سے محظوظ اور کلام کی خوبی سے لطف اندوز نہ ہوں ۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

آپ کی قدرتِ کلام میں کسے کلام ہے ۔ سرِ دست نام کے بارے میں عرض کرنا ہے کہ یہ تصوّف کے غلبے کا نتیجہ ہے ۔ آپ نے تو سارے علوم و فنون کا سرا پکڑ لیا ، بس اس سے پہلے تو ذاتِ احدیت ہی ہے وہ بھی " الف " کی قید سے آزاد نہیں بلکہ آزادی بھی " الف " ہی کی گرفتار ہے ۔ غرض یہ کہ نام " الف " نیا ہے اور سوچنے پر مجبور کرتا اور عاجز کر دیتا ہے اس کی داد دوں یا فریاد کروں ؟

سید آلِ رضا

آپ کا نام نامی اور معقول شہرت ہی اس بات کی ضامن ہے کہ یہ " مطبوعہ " دنیائے ادب میں گرانقدر اضافے کا اہل ہے ۔

ساغر نظامی

کتاب اعلیٰ گیٹ اپ کے ساتھ طبع کی گئی ہے اور اردو کی اعلیٰ معیاری شاعری کی حامل ہے ۔

پنڈت گوپی ناتھ امن

حقیقت یہ ہے کہ " الف " تمام صوری و معنوی خوبیوں سے مزیّن ہے ۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہو جائے تو دوسری زبان والوں کی نظروں میں اردو کی قدر و قیمت بڑھ سکتی ہے ۔ مضامین بھی اچھوتے ہیں اور جدتِ ادا بھی ہے ۔ کہیں استفہام سے اثبات کا کام لیا ہے اور کہیں اثبات سے استفہام کا ، انسانی زندگی کے متعلق حیات و ممات کے مسائل جبر و قدر وغیرہ مضامین پر نہایت غائر نظر ڈالی ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعری کہیں وعظ نہیں ہونے پائی ۔

امیر حمزہ شنواری

رئیس کا شعر اردو شاعری میں فلسفیانہ تفکر اور واردات روحانی کے امتزاج کا نادر ترین تجربہ ہے۔ شاعر کو الفاظ و معانی پر جو بے پناہ قدرت حاصل ہے اس کا اظہار نہایت خوبی کے ساتھ ہوا ہے۔

میرزا ادیب

بڑی پاکیزہ اور حسین غزلیں ہیں۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ آپ کی بلند ذوقی ہے۔ تخیل، رفعت، حقائق کی فنی گرفت اور اسی کے ساتھ دلگدازی۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

پروفیسر خلیق انجم

یہ کہنا تو چھوٹا منہ بڑی بات ہے کہ برسوں سے آپ کے کمالِ فن کا معترف ہوں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ عرصے سے آپ کے معتقدوں اور مداحوں میں ہوں۔ کتابی صورت میں آپ کا مجموعۂ کلام پہلی بار دیکھا ہے۔ یہ حسنِ طباعت واقعی آپ کے کلام کو زیب دیتا ہے۔

مصطفٰے زیدی

گزشتہ دو تین سال اردو شعر پر بہت بھاری گزرے ہیں۔ اب آپ کا مجموعۂ کلام پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مدتوں سے بند مکان کی کھڑکیاں کسی نے کھول دی ہیں۔ میں تو ایسے اشعار پڑھنے کو ترس گیا تھا۔

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

میں "الف" کو ایک کلاسیکی تخلیق کا درجہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ اچھوتا تخیل،

اچھوتا اندازِ بیان، ہر شعر میں بھرپور تغزل، زبان بھی اپنی جگہ مختلف محاسن سے مملو، پھر میں کیوں نہ اسے کامیاب ترین تخلیق کا درجہ دوں۔

نذیر احمد شیخ

جناب کا کلام گرامی واقعی از حد شاعرانہ اور کیف آور ہے۔ اس مجموعے کو کئی بار پڑھ چکا ہوں، مگر ہر بار نیا لطف پاتا ہوں۔

آغا صادق حسین

جب تک "الف" کو الف سے ی تک پڑھ نہیں لیا چین نہیں آیا۔ آپ کا "الف" یہ ہے تو حیران ہوں کہ "ی" کیا ہوگی۔ رومان، فلسفہ، طبعیات، مابعد الطبعیات کس کس کی تعریف کروں۔ فکر عمیق کی یا اظہار بلیغ کی۔

ظہیر کاشمیری

"الف" مضبوط مجموعہ ہے۔ مجرد فلسفے سے تعلق رکھنے والی نظمیں، قداً ور اور بلند و بالا ہیں، زبان پر دسترس کے مظاہرے جا بجا ملتے ہیں۔

آغا افتخار حسین

روایتی شاعری میں رئیس صاحب نے کہیں نئی باتیں کہی ہیں کہیں پرانی باتیں نئے انداز سے کہی ہیں۔ نئی باتیں کہنا مشکل ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات پرانی باتیں نئے انداز میں کہنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت زیادہ نئی نئی باتیں سننے کے بعد پرانی باتیں سننے کو جی چاہتا ہے۔ نئے رنگ میں رئیس صاحب کا کلام اس خواہش کو تسکین بخشتا ہے۔ رئیس صاحب نے روایت سے بغاوت بھی کی ہے۔ ایک جگہ انھوں نے ہماری شاعری میں جنون پسندی کے خلاف آواز اٹھائی ہے

فرماتے ہیں ؎

شعورِ عشق کو بازیچۂ جنوں نہ بنا
جنوں ملے تو ملے آگہی نہیں ملتی

میں سمجھتا ہوں کہ اس تنبیہہ کی شدید ضرورت تھی۔

جناب سیّد ہاشم رضا

اگر حضرت حالی، جناب رئیس امروہوی کے قطعات ملاحظہ فرماتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ خوش ہوتے اور جناب رئیس امروہوی کی نجات کے لیے دعا کرتے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ ان کے تمام قطعات اس دعوے کی دلیل ہیں کہ ؎

آئینۂ امروز ہیں میرے قطعات
اس عہد کی تاریخ لکھی ہے میں نے

میری طرح ہزاروں لوگوں نے ان قطعات کو پڑھ کر غالب کا یہ مصرع دہرایا ہوگا۔

؎ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شان الحق حقّی

کلام میں جوشِ اظہار، قدرتِ اظہار اور خلوصِ اظہار تینوں چیزوں کا پتہ چلتا ہے جن سے عمدہ شاعری تشکیل پاتی ہے۔ ابتدا میں غزلیں ہیں جن میں ایک نئے انداز کو پانے اور نبھانے کی کوشش اوّل اوّل خاصا چونکاتی ہے ؎

گرد میں اٹ رہے ہیں احساسات   دھیمے دھیمے برس رہی ہے رات
جل اٹھا اک چراغِ شام تو کیا   بجھ گئے بے شمار امکانات

ڈھل گئی ہستیٔ دل یوں تری رعنائی میں
مادّہ جیسے نکھر جائے توانائی میں

نئی غزل کے ان تجربات سے بعض دلچسپ باتیں ظاہر ہوتی ہیں یعنی ایک طرف اظہار کے لیے ایک منجھا ہوا اور روایت میں رچا ہوا ذریعۂ اظہار ضروری ہے، جو بڑی مدت میں بنتا اور معنی کی سمائی پیدا کرتا ہے۔ یہ بھی تاثیر کے لیے کسی حد تک ضروری ہے کہ آدمی زیادہ چونکنے نہ پائے اور شعر کا جادو ٹوٹ کر نہ رہ جائے۔ ان کا ذوق متفکرانہ ہے ؎

جان لیوا سہی جراحتِ عشق
عقل کا زخم ہے بہت کاری

حقۂ نظم میں قصیدے کا سا شکوہ ہے اور کہیں غزل کی سی نزاکت بھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مجموعہ عموماً بڑی پُر کیف اور باوقعت شاعری کا حامل ہے۔

سیّد ضمیر جعفری

آپ کے شعرِ شیریں کا یہ مجموعہ جس وقت میرے ہاتھ میں آیا میں نے اسی لمحے دوسرے تمام کام بند کر کے اس کو کھولا اور اوّل سے آخر تک ختم کر کے دم لیا، بلکہ جب سرور اور بے خودی کے آبشار میں بہتا ہوا اس آخری شعر پر پہنچا کہ ؎

پھر وہ پہلو سے نکل جانا کسی کا اے رئیس
سرگزشتِ خواب کو اک خواب بتلاتے ہوئے

تو ذہن و خیال کی وسعتوں میں جیسے ایک خواب تما معنی و جمال کے نہ جانے کتنے موتی، پھول اور ستارے افق در افق جگمگا رہے تھے اور اگر کوئی احساس تھا تو یہی کہ اے کاش ان "انوکھی ناشگفتہ شاموں، اور نرالی نادیدہ صبحوں" کی جا لامکھی میں کہ جس سے آپ کی شاعری کی روح گرم اور پیشانی روشن ہے، حواس و شعور کی رنگ اندوزی اور بصیرت آموزی کا یہ سفر کچھ اور دیر تک، کچھ اور دور تک جاری رہتا۔ اس کتاب

میں آپ کی خوب صورت شاعرانہ عظمت اور دور بین و دلکش ذہانت ـــــ کے تابدار نقوش جا بجا درخشاں نظر آتے ہیں اور اسلوبِ فن اور اندازِ فکر کی اس تازگی اور توانائی کے ساتھ جو عصری ادب میں شیوۂ خاص ہے "الف" دل آویز شاعری کی ایک عہد آفریں تخلیق ہے۔

رضا ہمدانی

رئیس امروہوی کی غزل نئے تقاضوں سے بھرپور ہے۔ رئیس کی غزل بیمار نہیں بلکہ تنومند، صحت مند، قدآور اور پائیدار ہے۔ اس میں ایک جذبہ ہے آگے بڑھنے کا اور ایک آہنگ ہے حیاتِ نو سے بغل گیر ہونے کا۔ رئیس کی غزل کا محل انھیں بنیادوں پر استوار ہے اور یہ بنیادیں ظاہر ہے سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے کسی طرح کم نہیں۔ عزم اور ارادے کی پختگی رئیس کو غزل ایسے نازک قالب میں بھی نچلا بیٹھنے نہیں دیتی۔ رئیس کی غزل میں رکاکت اور سُبکی کا وجود نہیں، اور غزل کا حُسن و جمال اور رکھ رکھاؤ قدم قدم پر جلوہ گری کر رہے ہیں۔ رئیس نے غزل کو معیاری بنا دیا ہے اب یہ غمِ جاناں غمِ دوراں دونوں کو آنکھیں دکھا سکتی ہے، مداوا بھی کر سکتی ہے۔ اس میں ایک دراک ذہن اور دماغ اور ایک دردمند حساس دل بھی ہے۔ دل و دماغ دونوں یک جان ہو کر ایک معتدل نظامِ زندگی ترتیب دے رہے ہیں اور یہ جذبہ اور ارادہ منظومات کے حصے کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ غزل میں دل کی باتیں زیادہ ہیں جب کہ نظم میں ذہن کا تعاون بھی شامل ہے۔ رئیس کے منظومات میں روایتی انداز نہیں، بلکہ اس میں عصرِ حاضر کے مسائل کی آنچ ہے اور شاہدِ عصر کو رومانی موہافت سے سنوارا گیا ہے۔ حقیقت پسندی کے پیمانے سے مزاجِ دہر کا اندازہ لگا کر نظم کو محض خیالی بھول بھلیوں میں نہیں الجھایا گیا۔ رئیس کی نظم حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں پر ایک بے لاگ تنقید ہے۔

ضیاء الدین احمد برنی

رئیس امروہوی نہ صرف شاعر ہیں بلکہ شاعر گر بھی ہیں اور اس قدر پُرگو ہیں کہ اس

زمانے میں مشکل ہی سے کسی اور کو ان کا حریف گردانا جا سکتا ہے۔ اردو نثر پر بھی انھیں زبردست قدرت حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں جو گھن گرج ہے اس میں ان کے مدِمقابل صرف جوش نظر آتے ہیں۔ الفاظ کا ایسا اہتمام شاید ہی کہیں اور ملے۔ بائیس سال سے مسلسل چھپنے والے قطعات میں انھوں نے کہیں کہیں سماج پر بھرپور حملے کیے ہیں۔ خیالات کے اظہار میں انھوں نے جس بیباکی اور صاف گوئی کے مظاہرے کیے ہیں وہ قابلِ داد ہیں۔

مرزا محمود سرحدی

"الف" پاکستان کے ایک عظیم اور منفرد فن کار کا شاہکار ہے۔

نصیر الدین ہومنزائی

یہ شاعری نہیں ہے ماورائے شاعری کوئی بات ہے

ورائے شاعری چیزے دگر ہست

شمس کنول

رئیس صاحب کی اپنی ایک مخصوص طبیعت ہے اور ان کی سوچ اور فکر انفرادیت کی حامل ہے، چنانچہ انھوں نے اپنی فکر کو اپنے فن میں اجاگر کر اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے۔ تصوّر، تخیّل، فلسفہ، نفسیات اور تحقیقِ کائنات ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان کی اکثر غزلوں اور نظموں میں سائنٹفک تجزیے بھی ملتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ رئیس صاحب غزل اچھی کہتے ہیں یا نظم، دراصل ان کی غزلوں میں گہرائی اور گیرائی زیادہ ہے اور نظموں میں شگفتگی، دلکشی اور حقیقت پسندی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

ماہر القادری

جناب رئیس امروہوی اردو کے مشہور ادیب و شاعر ہیں۔ قدرتِ کلام اور بدیہہ گوئی

میں وہ آپ اپنا جواب ہیں۔ وہ متغزل بھی ہیں اور طنز نگار بھی۔ صاحبِ موصوف کی خود اعتمادی کا یہ رنگ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام پر کسی ادیب و شاعر یا تنقید نگار سے تعارف یا پیش لفظ نہیں لکھوایا۔ جناب رئیس امروہوی کی غزلوں میں ان کا اپنا رنگ و آہنگ ملتا ہے۔ تغزل میں فلسفے کا امتزاج ان کا خاص رنگ ہے۔ غزلوں کے بعد نظموں کا دور شروع ہوتا ہے۔ پہلی نظم "عفریت اور دیوتا" ہے جو خاصی جاندار نظم ہے۔ "خواب پریشاں" بڑی کیف انگیز نظم ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں تو رہ رہ کر
دوپٹے کے ستاروں کا چراغاں یاد آتا ہے

"ارض افسون و افسانہ" کا پہلا شعر ہے ؎

چل اے دل سوئے شہر جانانہ چل
بصد شب روی ہائے مستانہ چل

یہ نظم بہت ولولہ انگیز ہے اور پرجوش بھی۔ اس نظم میں عرب کے ایام جاہلیت کی شاعری کا انداز جھلک رہا ہے۔ "خلوت نامہ" کے یہ شعر کتنے لطف انگیز ہیں؟ ؎

نہ کوئی قاعدۂ شرم نہ آئین حیا
نہ کسی فاصلۂ ناز کو حائل پایا
جس پہ تہمت تھی ہمیشہ سے دل آزاری کی
اس کو سینے سے لگایا تو ہمہ دل پایا

"تضاد بشر" بڑے معرکے کی نظم ہے۔ فلسفیانہ افکار کو کس خوبی کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے ؎

یہ کیا کہ پردہ در غنب جس کا ذوقِ شہود
پہنچ سکے پس دیوار بھی نہ اس کی نظر

یہ کیا کہ منزلِ الہام جس کی جولاں گاہ
وہ اپنے نقشِ کفِ پا کی پاسکے نہ خبر
یہ کیا تضادِ بشر ہے، یہ کیا تضادِ بشر؟

"عالمِ ناآفریدہ" اردو شاعری میں ممتاز مقام پانے کی مستحق ہے۔ نظم کا آغاز، درمیان اور اختتام مربوط، حسین اور فکر انگیز ہے ؎

میری ہستی بساطِ زندگی پر
فقط اک قطرۂ اشک چکیدہ
جہاں کتنے مسافر کھو گئے ہیں
چلا ہوں اُن منازل میں جریدہ

"بہ حضرتِ یزداں" بھی عالمِ ناآفریدہ کی طرح بلند پایہ نظم ہے۔ "عدم" جس نظم کا عنوان ہے وہ جناب رئیس امروہوی کے فلسفیانہ افکار کی ترجمان اور ان کی دانشورانہ بصیرت کا شاہکار ہے۔ "آفرینش نامہ" میں بھی شاعر کی فلسفیانہ فکر موجِ طوفاں کی طرح کروٹیں لے رہی ہے۔ رئیس امروہوی جب فلسفیانہ افکار کو شعر کا قالب عطا کرتے ہیں تو انتہائی سنجیدہ مفکر، ارسطو مزاج اور سقراط طبع نظر آتے ہیں، مگر حُسن و محبت کی وادیوں میں ان کی اٹکھیلیاں رنگ و نکہت کی سفیر اور حسن وعشق اور شباب و رنگینی کی نقیب بن جاتی ہیں۔ یہ خیال کی رعنائی اور الفاظ کی جادوگری ہی تو ہے کہ ان کا فن بعض مقامات پر بڑا حسین اور پاکیزہ نظر آتا ہے۔ ان کی رومانی نظمیں شدتِ جذبات کی طوفانی موجیں ہیں جو اپنے پڑھنے والے کو ڈبوئیں گی نہیں تو "تردامن" ضرور کردیں گی۔ رئیس امروہوی کے فلسفیانہ افکار میں اشراقیت، سوفسطائیت اور یقین و بےیقینی کی ملی جلی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ازل و ابد، عدم و وجود، کون و فساد، خیر و شر، اس قسم کے پیچیدہ گوناگوں مسائل اور مظاہر نے انھیں سراپا حیرت و اضطراب بنا دیا ہے۔ رئیس امروہوی کا مجموعۂ کلام شعر و ادب کا گلدستۂ صد رنگ ہے۔

اعجاز صدیقی

رئیس امروہوی اردو کے نہایت کہنہ مشق اور مقبول شاعر ہیں جنھیں زبان و بیان اور اسالیب پر پوری پوری قدرت حاصل ہے ۔ ان کی غزلیں قدیم غزل کی داخلیت اور جدید غزل کی خارجیت سے ہٹ کر ایک ہلکا ہلکا سا فلسفیانہ انداز رکھتی ہیں ۔ پر شکوہ الفاظ و تراکیب کے ساتھ یہ بہترین قدرتِ کلام کی مظہر ہیں ۔ انھیں پڑھ کر جہاں قاری کو بلاغت و روانی کا احساس ہوتا ہے وہیں ذہنی کاوش کا بھی، شاعر یا تو دل سے بات کرتا ہے یا ذہن سے ! رئیس کی شاعری میں ان کے دماغ کو زیادہ دخل ہے، لیکن ہر جگہ نہیں جہاں انھوں نے دل کو بھی شریک کر لیا ہے وہاں معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ حلاوت اور سلاست بھی پیدا ہو گئی ہے ۔ جو سنجیدہ فکر ان کے کلام میں ہے وہ قابلِ قدر ہے ۔ آخری حصے میں جو نظمیں ہیں وہ بھی ان کے اپنے رنگ و آہنگ اور اسلوب کی آئینہ دار ہیں اور قاری کو متاثر کرتی ہیں ۔ ان میں بھی ویسا ہی زورِ بیان اور شکوہ ہے جیسا غزلوں میں ہے ۔

شبنم رومانی

رئیس امروہوی دورِ حاضر کے نظریاتی ریلے میں پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہے ہیں ۔ انھوں نے حیات و کائنات کو اپنا موضوع بنا لیا ہے ۔ انھیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ کون سی سیاسی جماعت یا سیاسی تصورات مفید ہیں ۔ انھوں نے خود کو کسی تنگ خول میں قید نہیں کیا ہے ۔ وہ انسانی مسائل کا خالص انسانی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے اور حیات و کائنات کے مابین رشتے تلاش کرتے نظر آتے ہیں ۔ یہ مشکل ترین موضوع ہے ۔ وہ مفکرانہ اور فلسفیانہ ذہن لے کر گئے ہیں اور اپنا کام بطریقِ احسن انجام دے رہے ہیں ۔

جمیل الدّین عالی

رئیس امروہوی اپنے روزانہ قطعات کی وجہ سے اردو دنیا کے مشہور ترین شعرا میں شامل ہیں، لیکن یہ ان کی شاعری کا صرف ایک رُخ ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ رُخ کمزور ہے یا اپنے طور پر ادب میں علٰحدہ کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس وقت موقع نہیں ورنہ میں پوری ذمّے داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلسل سالہاسال تک روزانہ ایسے بانکے، مضبوط اور وسیع المعنی قطعات کسی اور صنفِ شعر میں تحریر کی ایسی مثال پورے ادبِ اردو میں نہیں ملتی۔ "الف" میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء تک کی غزلیں شامل ہیں۔ جدید نقّاد کے لیے رئیس امروہوی کی غزل جدید نہیں روایتی ہے، مگر ہمیں یہاں دو باتیں دیکھنی ہیں۔ ان کے روایتی محدودات، بحر، قوافی اور ردیف تک محدود ہیں یعنی دوسرے الفاظ میں ان کی فارم یا ہیئتِ اظہارِ غزل کے ڈھانچے میں مقید ہے جس کا پابند ہر غزل گو کو ہونا پڑتا ہے، لیکن دوسری بات آتے ہی گفتگو کے سیکڑوں دریچے کھل جاتے ہیں اور ان کی انفرادیت پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ رئیس ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ قادر الکلامی اپنی جگہ کوئی تنہا یا اتفاقی خصوصیت نہیں، بلکہ قدیم ادب کے گہرے مطالعے، تجزیے اور انتخابی تاثرات قبول کرنے کے ساتھ انفرادی زورِ طبع کا مرکب ہے۔ رئیس کی یہی اکیلی خصوصیت انھیں بہت سے قدما، متوسطین، متاخّرین اور معاصرین میں قابلِ امتیاز بنا چکی ہے۔ ان کی شاعری میں کسی مخصوص فلسفۂ حیات کی کھلی یا درپردہ پبلسٹی نہیں ملتی۔ اس کا انھیں دعویٰ بھی نہیں۔ جہانِ نو کی طلب رئیس کو بھی اسی طرح ہے جیسے سب بے چین سوچنے والوں اور بقول کسے، آدرشیوں کو ہوتی ہے۔ ایک مسلسل تشنگی، بے اطمینانی اور اس خرابے کو بہتر سے بہتر بنانے کی خواہش۔ وہی حالی والی بات

؎ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؟

مگر اس کے اظہار کا انداز رئیس کے یہاں خالص جمالیاتی ہے۔ ان کی ناآسودگی

جذبات کی تہوں میں چھپی ہوئی ہے اور ان کے عزائم بلند آہنگ الفاظ کے پردے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ خالص غزل کے ذیل میں ان کی غزلیں انفرادیت کا درجۂ کمال رکھتی ہیں۔

رفیق خاور

"الف" کے دامن یعنی انجمنِ گل میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی، غزلیں بھی ہیں نظمیں بھی، اور ان کو بڑی خوش تزئینی سے پیش کیا گیا ہے۔ اگر کڑی تنقید سے کام لیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ شاعر پرانے دبستان کا نیا شاعر۔ پرانا رنگ گہرا، گُھبتا، بنیادی اور اس پر نئے کا ملمع، اس لیے اس میں روایت کے بھرپور رچاؤ کے ساتھ انداز کی بھی نمایاں جھلکیاں ہیں جن سے کلام میں ذہنِ جدید کی وضع پیدا ہو گئی ہے۔ اس پر غالب کی جلا سونے پر سہاگہ۔ شاعر اچھے بے نوا، اور ازل نا فنا پذیر سے آگے ابد جاوداں کی طرف زیادہ نہیں گیا، پھر بھی اس "الف" کے دامن میں کتنی ہی جاذب نظر پنہائیاں بھی ہیں اور رسائیاں بھی۔ گہرائیاں بھی ہیں اور گیرائیاں بھی۔

مشفق خواجہ

رئیس امروہوی کی ذہنی سطح ہمارے غزل گو شعرا سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ ان کا فلسفیانہ اور مفکرانہ انداز کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ وہ زندگی اور کائنات پر ایک فلسفی کی طرح نظر ڈالتے ہیں۔ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں سوچتے ہیں اس کا اظہار فلسفی کی طرح نہیں ایک شاعر کی طرح کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفے نے ان کے کلام کی فضا کو متاثر نہیں کیا۔ غزلوں کی طرح نظموں میں بھی یہ رنگ موجود ہے۔ "تضادِ بشر" "عالم ناآفریدہ" "جوہری عہد" اور "آفرینش نامہ" ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے انسان اور اس کے تعلقات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کا یہ انداز فکر اور ایسا لب و لہجہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔

حسن ظہیر

رئیس صاحب کے یہاں جو الفاظ کی فراوانی، زورِ بیان اور سلاست و روانی پائی جاتی ہے، وہ بہت کم شعراء کو نصیب ہوئی ہے اور جب اس زورِ بیان اور سلاست و روانی میں فکر شامل ہو جاتی ہے تو وہ اپنے سارے ہم عصر شعراء کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ غزل میں فکر کی گہرائی کے ساتھ مضمون طرازی اور معنی آفرینی کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کم سے کم ردیف کی پابندی سے آزاد ہو۔ اقبال کی طرح رئیس کی بھی بیشتر غزلیں غیر مردّف ہیں جس میں انھوں نے اپنی فکر اور شعریت کا بہترین امتزاج پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں مردّف اور مرصّع غزلیں بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔ منظومات میں "دور آیا"، "عہدِ نو کے سوال"، "آج کی رات"، "مرزا غالب"، "انکشافاتِ خاک"، "وقت اور عدم"، وغیرہ قاری کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ یہ مجموعہ ادب میں مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

بیگم آثم ملک

رئیس امروہوی نے اپنی نظموں میں شاعری کی پوری پوری روایات قائم کر رکھی ہیں۔ رئیس کے یہاں شاعری کی قدیم روایات کے ساتھ موجودہ شاعری کی تمام تر خوبیاں اور رعنائیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ذرا شعر سنیے ؎

ڈھل گئی ہستیٔ دل یوں تری رعنائی میں

مادّہ جیسے نکھر جائے توانائی میں

یہ شعر ایسا ہی شاعر کہہ سکتا ہے جو موجودہ دور کے ادب اور سائنس سے کما حقہ واقف ہو۔ ہستیٔ دل کے محبوب کی رعنائی میں ڈھل جانے کو کس قدر نازک اور خوب صورت مثال سے ثابت کیا ہے جس طرح جوہری توانائی مادّے کا تجزیہ کر کے اس کو نکھار دیتی ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ؎

یوں لگا جیسے کہ بل کھا کے دھنک ٹوٹ گئی
اس نے دفعۃً جو لیا ناز سے انگڑائی میں

عزیز لکھنوی کے مشہور شعر کے بعد اتنا خوب صورت شعر کس نے کہا ہے؟

ثاقب زیروی

یوں تو صرف تخیلات کی شاعری بھی ایک گونہ حُسن کی مالک ہوتی ہے ۔ صرف جذبات و محسوسات کی شاعری بھی ایک انوکھی رعنائی کی، لیکن رئیس اس سے بھی ایک قدم آگے محسوس ہوتے ہیں ۔ ان کے اس مجموعے میں ایسے فکر سا ترا شعار ملتے ہیں جو انھیں احساس و شعور کا شاعر تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں، ایک ایسا احساس جس کی گہرائی اور گیرائی ان کے مطالعے کی وسعتوں کی ہمنوا اور جس کے شعور د ادراک کی حدیں اس کے احساس کی گداز و دل کش رعنائیوں سے ملتی ہیں ۔ یوں تو ان نظموں میں معاشرے پر بالواسطہ طنز بھی ہے اور انسان کے شر و رنفس اور گمراہی کا فاضلانہ تجزیہ بھی، لیکن جب معاملات محبّت کی بات شروع ہوتی ہے تو وہ ایسی دل گدازی اور بے ساختگی کے ساتھ رموزِ حریم حُسن و عشق بیان کرتے ہیں کہ ہر مصرع روح میں اترتا بلکہ گھاؤ چلا جاتا ہے ۔ ان کی غزل پڑھتے وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خرد اور جنوں اپنی اپنی جگہ جن الجھنوں اور کرب سے دوچار ہیں ان کے نقوش شکنوں کی صورت میں ان کے احساس کے ماتھے پر مرتسم ہو گئے ہیں اور ان کے دماغ اور جسم کا ذرّہ ذرّہ سرتاپا سماعت اور لمس و گداز بن گیا ہے ، جسے وہ آلام روزگار اور علائق جنون و خرد کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی انسانیت کے نالہ د شیون کی زبان سمجھنے لگے ہیں ۔

اقبال اختر

رئیس امروہوی کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک بات جو آپ فوراً محسوس کریں گے یہ ہے کہ ان کا کلام تجسّس، تحقیق اور تکنیک سے مرکب ہے، کیونکہ

ازل و ابد، نیکی و بدی، خدا اور عفریت اور دنیا کے تضادات نے ان کے ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان گمبھیر موضوعات پر کھلنڈرے پن کے ساتھ اظہار خیال ممکن نہیں۔ رئیس امروہوی کے لہجے میں اسی مناسبت سے سنجیدگی اور گمبھیرتا موجود ہے جسے یاسیت بھی کہا جا سکتا ہے، مگر اسی کے ساتھ ان کے کلام میں جاندار رجائیت بھی ہے۔ عام طور پر ان کی غزل میں وہ صفات نظر آتی ہیں جنھیں شاعری کی جان کہا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل پر فکر کا گہرا رنگ چھایا ہوا ہے کیونکہ بنیادی طور پر رئیس امروہوی کا ذہن ایک مفکر کا ذہن ہے، لیکن فکر نے ان کی غزل میں بوجھل پن پیدا نہیں کیا۔ اقبال کے یہاں جو قطعیت تھی وہ رئیس کے یہاں نہیں ہے۔ رئیس پر اقبال کی تقلید کا الزام مشکل لگ سکتا ہے کیونکہ اقبال خود نطشے سے متاثر تھے۔ ظاہر ہے کہ جب رئیس غزل کو چھوڑ کر نظم کی طرف آتے ہیں تو ان کا رنگ کچھ اور نکھر جاتا ہے اور وہ ان موضوعات پر جو زیادہ سے زیادہ وسعتِ بیان چاہتے ہیں کھل کر اظہار خیال کرتے ہیں۔ "تضادِ بشر" "بہ حضرت یزداں" اور "عہدِ نو کے سوال" ان کے شکوک و شبہات کے ترجمان ہیں، لیکن اپنی نظم "قصد مریخ و ماہ" میں وہ اس تشکیک کو بھول جاتے ہیں اور چاند ستاروں پر کمند ڈالنے کا عزم ظاہر کرتے ہیں۔ دراصل رئیس کی شاعری تشکیک و تجسس سے ہی عبارت ہے۔ جب دنیا کے تضادات کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور تشکیک کی وجہ سے ان کے ذہن میں جو جگہ خالی ہوتی ہے اس کو وہ عہدِ نو کے انسان کے کارناموں سے پر کر لیتے ہیں، لیکن ان کارناموں پر بھی ان کو کلی یقین نہیں ہے۔ "وقت" "عدم اور آفرینش نامہ" میں بھی ایک مفکر کے فلسفیانہ ذہن کی جھلک نظر آتی ہے۔

سیف زلفی

رئیس کی آواز الگ ہے۔ ان کی بڑی خصوصیت فلسفیانہ سوچ اور نفسیاتی طرزِ احساس ہے۔ رئیس کے کلام میں جو سب سے زیادہ منفرد چیز مجھے نظر آتی ہے وہ

خوف کا عنصر ہے، یہی خوف جو کالرج کی شاعری میں نمایاں ہوا تو اسے ماورائیت کا نام دیا گیا اور انگریزی ادب میں کالرج کی حیات کا باعث ہے۔ اردو ادب میں خوف کا یہ عنصر شاعروں کے یہاں خال خال نظر آتا ہے۔ خدا جانے رئیس کے یہاں یہ جذبہ شعوری ہے یا لاشعوری، مگر اتنا نمایاں ہے کہ اردو ادب میں ایک مستقل قدر بنتا معلوم ہوتا ہے۔ اگر کالرج اور رئیس کی ماورائیت کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو گی کہ کالرج نے جو خوف کی فضا بنائی ہے وہ تصوراتی اور بیان کی حد تک محدود ہے، مگر رئیس نے خوف کی نفسیات کی مدد سے کچھ ایسے دائرے بُنے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو ان دائروں میں محبوس پاتا ہے۔ اردو غزل یا نظم میں اگر ماورائیت کی کوئی قدر متعین ہو گی تو رئیس پہلا اور منفرد شاعر ہے جسے اس قدر کی علم برداری کا اعزاز حاصل ہو گا۔ چند شعر لکھتا ہوں ؎

یہ فقط شورش ہوا تو نہیں　　کوئی مجھ کو پکارتا تو نہیں
بھوت بن کر مجھے ڈراتی ہیں　　میری نا آفریدہ تخلیقات
پیڑوں کے گھنے مہیب سائے　　یہ کون ہے مجھ پر حملہ آور

عزیز عجمی

رئیس امروہوی ایک سیاسی طنز نگار اور قطعہ گو کی حیثیت سے اپنی شہرت اور مقبولیت پر اپنی غزل و نظم کو ترجیح دیتے ہیں، مگر کون نہیں جانتا کہ عمر خیام بنیادی طور پر ایک مہندس اور ماہر نجوم تھا لیکن بحیثیت ایک شاعر کے زندہ رہا۔ غالب اپنے فارسی کلام پر نازاں تھے، مگر یہ ان کا اردو کلام ہے جو انھیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ رئیس امروہوی کے قطعے کی مقبولیت کا راز ان کی عظیم تخلیقی ذہانت میں مضمر ہے۔

حسین نظامی

غالب، داغ اور پھر اقبال و حسرت کے رنگ بڑے نمایاں نظر آتے ہیں اور سب

کا ہلکا ہلکا عکس رئیس صاحب کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ کہنے میں تو مبالغہ ہوگا کہ رئیس، غالب کے مرتبے کے شاعر ہیں یا ان کے ہاں داغ جیسا شوخ تغزل پایا جاتا ہے یا ان میں شعریت، مقصدیت اور خلوص کا اقبال جیسا رچاؤ ہے یا حسرت کی سی صالح معاملہ بندی ان کے یہاں ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رئیس صاحب کی زبان رئیس صاحب کے بیان اور رئیس صاحب کی شعریت میں ان سب بزرگانِ اردو کا فیض نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بقول ان کے پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے اثرات اور نئے انقلابی دور کی پوری چھاپ بھی ان کی شاعری پر ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی شاعری سے "رنگین" اور "میراجی" بھی یاد آجاتے ہیں جن کے کلام کی عریانی اور جنسیت اردو کے فرائڈ زدگان کے لیے ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان سب چیزوں کے پیشِ نظر رئیس صاحب جیسا جامع صفات شاعر اردو میں آج کل نظر نہیں آتا۔

روزنامہ ڈان (کراچی)

وہ اس مجموعے کی غزل اور نظم کے سبب ایک عظیم، خیال آفریں اور متفکر شاعر کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ اپنے تفکر اور خیال کے لحاظ سے بلاشبہ وہ غالب اور اقبال کی ہم نشینی کے مستحق ہیں۔ یہ ایک فالِ نیک ہے ہمارے ادب کے لیے کہ رئیس کی طرح ایسے شعرا ہم میں موجود ہیں جو اب تک انسانیت مطلق کے نام پر لکھ رہے ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کا تعلق انسان اور کائنات، انسان اور معاشرہ، انسان اور خالق انسان اور ذات اور سب سے بڑھ کر خود اس کے علم و ادراک کی نوعیت سے ہے۔ گہرے اور دوررس مسائل جن کی طرف غالب اور اقبال نے اشارے کیے ہیں، رئیس نے انھیں نمایاں شکل میں پیش کیا ہے۔ بطورِ مثال اپنی طویل نظم "تضاد بشر" میں وہ انسانی عظمت و قدرت کو بیان کرنے کے ساتھ اس انسانی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہوا کا ذرا سا جھونکا اسے مضطرب و مضطر کر دیتا ہے۔ شاعر اسرارِ حیات کی تہہ تک پہنچنا

چاہتا ہے اور اس تلاش میں فکر کی بلند ترین منزل تک پہنچ جاتا ہے، لیکن اس کی مجبوریاں اسے روک لیتی ہیں۔ اس طرح حیات کی نسبت اس کا نقطۂ نظر فلسفیانہ یاس پسندی کا ہے۔ رئیس امروہوی ایک ایسا شاعر ہے جس سے مزید بلندیوں اور بلند پروازیوں کی توقع کی جاتی ہے۔

امروز (لاہور)

رئیس امروہوی نے اپنے گرد و پیش کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ دورِ جدید کے تقاضوں کو بھی سمجھتے ہیں اور اس دور کے رہنے والوں کی تمناؤں، خواہشوں اور کاہشوں اور پھر کامرانیوں اور محرومیوں سے بھی آگاہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ غزل اور نظم دونوں میں ان کا معاشرتی وقوف اور عمرانی شعور نمایاں نظر آتا ہے۔

ہمدردِ صحت (کراچی)

رئیس صاحب نے غزل کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کی غزل بیسویں صدی کی نمائندہ ہے۔ یہاں آپ کو جذبات، سماج، سیاست، نفسیات، ایجادات اور خلائی دور کے اثرات ہم رشتہ و ہم آواز ملیں گے۔ ان کی غزل کے آہنگ میں آپ کو ایٹمی دور کا جلال و جمال بھی ملے گا۔

شانِ ہند (دہلی)

رئیس امروہوی کی غزلیات اور منظومات کا یہ مجموعہ جہاں نام کے اعتبار سے انفرادیت رکھتا ہے وہاں کلام کی حیثیت و نوعیت سے بھی جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔

صبحِ اُمید (بمبئی)

مشہور شاعر رئیس امروہوی کا مجموعۂ کلام پیشِ نظر ہے۔ نگاہِ حیرت سے

رئیس فن و شخصیت

رئیس امروہوی کے کلام کا مطالعہ شروع کیا، جب ہم پڑھتے پڑھتے اس مطلع پر پہنچے ؎

ادھر غرور ادھر ناز خاکساری ہے
یہ کھیل کتنے تکلف کے ساتھ جاری ہے

تو ہمیں وجد آ گیا۔ تغزل کی چاشنی کیا خوب ہے۔ رئیس کا اندازِ فکر بھی نہایت اچھوتا اور دل نشیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اردو ادب میں نئی راہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

پاسبان (چنڈی گڑھ)

آپ کم و بیش ایک چوتھائی صدی سے اقلیمِ سخن کی "رئیسی" فرما رہے ہیں۔ جناب رئیس کا فلسفۂ حیات اور ان کا علم و عرفان اشعار میں جگہ جگہ اپنا رنگ دکھاتا ہے ؎

میں زماں تھا زماں میں غرق ہوا
میں مکاں تھا مکاں میں ڈوب گیا

ہر شے اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز رہتی ہے۔ اس شعر میں روح اور مادے کا انجام کار اپنے اپنے مراکز تک پہنچنا ایک ایسا تخیل ہے جس کی داد اہلِ دل ہی دے سکتے ہیں۔

پگڈنڈی (امرتسر)

رئیس نظم اور غزل دونوں پر قدرت رکھتا ہے۔ نفسِ مضمون، زبان اور اندازِ بیان کے اعتبار سے رئیس نے ایک دردمند دل پایا ہے۔ اس کے یہاں غمِ جاناں، غمِ دوراں کے رنگ میں ملتا ہے۔ وہ بہتر زندگی کی جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ ہے اور اس کا کلام رجائیت کا مظہر ہے۔

خاتون دکن (حیدرآباد دکن)

رئیس امروہوی اپنا ایک اسلوب رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں انوکھی تشبیہات اور استعارات کے ساتھ ساتھ پرشکوہ الفاظ و تراکیب بھی نظر آتی ہیں۔ ان کا انداز بیان اور اسلوب ان کے فکری رجحانات کا غماز ہے اور ان کے نکھرے ستھرے طرزِ بیان سے ان کے گہرے احساس اور فنی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے کلام میں حیات کی تازگی جا بجا موجود ہے اور درد و کرب و تشنگی کے ساتھ ساتھ نظام نو کے بگڑے ہوئے ڈھانچوں کو بہتر بنانے کا رجحان بھی۔

محور (کراچی)

وہ اپنی نسل میں کلاسیکیت کے ساتھ زبان اور فن کے لوازم کو خصوصیت کے ساتھ نظر میں رکھتے ہیں۔ رئیس نے اردو شاعری کے پرانے فرض کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے جس سے فارسی کا مطالعہ، علامتوں اور صنائع بدائع کا شعور، محاکات و تلمیحات، سامی اور آریائی رشتہ عروض اور مصرعوں کی تراش خراش یا کرافٹنگ پر توجہ کے لیے محنت اور تیاری کی جاتی ہے، لیکن ان کے کلام میں یہ احساس موجود ہے کہ وہ محض فن برائے فن کی دلدل میں نہیں پھنسے۔ انھوں نے نئی قدروں اور نئے افکار کو اپنا موضوع بنایا اور ان کے لیے فن اور آدابِ فن اپنی روایت سے لیے ہیں۔ نظموں کا حصّہ بھی انفرادی ہے۔ وہ چھوٹی بحروں میں رواں اور چست الفاظ میں موضوع کو پیش کرتے ہیں تو ان کی شاعری فکر و احساس کا حسین امتزاج بن جاتی ہے "عفریت و دیوتا" (نظم) اس کی خوب صورت مثال ہے ؂

جی میں آتا ہے شہر میں گھوموں
اور کوئی مجھے نہ پہچانے

فکر و خیال (کراچی)

سب سے پہلی بات جو رئیس صاحب کے کلام میں منفرد ہے وہ ان کا فلسفیانہ انداز بیان ہے اور ان کا یہ فلسفیانہ انداز ان کی فطرت ہی کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے۔ فلسفیانہ مسائل ذرا ادق ہوتے ہیں اور عام ذہن ان کی اصطلاحوں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، پھر ان میں جو باتیں شاعر محض اشاروں اور استعاروں میں رمزیاتی انداز (SYMBOLIC) سے بیان کرتا ہے وہ ہر کسی کی سمجھ کی بات نہیں، چنانچہ ان کے اشعار میں زمان و مکان، تخلیقِ کائنات دگر اختتام نغمہ کے بعد صرف آغاز ہو۔ گل و غنچہ کی جبینوں پر کیوں اور کیا کی علامت، زمانے کی توجیہہ، اپنی تلاش اور طلب، بہشتِ بے خبری اور خود آگہی کا جہنم، کرب ناصبوری، نشاطِ وصل، وقت کا تعاقب کرنا اور وقت کا عقب میں نمودار ہونا اور پھر آخری شعر عقل کا کرب جسے سمجھنا عشق کے لیے بھی ممکن نہیں وغیرہ وغیرہ وہ اسرار و رموز ہیں جنھیں بڑے بڑے دانشور ہی سمجھ سکتے ہیں۔ رئیس صاحب نے جہاں نفسیاتی قدرت بینی سے کام لیا ہے وہاں ان کے اشعار ان کی نفسیات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔

جامِ نو (کراچی)

رئیس امروہوی ان شعرا میں سے ہیں جن کو فن اور شعر نے شہرتِ عام اور بقائے دوام سے سرفراز فرمایا۔ وہ مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان کا کلام ہمارے ذہنوں کو جو روشنی بخشتا ہے اس میں ہم نہ صرف ماضی و حال کو دیکھ رہے ہیں بلکہ فرد کا مستقبل بھی پیشِ نظر ہے۔ انھوں نے ہمیں حسن و جمال کی رنگینیوں کے شعور ہی سے آگاہ نہیں کیا، بلکہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور غور و فکر کے ساتھ ساتھ عمل کی دعوت بھی دی ہے۔ ان کے یہاں داغ کی شوخی، میر کا درد، غالب کا شعور اور میر درد کا سوز موجود ہے، لیکن کسی جگہ بھی ان شخصیتوں کے کلام کا پرتو یا عکس نظر نہیں آتا ان کی انفرادیت ہر جگہ

موجود ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ وہ ہر انداز میں اپنی جگہ رئیس ہیں۔

سیارہ ڈائجسٹ (لاہور)

رئیس صاحب کی ادبی تربیت بہت حد تک اقبال و جوش کی شعری فضا میں ہوئی ہے اور ان کا ذوق و مزاج ان دو بڑے شاعروں سے زیادہ متاثر ہے۔ شدتِ جذبات، جوش و خروش، ولولہ انگیزی، شکوہ الفاظ، اور شعلہ نوائی کی حد تک وہ جوش اور یگانہ کی روایت سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں اور کلاسیکی طرزِ بیان اور غزل کی تکنیک کو نظم میں برتنے کے فن میں انھوں نے اقبال کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے۔ ان کے شاعری کی اولین خصوصیت اس کی قادر الکلامی ہے۔ ان کی غزلوں میں بالعموم اور نظموں میں بالخصوص ایک طوفانی زور آور سیلابی بہاؤ پایا جاتا ہے، قدیم کلاسیکی طرزِ بیان کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی "جدیدیت" کی خواہش، مجبوری اور بے بسی کے احساس کے ساتھ ہی انسان کی عظمت و قوت پر بھروسہ اور ذات و کائنات کے بارے میں تشکیکی رویّہ۔

یہ جشن

گزشتہ سال "بزم تزئین ادب" کے ایک اجلاس میں جس اہم کام یعنی "جشن رئیس امروہوی" کے انعقاد کی داغ بیل میرے محترم دوست جناب ساحر عباسی نے ڈالی تھی اور موصوف کی تحریک پر میرے احباب نے جس خدمت کی ذمّے داری میرے ناتواں کاندھوں پر رکھی تھی الحمدللہ کہ اس فرض سے سبکدوشی نصیب ہوئی اور آج میں یہ سطور لکھتے ہوئے بے حد مسرّت محسوس کر رہا ہوں اس فرض سے عہدہ برآ ہونا ایک ادبی ذمّے داری کو پورا کرنا تھا جو "بزم تزئین ادب" کے مؤسس شعراء و ادبا، کا خوشہ چیں ہونے کی وجہ سے میرے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔

میرے محترم بزرگ جناب سید محمد مہدی رئیس امروہوی جنھیں ۱۹۵۶ء سے میں نے

"رئیس القلم" لکھنا شروع کیا تھا اور اب بہت سے حضرات انھیں "رئیس القلم" کہتے ہیں، بجا طور پر اس قدردانی کے مستحق ہیں کہ ان کے اعزاز میں ادبی تقاریب منعقد کی جائیں۔ ان کے روزانہ شائع ہونے والے چار مصرعے (قطعہ) ملک کی تازہ ترین صورتِ حال پر تبصرے، ایک بھرپور طنز، ایک دعوتِ عمل، ملّت کے خیالات کی ترجمانی اور حقائق کی پیش کش کے علاوہ حق گوئی و حق شناسی، نیز حکومت وارباب حل وعقد کے لیے مفید مشوروں ہی کے علمبردار نہیں ہوتے بلکہ ایسی بے شمار ادبی و تاریخی خوبیوں کا مرقع ہوتے ہیں جن کی مدد سے مستقبل کے مورخ کو تاریخ کی تدوین میں مدد ملے گی۔

کئی سال تک مسلسل ہفتے وار چھپنے والا ان کا مخصوص کردار "نواب اچھے مرزا" ایک مثالی کردار رہا ہے۔ اردو ادب میں ہمیں چند ہی ایسے کردار نظر آتے ہیں جو لافانی ہیں۔ مثلاً طلسم ہوشربا کا "عمروعیار" الف لیلہ کا "ابوالحسن" شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کا "مرزا ظاہر دار بیگ" پنڈت رتن ناتھ سرشار کا "خوجی" ڈاکٹر مرزا ہادی رسوا کا "امراؤ جان ادا" سید امتیاز علی تاج کا "چچا چھکن" یا پھر اختر شیرانی کی نظموں کا کردار "سلمیٰ" وغیرہ۔ یہ تمام کردار لافانی ہیں اور جب کردار لافانی ہوں تو ظاہر ہے کہ ان کے تخلیق کرنے والے بھی زندۂ جاوید رہیں گے۔ اس لیے رئیس امروہوی بھی زندگی سے بھرپور تخلیقات کی بنا پر فراموش نہیں کیے جا سکتے اور دنیا انھیں اردو زبان وادب کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھے گی۔

رئیس صاحب کی نظر نفسیات پر بھی بہت گہری ہے۔ ان کے معتقدین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ نفسیات کے مسائل پر کچھ اس انداز سے قلم اٹھاتے ہیں کہ ہر ہفتے روزنامہ جنگ کے لاکھوں پڑھنے والے متاثر و فیض یاب ہوتے ہیں۔

رئیس صاحب کا ایک اچھوتا اور مخصوص اندازِ بیان ہے جس کی بنا پر انھیں صاحب طرز اہل قلم کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس دور کے سب سے زیادہ زود گو اور بسیار گو شاعر و ادیب ہیں اور ان خصوصیات کی وجہ سے وہ خود ایک دور ہیں جو مختلف النوع خوبیوں کا حامل ہے اور جس سے پھوٹنے والے آبشار سے علم و ادب کے

تشنہ کاموں کی تشنگی بجھا رہے ہیں۔

رئیس صاحب نے علم و ادب کے گہوارے امروہہ میں ۱۹۱۲ء میں آنکھ کھولی جس کی بابت میں ببانگ دہل کہتا ہوں کہ ؎

مجھے اپنے مولد پہ ہے فخر خاور
جہاں طفلِ مکتب بھی اہل زباں تھا

اور جہاں سید محمد میر عدل جیسا عادل وقت، شاہ شرف الدین شاہ ولایت، شاہ ابن بدر چشتی کرمانی اور شاہ عبد الہادی صدیقی جیسے ولی کامل، حضرت مولانا احمد حسین جیسے بلند پایہ محدث، مصحفی جیسا مایۂ ناز شاعر، نواب مشتاق حسین خان وقار الملک جیسی قابل فخر ہستی، باباۓ طب حکیم فرید احمد عباسی اور شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں جیسے حاذق اطبا، مولانا محمود احمد عباسی جیسا محقق، پروفیسر غضنفر جیسا ماہر تعلیم، سید محمد تقی جیسے فلسفی اور عظیم فن کار صادقین کے علاوہ بے شمار قابل قدر ہستیاں پیدا ہوئیں۔

رئیس صاحب نے علوم متداولہ میں کامل دستگاہ بہم پہنچانے اور اپنے والدِ ماجد علامہ سید شفیق حسن ایلیا سے کسبِ فیوض کرنے کے بعد صحافت کے قابلِ قدر پیشے کو اپنایا اور مختلف و متعدد رسائل و اخبارات کی ادارت کرتے رہے انھوں نے صحافت کے ساتھ ساتھ زمینِ علم و ادب کی خون جگر سے آبیاری اور اشعار کی تخم ریزی کر کے غزلوں اور نظموں کے معطر و دیدہ زیب پھول کھلائے جو یقیناً سدا بہار ثابت ہوں گے کیوں کہ خود ان کے بقول ؎

کانٹوں سے فگار انگلیاں ہیں
ملبوس بہار سی رہا ہوں

دنیا کی مطلب پرستی، احباب کی قدر ناشناسی اور ارباب حل و عقد کی چشم پوشی، کے کانٹوں سے ان کے احساس کی انگلیاں زخمی ہو چکی ہیں، مگر وہ اپنا کام پھر بھی جاری رکھے ہوئے ہیں اور ایسا لباس تیار کر رہے ہیں جو نہ صرف چمن کی جملہ رعنائیوں اور نکہتوں

کا حامل اور جملہ نزاکتوں اور دلفریب رنگوں کا آئینہ دار ہو گا بلکہ اپنے دامن میں بہاروں کو سمیٹے ہوئے ہو گا۔

انھوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور نہایت کامیابی سے زندگی کے خاکوں میں رنگ بھرتے چلے گئے ہیں۔ وہ ایک کامیاب صحافی، بے مثال شاعر، ناقابلِ فراموش و صاحبِ طرز ادیب، ماہرِ نفسیات اور ایک مخلص صداقت پیشہ انسان ہیں۔ انھیں جس زاویے سے دیکھا جائے وہ قابلِ قدر نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام پر کچھ لکھنے کے لیے وقت اور ایک دفتر درکار ہے جس کا سرِ دست موقع نہیں ۔ میں ایک بے بضاعت طالب علم ہوں اور حصولِ علم میں منہمک، نیز اس مجلّے میں اتنی گنجائش کہاں کہ میں اپنے خیالات کی ترجمانی کر سکوں۔ بقول محترم پروفیسر سید عابد علی عابد۔

"رئیس اس پلّے کا شاعر اور اس مرتبے کا ادیب ہے کہ
اس کے لیے اس قسم کی تقاریب بے معنیٰ! اور یہ مجذبے
حقیقت ہے۔ اس کے لیے تو ارمغان نکالا جانا چاہیے"۔

میں اس عذر کے ساتھ اپنی تحریر کو مختصر کرتا ہوں اور اختتامِ تحریر سے قبل اپنے بعض ساتھیوں اور کرم فرما حضرات کے خلوص و تعاون کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں "بزمِ تزئینِ ادب" کے سرپرستِ اعلیٰ جناب خواجہ عبدالمجید صاحب انکم ٹیکس کمشنر کا بھی بطورِ خاص ممنون ہوں کہ موصوف نے اس تقریب کے تمام مراحل پر ہماری رہنمائی کی۔ ناسپاسی ہو گی اگر اس موقع پر اپنے کرم فرما اور محترم دوست جناب سید امیر احمد صاحب کا ذکر نہ کروں کیوں کہ اس تقریب کے سلسلے میں سب سے زیادہ تعاون انہی کی طرف سے حاصل ہوا ہے۔

مختصراً اس موقع پر "بزمِ تزئینِ ادب" کی کارکردگی کی بابت بھی کچھ عرض کرنا تھا کہ کس طرح اور کن مقاصد کے پیشِ نظر اس بزم کا قیام عمل میں لایا گیا اور کون کون حضرات اس کے بنیادی اراکین ہیں، لیکن چونکہ اس تقریب کے سلسلے میں صرف جناب وفا وارثی، جناب ظفر ہاشمی اور جناب اقبال نشتر نے ہی میرا کچھ ہاتھ بٹایا ہے،

اس لیے ان حضرات کے اس مختصر تعاون کا بھی مجھے اعتراف کرنا اور اظہارِ تشکر کرنا ہے۔ البتہ جناب ساحر عباسی جو اس تقریب کے داعی بھی ہیں اور محرک بھی، میرے شانے سے شانہ ملا کر چلتے رہے اور ہر گرم و سرد کے لیے سینہ سپر رہے۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ وہ خود اس تقریب کے روحِ رواں ہیں۔ مجھے جناب حارث سنبھلی کا منفی انداز میں شکریہ ادا کرنا ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں بالکل ہاتھ نہیں بٹایا۔

بزم کی ادبی سرگرمیوں کی روئیداد آئندہ کسی مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ اتنا ضرور عرض کرتا چلوں کہ اس تقریب کے سلسلے میں رئیس صاحب کا مجموعۂ کلام "پسِ غبار" (مرتبہ نیاز مند) چھپا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

—————— خورشید خاور امروہوی

مکرمی، السلام علیکم

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ اور دیگر اراکین "تزئینِ ادب" جناب رئیس امروہوی کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے جشنِ رئیس امروہوی منا رہے ہیں اور یادگاری مجلہ شائع کر رہے ہیں۔

رئیس امروہوی کی خدمات کا مجھے بھی اعتراف ہے، لہٰذا میری خوشی بے وجہ نہیں ہے۔ ان کی خدمات کا کسے اعتراف نہ ہوگا۔ میں جشن میں شرکت کرتا، اگر مفلوج نہ ہوتا۔

آپ سب قابلِ مبارکباد ہیں کہ آپ نے بہت صحیح اور بروقت احساس کیا۔

دعا گو

—————— ملاّ واحدی۔ کراچی

خط ملا۔ یاد فرمانے کا شکریہ!

مجھے خوشی تو ہوئی کہ آپ جناب رئیس امروہوی کے ساتھ ایک جشن کا ہنگامہ برپا کرنے والے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ رئیس صاحب اس سے زیادہ مستحق ہیں،

اور اس تقریب کی تیاری ایک سال سے کم میں نہیں ہو سکتی۔ ان کی تخلیقات پر ایک ضخیم مقالوں کی کتاب کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ رئیس تو ان ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں میں ہیں کہ ان کی ذات پر تو سارے ملک کو ناز ہونا چاہیے، لیکن خیر اگر اس قبرستان میں ایک قبر بھی زندہ ہو تو یہ بھی کم نہیں۔ ممکن ہے یہاں کے مُردوں میں آپ ہی سے یہ سراج جل نکلے۔ میں ادب کے اس موڑ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور آپ لوگوں کی تندرستی اور صحت دماغ کی دعا کرتا ہوں۔

والسّلام

———— احسان دانش۔ لاہور

میں "تزئینِ ادب" کے کارکنوں کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے جناب رئیس امروہوی کے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا ہے اور وہ اس یادگار تقریب کے موقع پر ایک مجلّہ بھی شائع کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ جناب رئیس امروہوی اردو کے مشہور، مقبول، خوش فکر اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ وہ گزشتہ بیس برس سے روزانہ ایک قطعہ لکھ رہے ہیں، یہ اردو شاعری کی تاریخ کا بالکل منفرد واقعہ ہے۔ جناب رئیس کے قطعات موجودہ عہد کی مختلف سیاسی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کی تاریخ ہیں۔ قطعات کے علاوہ جناب رئیس نے اردو زبان کو نظم اور نثر کی صورت میں اس قدر سرمایہ عطا کیا ہے کہ ان کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔

اختر حسین

———— (صدر انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی)

رئیس امروہوی ایک شگفتہ مزاج، صاحب احساس، صاحب طرز اور صاحب ایجاد شاعر ہیں اگرچہ وہ اپنے طنز و مزاح کی وجہ سے مشہور ہیں، اور ان کی رباعیاں زبان زدِ خلائق ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ طنز سے زیادہ غزل کے شاعر

ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری اتنی مشہور نہیں ہوئی۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ جو کچھ عرصہ ہوا "الف" کے نام سے شائع ہوا تھا میری نظر سے گزرا ہے۔ ندرتِ خیال، گرمیٔ احساس اور اخلاص جذبات کے اعتبار سے یہ مجموعہ نہایت بلند پایہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ رئیس کے غزلیہ کلام کے اور مجموعے بھی منظرِ عام پر آئیں گے۔

رئیس طنز میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ چست ترکیبوں اور انوکھے قافیوں کے پردے میں ہمیشہ کوئی بڑی پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ معاشرے کی دکھتی رگوں کو چھیڑتے رہتے ہیں، مگر ان کا کہا ہوا گراں نہیں گزرتا کیوں کہ ان کا مقصد کسی پر چوٹ کرنا نہیں ہوتا، معاشرے کی اصلاح کرنا ہوتا ہے۔

مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی ہے کہ "بزمِ تزئینِ ادب" جناب رئیس امروہوی کے ساتھ ایک جشن منا رہی ہے۔ ایک مردہ پرست قوم کے لیے زندوں کی قدر دانی ایک نیا اور صحت مند رجحان ہے۔ میں بزم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خداوند بزرگ و برتر رئیس امروہوی اور ان کے بے باک اور حق نویس قلم کو زندہ سلامت اور تازہ و توانا رکھے۔

———— ممتاز حسن۔ کراچی

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ اراکین تزئینِ ادب کراچی نے ہمارے ملک کے ایک ممتاز ادیب و شاعر حضرت رئیس امروہوی کے ساتھ ایک شام منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جناب رئیس امروہوی نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے، اسے نکھارتے، سنوارنے اور رنگ و روپ عطا کرنے میں صرف کیا ہے اور تقریباً ہر صنفِ سخن میں اپنی تخلیقات کی شمع روشن کی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ قطعات کے میدان میں تو ان کو منفرد حیثیت حاصل ہے اور اس میں دور دور تک کوئی ان کا حریف نظر نہیں آتا۔

اپنی ان خوبیوں کی بنا پر وہ یقیناً اس کے بجا طور پر مستحق تھے کہ علمی اور ادبی

ادارے اس قسم کی تقریبات میں ان کی خدمات کا اعتراف کریں اور انھیں خراجِ عقیدت و محبت پیش کریں۔ "تزئینِ ادب" کراچی کے اراکین اس سلسلے میں ملک کی تمام علمی، ادبی اور صحافتی برادری کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

میری طرف سے بھی دلی مبارکباد کا پیغام قبول کیجیے۔

——— حکیم محمد سعید دہلوی۔ کراچی

مجھے اس بات سے خوشی ہوئی ہے کہ "تزئینِ ادب" کراچی نے جناب رئیس امروہوی کے ساتھ ایک جشن منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ رئیس صاحب کو کون نہیں جانتا۔ ان کے قطعات سے جو ہمارے معاشرے کی چھوٹی بڑی برائیوں پر خوش گوار تنقید کے حامل ہوتے ہیں، ہر اخبار بین محظوظ ہوتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران انھوں نے جو ملی ترانے لکھے وہ ہمارے قومی ادب کا سرمایہ ہیں۔

مجھے ان کے مضامین سے بھی دلچسپی ہے، لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اگر مابعد الطبیعاتی قصے کہانیوں کی بجائے رئیس صاحب ہماری اس دنیاوی زندگی کے مسائل پر قلم اٹھائیں تو پڑھنے والوں کے لیے ان میں اور زیادہ دلچسپی پیدا ہوگی۔

——— خواجہ شہاب الدین۔ راولپنڈی

یوں تو شاعری کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی بات سے ہو جاتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے کلام پاک کے انیسویں پارے میں ایک پوری سورۃ الشعراء کے عنوان سے نازل فرمائی۔ دنیوی اعتبار سے ایسے متعدد ثبوت ملتے ہیں جن سے شعراء کی عظمت پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ارسطو جس نے جمہوری مملکت کا ڈھانچہ تیار کرتے وقت ہر پیشہ اور ہر اہلیت کے لوگوں کو پیش نظر رکھا اور ہر ایک کو ان کے پیشے اور اہلیت کے مطابق مقامات دیے، لیکن وہ شاعر کو اس کے شایانِ شان منصب دینے اور اس کا صحیح مقام متعین کرنے سے قاصر رہا۔

ایک واقعہ امیر نصر بن احمد کا بہت مشہور ہے کہ اس کو ہرات کی آب و ہوا

ایسی پسند آئی کہ اپنے وطن بخارا جانے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوتا تھا۔ جب اس کے ساتھیوں اور فوجیوں کو اہل و عیال یاد آئے اور وطن کی یاد نے زیادہ ستایا تو انھوں نے مجبور ہو کر استاد رودکی کو جو ان کے ساتھ آیا تھا اس کام کے لیے تیار کیا کہ وہ جس طرح ممکن ہو امیر کو وطن واپس چلنے پر آمادہ کرے۔ رودکی نے ایک قصیدہ لکھا جس میں اپنے وطن کا نقشہ اس انداز سے کھینچا کہ امیر نصر اس کو سُن کر اس قدر بے تاب ہوئے کہ فوراً کوچ کا حکم دیا۔ ہمارے صدرِ مملکت نے بھی شعراء کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

جناب رئیس امروہوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اس دور کے عظیم شاعر ہیں۔ جب پاکستان اور بھارت کی نہ بھولنے والی جنگ شروع ہوئی تو سب سے پہلے رئیس صاحب کا رزمیہ ترانہ ریڈیو سے نشر ہوا جس نے سننے والوں کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کیا اور لوگوں کے دلوں میں جذبۂ حب الوطنی موجزن ہو گیا۔ موصوف نہ صرف پُرگو شاعر ہیں بلکہ ماہر نفسیات بھی ہیں جو شاعر کے لیے بہت ضروری علم ہے تاکہ وہ قوم کی نفسیات کو پہچان سکے۔

میں چونکہ شاعر یا ادیب نہیں ہوں اس لیے موصوف کے کلام کو اس انداز سے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ میں تو ان کے بارے میں صرف اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ وہ اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں اور انھیں زبان پر کماحقہ قدرت حاصل ہے اور ان کی خدمات بہرحال قابلِ قدر ہیں۔ اراکین "بزم تزئینِ ادب" قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنی بزم کی سرگرمیاں ایک عظیم المرتبت شاعر کے ساتھ جشن منانے سے شروع کیں۔ میری دعا ہے کہ یہ ادارہ ترقی کرے اور اپنے اغراض و مقاصد میں کامیابی حاصل کرے۔

خواجہ عبدالمجید

(کمشنر آف انکم ٹیکس (مشرق)، کراچی)

مکرمی خواجہ عبدالمجید صاحب

آپ کا مکتوب جشن "رئیس امروہوی" کے سلسلے میں ملا۔ اس سے قبل ساحر عباسی صاحب سے بھی اس تقریب کی تفصیلات کا علم ہوا تھا۔ میں آپ کو، آپ کے رفقا کار نیز ادارۂ جنگ کو اس مستحسن اقدام پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

شاعر، ادیب اور صحافی قوم کا بیش قیمت سرمایہ ہیں اور قومی و ملی امور میں ان کی رہنمائی بڑی اہمیت و افادیت کی حامل ہوتی ہے۔ ہماری سوسائٹی کا یہی وہ قابلِ قدر طبقہ ہے جو عوام و خواص کو سوچنے سمجھنے کی نئی راہیں عطا کرتا ہے۔

دوسرے پاکستانیوں کی طرح میں بھی حضرت رئیس امروہوی کی نگارشات کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم شاعر، منفرد ادیب اور مایۂ ناز صحافی ہیں۔ قدرت اتنی خصوصیات کم لوگوں کو عطا کرتی ہے جو بیک وقت رئیس صاحب میں موجود ہیں۔ ان کو نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ غزلوں، نظموں، مثنویوں اور قصیدوں کے علاوہ وہ بائیس سال سے روزنامہ "جنگ" کے لیے ایک قطعہ لکھ رہے ہیں اور ان کے چار مصرعوں سے ایک تاریخ مرتب ہو رہی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی ناقابلِ فراموش جنگ کے دوران رئیس صاحب کے نغموں نے پاکستانی قوم کے ناقابلِ شکست حوصلوں اور امنگوں کو جس انداز میں مزید تقویت دی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں شعر و ادب اور ملک و قوم کی خدمت کے لیے صحت و سلامتی عطا فرمائے۔ آمین

"جشن رئیس امروہوی" کی تقریب میں شرکت میرے لیے انتہائی مسرت کا باعث ہوگی۔

والسلام

محمود عبداللہ ہارون ـــــ کراچی

شاعر ملت کو ایک تصور عطا کرتا ہے اور فلسفی جمہور کے لیے سرچشمۂ دانش۔ رئیس امروہوی شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ پچھلے بائیس برس سے نثر و نظم کا جو سرچشمہ

ان سے قلم سے بے دریغ اور مسلسل اُبلتا رہا ہے۔ وہ تمام لوگوں کے لیے وجدان، فیضان اور عرفان کا منبع ثابت ہوا ہے۔

کچھ عرصے سے وہ ہنگامہ خیز زندگی کے گرداب سے زیادہ سے زیادہ کنارہ کش ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس رجحان نے ان کو بیش از بیش مطالعۂ باطن اور مشاہدۂ نفس کی طرف متوجہ کر دیا ہے اور ان کی شاعری اور تخلیقات کو زیادہ سے زیادہ گہرائی بخش دی ہے۔

میری تمنا ہے کہ وہ شعر و ادب کی مفید خدمات کے لیے تا دیر زندہ و سلامت رہیں۔

—————— جی۔ اے۔ الانہ

مجھے یہ معلوم کر کے دلی مسرت ہوئی کہ کراچی کی چند ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام "جشن رئیس امروہوی" منایا جا رہا ہے۔

رئیس امروہوی صاحب ہمارے دور کے نامور شاعر، ممتاز ادیب اور مشہور صحافی ہیں۔ ادب اور صحافت میں رئیس صاحب نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ اس تقریب کے ذریعے ان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے۔

"جشن رئیس امروہوی" کے منتظمین قابل مبارکباد ہیں اور میری دعا ہے کہ یہ تقریب کامیاب ہو۔

—————— میر خلیل الرحمٰن

(ایڈیٹر روزنامہ جنگ۔ کراچی)

میرے لیے یہ بات باعث مسرت ہے کہ "بزم تزئینِ ادب" اردو کے ممتاز و منفرد شاعر اور صحافی جناب رئیس امروہوی کے ساتھ ایک جشن منا رہی ہے اور ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں ایک مجلّہ بھی ترتیب دے رہی ہے۔

زندہ شاعروں اور ادیبوں کی عظمتوں کے اعتراف کی یہ روایت یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ میں اس کے لیے اراکین "بزم تزئینِ ادب" کو مبارکباد دیتا ہوں اور

کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

مخلص

اسلم اظہر ــــــــــ راولپنڈی

اراکین "تزئینِ ادب" نے اس تقریبِ سعید کے منانے کا انتظام کیا ہے۔ اس سلسلے میں عزیزم ابوالفہیم خورشید خاور امروہوی نے مجھ سے خواہش کی کہ رئیس امروہوی سے متعلق میں بھی اپنے تاثرات تحریری صورت میں اس موقع پر پیش کروں۔

حضرت رئیس امروہوی گوناگوں ادبی خصوصیتوں کے حامل ہی نہیں ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں ملکی سیاست پر بھی نظر رکھتے ہیں اور معاشرے کی حالت پر بھی۔ وہ بے لاگ اور آزادانہ انداز سے اپنے خیالات کا اظہار اپنے قطعات کے ذریعے کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کی خرابیوں پر بھی نکتہ چینی اور بھرپور طنز کرتے ہیں ساتھ ہی شاعرانہ روایات کو بھی برقرار رکھتے ہیں۔ انھوں نے ساقی نامہ میں نئی روح پھونک دی اور معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے۔ وہ ماہرِ علم نفسیات بھی ہیں اور نباضِ قوم بھی۔ ہماری قوم ایسی عظیم شخصیت کی جس قدر بھی ہمت افزائی کرے کم ہے۔ ایسی ہستی اگر یورپ میں ہوتی تو اس کی شہرت و مقبولیت کو چار چاند لگ گئے ہوتے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے اس ہمہ گیر شخصیت کی کیا قدردانی کی۔ غنیمت ہے کہ اس ادبی ادارے نے اس جوہرِ قابل کو پہچانا اور اس کی علمی و ادبی خدمات کو سراہنے کے لیے اس اجتماع کا اہتمام کیا اور معترین اور دوسرے اہلِ قلم حضرات کو اس کی زندگی کے بعض گوشوں پر تبصرہ کرنے کا موقع دیا۔ راقم السطور رئیس صاحب کے فضل و کمال سے واقف ہے، لیکن یہاں چونکہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، دوسرے میں اپنی طویل علالت کے باعث رئیس صاحب کے فنِ شاعری پر حسبِ دلخواہ روشنی ڈالنے سے قاصر ہوں اس لیے نہایت اختصار سے کام لیتے ہوئے ان کی قابلِ قدر کاوش "الف" کے بارے میں صرف اسی قدر کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ان کی یہ تصنیف بہر اعتبار کاملاً ایک عالمانہ کوشش ہے جس کے سرسری مطالعے سے ہی خاطر

کی فن کی عظمتوں اور زبان و بیان پر ان کی قدرتِ کاملہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

خداوند تعالیٰ رئیس صاحب کی عمر دراز کرے اور ارا کین "تزئینِ ادب" کی یہ سعی کامیاب ہو۔

(یکم ستمبر ۱۹۶۸ء) ————— انتظام اللہ شہابی

(صدر انجمن اسلامیہ)

رئیس امروہوی کے سے "گہرے سمندروں میں سفر کرنے والے لوگ" ہر زمانے میں کم ہی ہوا کرتے ہیں۔ ان کے کس کس جوہر کا ذکر کیا جائے۔ مزاج کی کلاسیکیت، مطالعے کی وسعت اور اسلوب کی جزالت! اس کے ساتھ طبیعت کا بہاؤ اور زبان کا رچاؤ! عشق کی تب و تاب اور جستجو کا اضطراب۔ یہ باتیں اس تقلید و رسمیت کے زمانے میں عام نہیں ہیں۔ شاذ اور بہت شاذ! ہم تو انھیں دیکھتے ہیں اور اخوان الصفا کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

شاعری میں

اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

زبان و بیان یا تھ جوڑے، مضامین تازہ پرے باندھے! عالمِ اردو کو ہومر کی الیڈ کے اردو منظوم ترجمے کے لیے ایک ایسے شخص کی تلاش تھی کہ ویسا ہی رنگ و آہنگ رکھتا ہو۔ ان کی نظر بھی آکر ٹکی تو ہمارے رئیس صاحب پر آکر ٹکی۔

مباش منکرِ غالب کہ در زمانہ تست

————— ابن انشا

نوٹ:۔ یہ تحریر مفتی صاحب کی آخری تحریر ہے کیوں کہ جس وقت انھوں نے یہ مضمون لکھا تھا وہ بسترِ علالت پر تھے اور اس دن سے ان کی حالت غیر اطمینانی تھی چنانچہ ۷ نومبر کو انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ (خاور)

چار مصرعوں میں نکتہ پیدا کرنا، بات نکالنا، طنز کر جانا، مسکرا کر نشتر چبھونا اور ساتھ ہی کہنا کہ آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی، رئیس کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی ہے۔ اکبر الہ آبادی آج زندہ ہوتے تو منہ چوم لیتے۔ لیاقت علی خاں کے عہد سے لے کر اس زمانے تک کے فرماں رواؤں میں سخن شناس ہوتے تو ان کا دامن موتیوں سے بھر دیتے یا پھر انھیں دار پر کھنچوا دیتے کیوں کہ اس ظالم کے چار مصرعوں نے بڑے بڑے گنبدوں کو پیوند زمین کیا ہے۔ شورش کاشمیری سمیت بڑے بڑے شاعروں نے ان کا تتبع کرنا چاہا،

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

نقل نقل ہی رہی اور اصل اصل۔ شاعری نے ان سے LOVE MARRIGE کر لی ہے۔ نہ وہ اس کا پیچھا چھوڑتی ہے نہ یہ اس کے عشق سے دست بردار ہوتے ہیں۔ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ یا گل و بلبل کا رشتہ معلوم ہوتا ہے۔ رئیس امروہوی شاعری کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور شاعری ان کے لیے چُنی گئی ہے۔ نثر میں بھی یدطولیٰ رکھتے ہیں، عجیب و غریب باتیں کہہ جاتے ہیں۔ آدمی پڑھتا ہے اور سر دُھنتا ہے۔ پاکستان کے روزناموں میں آج کل جتنے شاعر قلم گھسا رہے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ رئیس امروہوی سے بڑھ کر بدیہہ گو نکتہ سنج اور طناز شاعر کوئی نہیں۔

شورش کاشمیری ۔ لاہور

کراچی پبلک ایجوکیشن سوسائٹی اور انجمن "تزئین ادب" مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جناب رئیس امروہوی کا جشن منانے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے ندما کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ ان کی زندگی میں ان کی قدر نہیں ہوئی۔ غالب جیسے صاحب کمال کو یہ شکوہ کرنا پڑا کہ "ایک کم ستر کی عمر میری ہوئی، سوائے شہرت خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔" مجھے یہ نہیں معلوم کہ رئیس امروہوی نے فن کا کیا پھل پایا، لیکن میں بہ ثبات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم سب ان کے فن کے پھل سے

مستفید ہوئے۔ انھوں نے اپنے قطعات میں جو کہ بائیس برس سے متواتر روزنامہ "جنگ" میں چھپ رہے ہیں، پاکستان کی تاریخ لکھی ہے۔ ان قطعات میں مٹھاس بھی ہے اور تلخی بھی۔ انھوں نے حکومت کے اچھے کاموں کی تعریف بھی کی ہے اور قابلِ اعتراض باتوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اس نشان دہی کے لیے انھوں نے کبھی مزاح کا اور کبھی طنز کا پہلو اختیار کیا، لیکن ان میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ ان کی شاعری اور ادبیت ہے۔

رئیس امروہوی نے بڑی اچھی غزلیں کہی ہیں۔ نواب اچھے مرزا کی مثنویاں بھی بہت خوب ہیں، لیکن میرے خیال میں ان کے قطعات ایسے ہیں کہ انھیں ہماری شاعری اور ادب اور تاریخ میں مستقل جگہ ملے گی۔

میر انیس کے سلام کا شعر ہے ؎

زندگی میں تو نہ اک دن خوش کیا ہنس بول کر
آج کیوں روتے ہیں میرے آشنا میرے لیے

مجھے امید ہے کہ میرے دوست رئیس امروہوی کو قدردانِ ادب ان کی زندگی میں اتنا خوش کریں گے کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ؎

نازم از زندگی خویش کہ کارے کردم

——— ہاشم رضا۔ کراچی

برادرم خورشید خاور امروہوی صاحب

السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ اردو کے منفرد اور صاحب طرز شاعر حضرت رئیس امروہوی کے ساتھ ایک جشن منا رہے ہیں۔ میں رئیس صاحب کا بڑا مداح ہوں۔ میں نے ان جیسا زود گو اور خوش گو شاعر اپنی زندگی میں تو نہیں دیکھا۔

"رئیس کے ساتھ جشن" اردو ادب کا ایک یادگار جشن ہوگا۔ نیک تمنائیں

کے ساتھ۔

مخلص

———— ابراہیم جلیس

حضرت رئیس امروہوی اقلیم سخن کے بادشاہ ہیں۔ ان کے ساتھ ایک "شام" نہیں بہت سی "شامیں" منانی چاہئیں اور ممکن ہوسکے تو کچھ "صبحیں" بھی۔

رئیس صاحب ہر قدر و ستائش کے مستحق ہیں، مجلس "تزئین ادب" کو مبارکباد کہ وہ اس جوہر قابل کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے اسباب مہیا کر رہی ہے۔

———— ماہر القادری - کراچی

پیغام نویسی منصب بڑے آدمیوں اور مستند نقادوں کا ہوتا ہے۔ رئیس صاحب کی شخصیت اتنی پہلودار اور دلچسپ ہے کہ میں یوں بھی ان سے نیازمندانہ تعلق کو غنیمت جانتا ہوں، ان کا ناقد ہونا مجھے زیب نہیں دیتا۔

ہاں جب ان کا مجموعہ "الف" چھپا تھا تو میں نے ریڈیو پاکستان سے ایک تبصرہ نشر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ تقریظ تھی۔ اگر وہ آپ کو مل جائے تو جو حصّہ پسند آئے شائع فرما دیجیے۔ ایک اتنے کہنہ مشق اور عمدہ شاعر کے بارے میں پیغام دینے کا اہل وہی شخص ہوسکتا ہے جو کم از کم ان کے برابر حیثیت رکھتا ہو۔ یقیناً میری حیثیت ایسی نہیں ہے۔

———— جمیل الدین عالی - کراچی

حضرت رئیس امروہوی برّصغیر کے باکمال شاعر، ادیب اور صحافی ہیں۔ ان کا تخلیقی شعور فلسفے کی گتھیوں کو بھی سلجھاتا ہے اور مسائلِ حاضرہ کی عقدہ کشائی بھی کرتا ہے۔ ان کے برجستہ اور فی البدیہہ قطعات (جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے) اس دَور کی تاریخ ہیں۔ رئیس صاحب نے اس دَور کی تاریخ لکھی ہی نہیں ہے بلکہ اپنے سیاسی مضامین اور پُراثر قطعات کے ذریعے تاریخ بنائی بھی ہے۔ ایسی تاریخ ساز

ہستی کو خراجِ عقیدت پیش نہ کرنا ایک جرم ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ہم ان کا جشن منا کر کسی نہ کسی حد تک اپنی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں تا دیر سلامت رکھے کہ وہ اپنے فکر و فن سے قوم کو اور زیادہ بالغ نظری عطا کر سکیں اور ہم بار بار ایسے جشن منا سکیں۔ (آمین)

——— (حکیم) محمد تقی دہلوی۔ کراچی

حضرت رئیس امروہوی نہ محتاجِ تعارف ہیں نہ محتاجِ تعریف، ان کا کلام خود ان کا سب سے بڑا تعارف اور ان کی تعریف ہے۔ اُن کے ایک نیاز مند کی حیثیت سے میں بھی اس تقریب میں انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہو رہا ہوں۔ ان کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ یہ میری محرومی ہے کہ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے علاوہ اور بھی غم میرے ساتھ ہیں اس لیے اس موقع پر تفصیل سے کچھ عرض کرنے سے معذور رہوں۔

رئیس صاحب کے لیے شاعری سچ مچ ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ آنکھ کھولی تو علمی اور شاعرانہ ماحول ملا۔ شرافت و نجابت نے شخصیت کو ایک وزن و وقار بھی بخشا اور جلال و جمال بھی، اسی نے ان کی شخصیت اور کلام دونوں کو حد درجہ محبوب بنا دیا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، انسانی سیرت کے گوناگوں پہلوؤں کا انھوں نے جس دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے اس پر ان کی تحریریں شاہد ہیں۔ شاعری جس کی بنیاد عصری شعور اور نفسیاتِ انسانی کے گہرے مطالعے پر ہو بلاشبہ اعلیٰ درجے کی شاعری ہے جسے بقائے دوام اور شہرتِ عام کے دربار میں یقیناً جگہ ملتی ہے۔ رئیس صاحب بھی اسی دربار میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری خاص پسند بھی ہے اور عام قاری بھی ان کے یہاں بہت کچھ پاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کلام میں رس اور زیادہ رچا ؤ اور رنگ نکھر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو زندہ اور سلامت رکھے کہ وہ ان لوگوں میں ہیں جن سے ہماری تہذیبی روایات، شرافت اور فن دونوں کی آبرو

باقی ہے۔

——— ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ کراچی

جشنِ رئیس امروہوی

جشنِ رئیس امروہوی کے انتظامات کا آخری مرحلہ بھی طے ہوا اور الحمد للّٰہ یہ یادگاری مجلّہ بھی طباعت پذیر ہے۔ اس تین سال میں یعنی اس وقت سے جب میں نے اپنے احباب کو رئیس امروہوی کے ساتھ ایک شام منانے کا مشورہ دیا تھا اب تک اس تقریب کے سلسلے میں کیا کچھ ہوا، کیسی کیسی مشکلات سامنے آئیں، یہ ایک علٰحدہ داستان ہے، دلچسپ، صبر آزما اور ہمّت شکن، آرزوئیں بہت اور حالات ناساز گار۔ بہر صورت جیت اس جذبۂ عقیدت و محبّت کی ہوئی جو رئیس صاحب کے لیے میرے اور میرے ساتھیوں کے دل میں موجزن ہے۔

رئیس امروہوی کے ساتھ ایک شام "جشنِ رئیس امروہوی" میں تبدیل ہو گئی۔ ہوا یوں کہ روزنامہ جنگ کے دفتر میں ہم لوگ ایک شام رئیس کے سلسلے میں جمع ہوئے اور میرے دوست ابراہیم جلیس (یادش بخیر وہ اس زمانے میں روزنامہ جنگ سے وابستہ تھے) اور دیگر احباب نے خیال ظاہر کیا کہ رئیس کو ایک شام کے لیے محدود و مخصوص کر دینا ان کے اور ان کے قدر دانوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ "شام" تو اب عام ہو گئی ہے کیوں نہ اسے جشن کی شکل دے دی جائے۔ ایک شام کا ذمّہ آپ کا اور ہفتے کے باقی ایام دوسروں کے جن میں مشاعرے بھی ہوں گے اور رئیس کے عقیدت مند اور احباب ان کے اعزاز میں اور بھی بہت کچھ کریں گے۔ میرے لیے عذر و انکار کی گنجائش کہاں تھی، بخوشی قبول کر لیا اور اس طرح شامِ رئیس "جشنِ رئیس" میں تبدیل ہو گئی۔

رئیس صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام "پسِ غبار" جس کی ایک ہزار جلدیں رئیس صاحب کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں یہ یادگاری مجلّہ اور ۲۲ جنوری کی یہ تقریب

رئیس امروہوی کی شخصیت کے شایانِ شان نہیں ہے اور اس سے نہ میں مطمئن ہوں اور نہ میرے ساتھی، مگر یہ یقین ہے کہ رئیس صاحب اور آپ ان خامیوں کو جو آپ کے سامنے آئیں گی معاف فرما دیں گے۔

میرے دست راست خورشید خاور امروہوی نے اس تقریب کے لیے کیا کچھ کیا ہے اس کا ذکر اس لیے بیکار ہے کہ سب کچھ انھوں نے کیا ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے ان تمام ساتھیوں اور بزرگوں کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور گرانقدر معاونت سے نوازا۔

۷ار جنوری ۱۹۷۱ء ——— ساحر عباسی۔ کراچی

اے رئیس القلم

اے رئیس القلم۔ اے مرے محترم — تجھ کو کہتے ہیں سب لوگ معجز رقم
تیر و نشتر سے بڑھ کر ہے تیرا قلم — میر و سودا کا باقی ہے تجھ سے بھرم
اے رئیس القلم
اے رئیس القلم

لفظ و معنیٰ سے تجھ کو سروکار ہے — تیری فکرِ رسا، روحِ افکار ہے
علم و دانش کا تو بحرِ ذخّار ہے — تیرے ترکش میں ہیں تیر و نشتر بہم
اے رئیس القلم
اے رئیس القلم

تاج و اورنگ۔ بیکار تیرے لیے — خار و خس جنسِ گلزار تیرے لیے
ہے ہر اک نقش شہکار تیرے لیے — بے حقیقت نہ ہو کس لیے جام و جم
اے رئیس القلم
اے رئیس القلم

ملکیت تیری قطعات و نغمات ہیں — تیری نظموں میں نازک خیالات ہیں
ہر غزل میں کچھ ایسے کمالات ہیں — جن پہ قرباں قلم۔ جس پہ صدقے رقم

اے رئیس القلم
اے رئیس القلم

خوشت فکر نو کا سبب بن گئی — منزلِ کاروانِ طلب بن گئی
رشکِ افلاکِ علم و ادب بن گئی — جس زمیں پر بھی رکھا ہے تونے قدم

اے رئیس القلم
اے رئیس القلم

تیرے افکار میں ہے نیا بانکپن — تیری طبع رسا۔ نازشِ انجمن
اے شہنشاہ اقلیم شعر و سخن — شعر خود ہے تیرے سامنے سر بہ خم

اے رئیس القلم
اے رئیس القلم

رازِ ہستی کیے تونے جو منکشف — اس حقیقت سے کوئی نہیں منحرف
با وجودیکہ خاور بھی ہے معترف — پھر بھی پہچانتے ہیں تجھے لوگ کم

اے رئیس القلم
اے رئیس القلم

——— خورشید خاور امروہوی

فلسفیانہ حکیمانہ تغزل

اردو زبان میں غزل کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں، غالباً اس سلسلے میں اب اردو کا ذخیرہ فارسی سے زیادہ پُرمایہ اور ثروت مند ہو گیا ہے، لیکن اردو غزل کی رنگارنگی اور بوقلمونی کے باوجود نہایت اعتماد سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو غزل میں فلسفیانہ افکار اور حکیمانہ تصورات کی غیر معمولی کمی ہے۔ غالب اور اقبال

سے قطع نظر اکثر و بیشتر اردو غزل گو یا رومانی غزل کہتے ہیں یا متصوفانہ! رئیس کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اردو غزل کو فلسفیانہ افکار اور نفسیاتی تجربات سے مالا مال کر دیا ہے۔ رئیس کا پہلا مجموعۂ کلام "الف" جو ان کے عہدِ بلوغ کا سرمایۂ فکر ہے، بلاشبہ اردو کے ذخیرۂ غزل میں منفرد و ممتاز حیثیت رکھتا ہے، تاہم "پسِ غبار" میں بھی بہت کچھ ہے جو ۱۹۳۱ء سے ۱۹۷۶ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ "پسِ غبار" کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ شروع ہی سے رئیس کی طبیعت کا رجحان فلسفیانہ غزل گوئی اور نفسیاتی تڑپ ہی کی طرف رہا ہے، لیکن ان کے جوہر تو بعد کو کھلے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ وہ اس میدان میں اپنے تمام معاصرین سے مختلف اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

——— امیر حمزہ شنواری

صاحبِ طرز شاعر

"پسِ غبار" رئیس امروہوی صاحب کی شعری تخلیقات کا مجموعہ ہے۔ رئیس صاحب نہ تعارف کے محتاج ہیں نہ میری تعریف کے۔ وہ کہنہ مشق، اُپج رکھنے والے اور صاحبِ طرز شاعر ہیں، جن کو پسند کرنا میرے خیال میں اپنے ذوق کی جانب سے مشتبہ ہونے کا ثبوت ہے۔ تمہید میں شاعر نے اپنے ماحول اور اپنی ذہنی تربیت کا ذکر کیا ہے جس سے شرحِ صدر ہوتا ہے، لیکن وہ کچھ بھی نہ لکھتے تو بھی ان کا کلام ان کی بہترین سفارش تھا۔ وہ ماحول کے تمام لوازم کو شعر میں سمو کر اپنی واردات میں ڈبو دیتے ہیں اور پھر جھلمل جھلمل کرتا شعری ملبوس تیار کرتے ہیں کہ آدمی دیکھا کرے اور سیر نہ ہو۔

پہلی غزل ہی سے ان کے کلام کا آہنگ، ان کے معانی کی عظمت، ان کے فن کی صورت، کا حسن اور خود ان کی طبیعت کی ہی اُپج بدرجۂ اتم ظاہر ہوتی ہے۔ سنیے گا سے

جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں
وہیں سولی پہ لٹکایا گیا ہوں

اس شعر کو پڑھ کر کیسی خیال افروزی پیدا ہوتی ہے، فکر کن کن راہوں سے گزرتی ہے اور شعری روایت کے تسلسل کا کیسا گہرا شعور حاصل ہوتا ہے ؂

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ را فاست
بر دار تواں گفت و بہ منبر نہ تواں گفت

کچھ ناگ کا بھی زہر تھا جامِ شراب میں
لہرا رہا ہوں تجھ کو سرِ دار دیکھ کر

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

یہ ایک شعر کی حالت ہے۔ غزل پڑھ کر خیال کیسی کیسی تابشوں اور سطحوں کا شعور لائے گا۔ اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً ؂

مرے نقشِ قدم نظروں سے اوجھل
مگر ہر موڑ پر پایا گیا ہوں

——— سیّد عابد علی عابد

غزل کی نئی سمت[1]

رئیس امروہوی کا نام اور کلام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ "پسِ غبار" ان کے کلام (غزل و نظم) کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں منظرِ اشاعت پر آیا ہے۔ "پسِ غبار" کے دیباچے میں خود رئیس صاحب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ادبی تنقید اور نقاد کے بارے میں لکھا ہے کہ "جب میں نقادوں کے تبصرے اور ناقدانہ مضامین پڑھتا ہوں اور شعر فہمی کے باب میں جو جو موشگافیاں اور نکتہ طرازیاں آج کی جاتی ہیں،

---

[1] "پسِ غبار" پر پروفیسر مجتبیٰ حسین کے ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر شدہ تبصرے کی تلخیص۔

ان پر غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ کس دنیا کی باتیں کرتے ہیں۔ شعر بھی کوئی سمجھنے سمجھانے کی چیز ہے۔ وہ تو سمجھی سمجھائی حقیقت کی حیثیت سے نازل ہوا کرتا ہے۔"

یہ نقطۂ نظر بھی قابلِ فہم ہے۔ ہم اس دیباچے سے ان کی افتادِ مزاج کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جہاں تک "پسِ غبار" کے معیارِ شعری کا تعلق ہے تو وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ ان کی شاعری روحِ عصر کی صدائے بازگشت ہے اور اوّل سے آخر تک حکیمانہ افکار، نفسیاتی جائزے اور فلسفیانہ شعور سے معمور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رئیس امروہوی نے اردو غزل کو نئی سمت سے آشنا کیا ہے۔ غزل میں انفرادیت کا بھرپور اظہار ہر فن کار کے بس کی بات نہیں، لیکن رئیس امروہوی نے تغزّل میں اپنی شخصیت کو اس طرح سمو دیا ہے کہ ان کی غزل صاف اور الگ پہچانی جاسکتی ہے۔ درحقیقت رئیس امروہوی کا "پسِ غبار" اردو شعر و ادب میں ایک یادگار اہمیت رکھتا ہے، خود اپنے متعلق شاعر کا بیان ہے ؎

نہ جانے کون سے سانچے میں ڈھالیں
ابھی تو صرف پگھلایا گیا ہوں
جہاں ہے رسمِ قتلِ انبیا کی
وہاں مبعوث فرمایا گیا ہوں
سُنا ہر بار میرا کلمۂ صدق
مگر ہر بار جھٹلایا گیا ہوں
ظہور و غیب و پیدا و نہاں کیا
کہیں کھویا کہیں پایا گیا ہوں

——————— پروفیسر مجتبیٰ حسین

ادبی تذکروں جیسا شاعر!

رئیس امروہوی ایک انسان دوست، صاحب فکر اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی بے پایاں ذہانت، قوتِ تخلیق، زود گوئی اور ظرافت کا عالم کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے شعرائے اردو کے تذکروں میں بعض قدیم اکابر شعرا کے احوال میں درج ہے۔ روحِ عصر سے ہمکناری اور عہدِ حاضر کے انسانی مسائل کا شعور ان کی شاعری میں غزل کے فنی تقاضوں سے اس طرح ہم آہنگ نظر آتا ہے کہ رئیس امروہوی کی شاعری روایت کے فنی التزام کے دوش بدوش جدید فکار کا احساسات کی ترجمان بھی بن جاتی ہے۔ رئیس امروہوی نے انسانی احساسات کی تہوں تک رسائی حاصل کرنے اور انسانی ذہن کی گہرائیوں میں سفر کرنے کے لیے علم الانسان کے متعدد شعبوں کا مطالعہ کیا ہے۔ انھیں نفسیات، تاریخ، سیاسیات اور سماجیات سے خصوصی دلچسپی ہے۔ انسان سے درد مند دل کی داخلی و باطنی آگہی کے رشتے کو انھوں نے اپنی شاعری میں بڑی خوش اسلوبی سے استوار کیا ہے۔

رئیس امروہوی کے پہلے مجموعۂ کلام "الف" کی ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی ہوئی ہے، ان کا دوسرا شعری مجموعہ "پس غبار" بھی "الف" کی طرح رئیس امروہوی کی غزلوں اور نظموں کے ایک انتخاب پر مشتمل ہے۔ مجموعے کا معنوی حسن اس کی صوری دل کشی سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

رئیس امروہوی نے مجموعے کے شروع میں "قلم برداشتہ" کے زیر عنوان اپنی زندگی کے بعض اہم کوائف، اپنے ادبی اور فکری معتقدات اور شعری رجحانات پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ ان ہی کے الفاظ میں زیر نظر مجموعے میں بچپن سے ۱۹۴۶ء تک کی چند بلکہ چند در چند غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ "الف" کی اشاعت یعنی ۱۹۴۶ء کے بعد جو کچھ کہا گیا ہے اس کے ایک جزو قلیل کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ رئیس امروہوی کی غزلوں اور نظموں میں ان کا انفرادی رنگِ سخن پوری طرح نمایاں ہے اور

یقین ہے کہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام "الف" کی طرح "پسِ غبار" کو بھی اہلِ نظر اور سخن فہم قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اس مجموعے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عالمِ بے خودی میں گہرا سانس
سینۂ کائنات میں ہے سفر

بوئے گل اب تجھے احساس ہوا بھی کہ تجھے
تیری آوارہ طبیعت نے کہیں کا نہ رکھا

کہاں ہم اختتامِ نغمہ کے بعد
اگر ہوں گے تو صرف آواز ہوں گے

جنھیں نگارشِ لوحِ ابد کا دعویٰ ہے
فقط کتابتِ سنگِ مزار کرتے ہیں

کانٹوں سے فگار انگلیاں ہیں
ملبوسِ بہار سی رہا ہوں

دونوں جانب سے ہیں اصرار ملاقاتوں کے
اور ارمانِ ملاقات اِدھر ہے نہ اُدھر

صبح کے قافلوں سے نبھ نہ سکی
میں اکیلا سوادِ شب میں چلا

کتنے معانقے تھے کہ بے جذبۂ وصال
صرفِ فشارِ سینہ و آغوش ہو گئے

سحر انصاری ____________

پہلو دار شخصیت

زیر تبصرہ پہلی کتاب رئیس امروہوی کا مجموعۂ کلام "پسِ غبار" ہے جسے بزم "تزئینِ ادب" کراچی نے شائع کیا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ اور ۲۰۰ صفحات مجلد۔ اس مجموعے کو بزم "تزئینِ ادب" کراچی نے "جشن رئیس امروہوی" کے موقع پر بطور نذرِ عقیدت شائع کیا ہے۔ تعارف ساحر عباسی نے لکھا اور پیش لفظ بعنوان "قلم برداشتہ" خود شاعر نے لکھا ہے۔ کتاب کا عنوان رئیس امروہوی کے ایک شعر سے لیا گیا ہے ؎

یہ شامِ غم ہی تو یہ فروغِ جاں تو نہیں
پسِ غبار کوئی تازہ کارواں تو نہیں

یہ مجموعہ ان کے پہلے مجموعہ "الف" کے بعد دوسری کڑی ہے جس میں شاعر کے بچپن سے ۱۹۴۶ء تک اور پھر ۱۹۶۲ء کے بعد سے اب تک کی منتخب غزلیں اور اکا دکا نظمیں شامل ہیں۔

رئیس امروہوی دورِ جدید کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جن کی "جوہر دار" شاعری اور پہلو دار شخصیت کا جان لینا آسان کام نہیں ہے۔ انھوں نے ۴۵ سال کے طویل عرصے میں شاعری کے ہر پہلو اور ہر صنعت کو آزمایا ہے اور ان کی بے شمار نگارشات نثر میں بکھری ہوئی ہیں جس میں افسانوی ادب سے لے کر نفسیات اور روحانیات تک سب کچھ شامل ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کہا ہے کہ کوئی فن کار اپنی روایات سے الگ نہیں ہو سکتا اور ساتھ ہی اپنی منفرد صلاحیتوں سے ماضی کا رُخ موڑ کر اس پر اپنی چھاپ لگا دیتا ہے۔

یہی بات رئیس امروہوی پر صادق آتی ہے۔ انھوں نے قدیم روایات شعر و سخن کے ماحول میں آنکھ کھولی ہے اور خود اپنی منفرد شخصیت سے نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ شاعر نے غزل کی جولانگاہ میں اپنی ندرت تخیل سے اس کو ایک نیا رنگ دیا جس میں روایتی محبوب، عشق و محبت، گل و بلبل، گیسو و عارض اور ہجر و وصال کے ساتھ دورِ جدید کا انتشار، روحانیت اور مادّیت کی کش مکش، عقل و جنوں اور نعرۂ انقلاب سب کچھ شامل ہے۔ اپنی شاعری کے مقصد کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

جانِ تخلیق ہے فن کار کا ابلاغ رئیس
صرف فن کاری ابلاغ سے کیا ہوتا ہے

رئیس کو خدا نے ایک طبع رسا اور بلند پرواز تخیل عطا کیا ہے جس کے امتزاج سے ان کے شعر وجود میں آتے ہیں۔ ساری کائنات انھیں اپنی اسی قوتِ تخیل کا پرتو معلوم ہوتی ہے ؎

نہ صبح و شام کہیں ہے نہ چاند تارے ہیں
سب ایک شمعِ تخیل کے استعارے ہیں

روح کی گہرائیوں میں اُترنے والے بے آواز نغموں کو انگریزی شاعر کیٹس نے UNHEARD MELODIES کہا ہے۔ رئیس اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

حشر جس سے دلِ مضطرب میں بپا ہوتا ہے
صرف اک نغمۂ بے صوت و صدا ہوتا ہے
روحِ شاعر سے اُبھرتا ہے سرودِ ابدی!
عین اس وقت کہ دل ڈوب رہا ہوتا ہے

اس طرح ان کی نظمیں فلسفیانہ مضامین، نفسیاتی مسائل، شعور بیداری، حرّیت، سیاسی، سماجی اور ثقافتی اقدار کی ترجمانی کرتی ہیں۔ قوم کے نام ایک پیغام میں فرماتے ہیں ؎

کشورِ پاک کی تشکیل تھی اک خوابِ جمیل!
لیکن اس خواب کی تعبیر تو خوابِ غفلت

سخت حیرت ہے کہ آنا و وطن کے باوصف
ہو سکی تجھ سے نہ تکمیلِ امورِ ملّت

"کائناتِ تازہ" کے عنوان سے ایک نظم میں نوجوانوں کو ایک ولولہ انگیز پیغام دیتے ہیں جنھیں انسانی اقدار کی بنیاد پر ایک نئی کائنات بنانا ہے سه

اک نئی دانش کا آغاز اک نئی دنیا کا جشن
اک جہانِ نو کی پیدائش بہ فضل کردگار

دورِ حاضر کی مادیت پرستی اور روحانی کرب کا جائزہ "سوال یہ ہے" میں بہت خوبصورت انداز سے لیا گیا ہے جس میں ایک طنزِ لطیف نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی طرح "جاگ" ایک ولولہ خیز نظم ہے۔ ان کا آئیڈیل ایک ایسا شاعر ہے جو سوز و سازِ ہستی سے آشنا ہو، جس کا پیام زندگانی ہو، جو مذاقِ شاعرانہ، مزاجِ خسروانہ، گدازِ قلندرانہ، اور نظرِ پیمبرانہ رکھتا ہو۔ وہ اسی "شاعرِ عہدِ نو" کی تلاش میں ہیں۔ معاشرے کی برائیوں پر انھوں نے جگہ جگہ نشتر چلائے ہیں۔ کہیں ایک بازاری عورت سے مخاطب ہیں، کسی جگہ محفلِ رقص و سرود پر آنسو بہاتے ہیں، کبھی جنّتِ گم گشتہ کی یاد کرتے ہیں اور کہیں سامراجی قوتوں سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔

ساری نظموں کو دیکھنے سے شاعر کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نادر تشبیہات اور استعارے، چست بندشیں اور ترکیبیں اور اس کے ساتھ تخیل کی نزاکت اور ذہن کی باریک بینی رئیس امروہوی کے کلام کا طرۂ امتیاز رہی۔

——— پروفیسر سعید الحسن

رئیس! حریت پسند شاعر

رئیس امروہوی اردو کے مشہور شعرا کی صفِ اوّل سے تعلق رکھتے ہیں۔ "پسِ غبار" ان کی غزلوں اور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ "پسِ غبار" کے علاوہ وہ چند اور کتابوں کے بھی مصنّف ہیں جو ان کے زرخیز قلم کی پیداوار رہیں۔ بلاشک و شبہ

قطعہ گوئی کے میدان میں وہ برِصغیر کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ قطعہ گوئی کے میدان میں رئیس اتفاقیہ طور پر داخل ہوئے۔ ہوا یہ کہ جس روز[1] مہاتما گاندھی کے قتل کا واقعہ ہوا۔ ان کے کسی رفیقِ صحافت نے اصرار کیا کہ وہ اس سانحے پر (اخبار کے ضمیمے کے لیے) ایک قطعہ کہہ دیں۔ فی الفور فرمائش پوری کر دی گئی اور اس روز سے وہ ایک قطعہ روز کہہ رہے ہیں۔ بے شک عظیم کارنامہ!!

لیکن بنیادی طور پر وہ ایک غزل گو شاعر ہیں اور اس وقت بہت کم (غزل گو) شاعر ایسے ہیں جو ان کی فکرِ رسا کے طول و عرض کا مقابلہ تو کجا، احاطہ ہی کر سکیں۔ وسیع علم و فضل کی جھلک اور آفاقیت کا شعور ان کی ہر غزل میں ملتا ہے۔ اگر ہم حضرت جوش ملیح آبادی کی رائے کو تسلیم کر لیتے ہیں تو رئیس آج سب سے بڑے پُر گو شاعر ہیں۔ آج سے چھے سال قبل جب رئیس کی غزل و نظم کا پہلا مجموعہ "الف" منصۂ شہود پر آیا تو فن کے نقادوں نے رئیس کے شعر میں مربوط سرّیت کی ایک خاص چھاپ دیکھی۔ ۱۹۵۸ء کے (انقلاب) حالات نے رئیس سے ان کی طبعی شوخی چھین لی اور انھوں نے تہذیبی لاشعور کی طرف مراجعت کی۔ یونانی ایسے ناسازگار حالات میں اپنے اصنامی تہہ خانے (HADES) کی طرف مڑتے، لیکن رئیس نے اجتہاداً شعور تحت الشعور اور لاشعور کی طرف رخ کیا اور شاعر نے (لاشعور کے) پُراسرار دائروں، شکلوں اور ان کے طلسم کو اس طرح دیکھا کہ اس سے پہلے کسی شاعر نے اس کی جسارت نہیں کی تھی۔ اب اس نے اپنے باطنی سفر میں روح کی پُرخلوص آواز کو بھی شامل کر لیا (یہ سرّیت کا سفر ہے) "پسِ غبار" اسی ذہنی حالت کا ایک اگلا قدم ہے۔ اب شاعر پر تازہ حقیقتیں بھی منکشف ہو گئی ہیں اور وہ ان حقیقتوں سے شدید طور پر متاثر ہے۔ رئیس دوسرے شاعروں کی طرح بندھے ٹکے کلیوں اور فارمولوں کے شاعر نہیں۔ وہ ہر جذبے کی

---

[1] ۲ر جنوری ۱۹۴۸ء

ایسی مساوات فراہم کرتے ہیں جو حقائق سے قریب تر ہو، وہ اپنی فکر پر اضافے کرتے رہتے ہیں ۔ ان کی طبیعت کی یہی ہمہ جہتی ناقدینِ فن کے ایوان میں قبول و درجہ بندی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے ۔ وہ ایک مشکل آواز ہیں جس کا احاطہ دشوار ہے ۔ کچھ ایسے بھی شاعر ہیں جنھوں نے رئیس کے مقابلے میں بہت کم کہا ہے اور طرہ یہ کہ بہتر بھی نہیں کہا، تاہم وہ ایوانِ شعر میں اپنے منصب سے بلند تر جگہوں پر قابض ہو بیٹھے ہیں ۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ روزنامہ جنگ) میں لکھا تھا کہ وہ رئیس کے علاوہ کسی اور شاعر سے واقف نہیں جو گھنٹوں منظوم گفتگو کر سکے ۔ انھوں نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ رئیس کا ایک شعر میرے تمام کلام پر بھاری ہے ۔ شعر یہ تھا ؎

شاید اسے عشق بھی نہ سمجھے
جس کرب میں عقل مبتلا ہے

جوش اس پیش کش کے وقت غالباً آریائی اخلاق سے کام لے رہے تھے ، لیکن سامی النسل رئیس اس پیش کش کو شکریے کے ساتھ مسترد کر دینے پر قادر رہیں، لیکن وہ ہرگز ایسا نہیں کریں گے ۔ رئیس کی شاعری، ادبی حلقوں میں زیادہ گفتگو کا موضوع نہیں بن پاتی ۔ کیوں کہ خود شاعر کا رویّہ اس قسم کی بحث کی ہمت افزائی نہیں کرتا ۔ وہ اپنے ملنے والوں سے جس مسئلے پر سب سے کم گفتگو پسند کرتے ہیں، وہ خود ان کی شاعری کا مسئلہ ہے ۔ جوہری طبیعات پر بحث ہو یا معاشیات پر، وہ ایک مینارِ نور کی طرح ضیا پاشی کرتے رہتے ہیں ۔ ابھی کچھ عرصے سے ان کے ذہن پر فلسفے اور نفسیات کا غلبہ ہو گیا ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ فارسی اور عربی زبان پر عبور رکھتے ہیں ۔ انھوں نے پہلی کتاب اس وقت لکھی تھی جب ان کی عمر اٹھارہ برس کی تھی، اور یہ فارسی میں تھی ۔ بنا بریں رئیس کی شاعری تک سفر کرنے کے لیے تھوڑی سی تیاری کی ضرورت ہے ۔ کچھ گمشدہ کڑیاں ان کے شعر کی تفہیم کے راستے میں حائل ہو جاتی ہیں ۔ یہ رکاوٹیں خود رئیس نہیں کھڑی کرتے بلکہ قاری علامتوں اور تشبیہوں کے تانے بانے میں اُلجھ جاتے ہیں

آج کل رئیس کچھ اُکھڑی اُکھڑی سی شاعری کر رہے ہیں یعنی یہ کہ زندگی کا رومان مفقود ہو چلا ہے، ناامیدی اور قنوطیت کا غلبہ ہے۔ باوجودیکہ ان کی ذہنی ساخت ایک خاص قسم کی ادّعائیت کی طالب ہے۔ ادّعائیت اور قنوطیت کی مبارزہ آرائی کو فن بنا دینا صرف رئیس ہی کا کام ہے۔ یہ زبردست تخلیقی کارنامہ ہے۔ دو ذاتیں باہم برسرِ پیکار ہیں اور صرف ایک مجتہد شخص ہی اس مبارزہ آرائی کو فن کا روپ دے سکتا ہے، ورنہ وہ مہمل سے بن کر رہ جائے گا۔ "پسِ غبار" بجا طور پر ایک بر محل اضافہ ہے۔ ۱۹۶۹ء شاعری کے باب میں بنجر سال رہا ہے۔ جتنے بھی مجموعے (اس سال) منظرِ اشاعت پر آئے۔ ان کی غالب اکثریت کوئی تاثر نہ چھوڑ سکی۔ ان میں سے کچھ تو افسوسناک حد تک طفلانہ تھے۔ ان مجموعوں کو دیکھ کر بے ساختہ یہ دعا زبان پر آئی کہ۔

"خدایا! ان لوگوں پر رحم کر۔ جو دوسروں کے لیے جذبۂ رحم سے عاری ہیں!"

ان حالات میں "پسِ غبار" کی اشاعت باعثِ اطمینان و انبساط ہے۔ یہ ہمیں کچھ استغراق بخشتا ہے کچھ قنوطیت! غالباً یہ تینوں کیفیات ایسی ہیں (انبساط، استغراق اور قنوطیت) جن سے ہمیں رئیس صاحب دوچار رکھنا چاہیں گے اور محظوظ ہوں گے۔ "پسِ غبار" درحقیقت شاندار پیشکش ہے اور شاعر اور اس کی دنیا کے ادراک کے سلسلے میں غیر معمولی طور پر اہم۔

رئیس کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے طور پر "بزمِ تزئینِ ادب" نے اس مجموعے کو منظرِ اشاعت پر لا کر اعلا مثال قائم کی ہے۔ اس سلسلے میں ساحر عباسی اور خورشید خاور (کتاب کے مرتبین) ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

——— ایم۔ اے۔ صدّیقی

(روزنامہ "انجام" کراچی ۲۸۔ دسمبر ۱۹۶۹ء)

مصنّف رئیس القلم حضرت رئیس امروہوی۔ مرتّب و ناشر خورشید خاور امروہوی۔ پیشکش "بزمِ تزئینِ ادب" کراچی۔ پتہ ۱۲۹ مانک جی اسٹریٹ گارڈن ایسٹ کراچی ضخامت

ضخامت ۲۰۸ صفحات - قیمت پانچ روپے۔

رئیس امروہوی بحیثیت ادیب، شاعر اور صحافی اتنے مشہور و معروف ہیں کہ ان کے لیے کچھ کہنا لاحاصل ہے وہ کافی عرصے سے مسلسل و متواتر اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اس لیے اکثر لوگ ان کے طرزِ تحریر اور اندازِ بیان سے پوری طرح آشنا ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نظم ہو یا نثر دونوں پر انھیں پوری قدرت ہے۔ وہ اچھا لکھتے ہیں، ان کی اہم خصوصیات پُرگوئی اور زود گوئی ہیں۔

"پسِ غبار" ان کا مجموعۂ کلام ہے جو "جشنِ رئیس امروہوی" کے موقع پر انجمن "تزئینِ ادب" کی جانب سے زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے عقیدت کے طور پر ان کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انجمن کے اراکین کی یقیناً یہ خوش ذوقی ہے کہ انھوں نے ایک ادیب و شاعر کے لیے ایک ایسا تحفہ تیار کرایا اور ان کو نذر کر رہے ہیں۔

کتاب کے شروع میں "بکمالِ عقیدت" کے عنوان سے ساحر عباسی نے اس گلدستے کی تیاری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ رئیس صاحب کی اعلیٰ صلاحیتوں کو سراہا اور مختصر طور سے ان کے کلام پر کچھ تبصرہ بھی کر دیا ہے۔ پھر رئیس امروہوی صاحب کا مختصر مقدمہ ہے اس کے بعد ۱۹۸ صفحات میں غزلیات اور نظمیں ہیں اور چونکہ ساحر صاحب نے رئیس کو اردو کا تیسرا افلس شاعر کہا ہے اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اکثر و بیشتر کلام دل سے زیادہ حقائق کا ترجمان ہے اور جذبات سے زیادہ غور و فکر کا آئینہ ہے تاہم نظموں میں شعریت اور نغمگی کی کیفیت نسبتاً زیادہ ہے اور اس لیے اثر و تاثیر بھی زیادہ۔

سید الطاف علی بریلوی

(مدیر "العلم" - کراچی)

● فکروفن

● جائزے

maablib.org

سید ذہین شاہ تاجی

رئیس کی شاعرانہ عظمت

رئیس امروہوی دورِ حاضر کے ممتاز شعرا میں ہیں وہ تمام اصنافِ سخن میں قادر الکلام ہیں، پُرگو ہیں، حاضر طبع ہیں، زود گو ہیں، فکر میں قدرت ہے، طرزِ ادا میں جدّت ہے، زبان میں فصاحت ہے، بیان میں سلاست ہے، نظر میں وسعت ہے۔ غزل ہو یا نظم قطعات ہوں یا رباعیاں، ادب ہو یا فلسفہ رندی ومستی ہو یا فقر و تصوف سنجیدہ مضامین ہوں یا طنز و مزاح، وہ ہر میدان میں مرد نظر آتے ہیں اور جس موضوع پر لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں، ان کی غزل میں قدیم غزل کی روح نئے اندازِ بیاں کا جامہ پہن کر شاہدِ معنی کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ وہ شاہدِ معنی کو زبانِ شعر میں "جانِ گل" کہتے ہیں رنگ کو مجاز اور بو کو حقیقت بنا کر گل کو رنگ و بو دونوں کا جامع کہتے ہیں مگر اس جامعیت کے مشاہدے پر بھی ان کی نظر قانع نہیں، وہ گل میں "جانِ گل" کو خوشبو اور رنگ میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ "جانِ گل" کو "ماورائے رنگ و بو" تصور کرتے ہیں اور اس سے برافگندہ نقابی کے تمنائی ہیں ؎

اگر نقاب اُلٹ دے تو کیا قیامت ہو
وہ جانِ گل کہ کبھی رنگ ہے کبھی خوشبو

حوادثِ عالم کی توجیح عقل کے سپرد کردی جائے گی تو سبب و مسبّب اور علّت و معلول کی گتھیاں سلجھانے کے بجائے عقل ان میں اُلجھ کر رہ جائے گی۔ رئیس امروہوی یہ کام عقل کے سپرد نہیں کرتے عشق سے حادثاتِ لیل و نہار کا سبب پوچھتے ہیں اور انھیں

جواب ملتا ہے کہ ؎

یہ حادثات شب دردنہ بے سبب تو نہیں
بدل رہا ہے کوئی خواب ناز میں پہلو

محبتّ میں سب کچھ ہے مایوسی نہیں وہ اپنے محبوب سے شکستہ دلی کے باوجود مایوس نہیں وہ ستم میں کرم کے ہزاروں پہلو دیکھتے ہیں یہ انداز عشق کو یوں سے ممتاز کرتا ہے ؎

تمہیں فسردہ دلوں کا خیال ہی تو نہیں
خیال ہو تو کرم کے ہزار ہا پہلو

نور و نار اور جمال و جلال ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں ؎

بس ایک آگ ہے جو حسن میں ہے گرمیٔ ناز
مزاج عشق میں ٹھہرے اگر تو سوز دروں

شدتِ احساس سے خیال واقعہ بن جاتا ہے ؎

دل کو احساس کی شدت نے کہیں کا نہ رکھا
خود محبت کو محبت نے کہیں کا نہ رکھا

روحانئین کے نزدیک مادہ بھی ہماری شعوری کیفیات کا نام ہے یہ ہمارے شعور ہی کی تو کیفیات ہیں جن کا ادراک ہم خارج میں کرتے ہیں۔ رئیس امروہوی اس مقام پر اپنے پیکرِ جسمانی کو اپنی روح پر لباس کی صورت میں مشاہدہ کرتے تو مادہ جواب دے جاتا، مگر وہ جانتے ہیں کہ پیکر حسن بھی شعور ہی کی ایک کیفیت ہے اور یہ شعور ہی بجائے خود لباسِ جاں ہے، کہتے ہیں ؎

خود اپنے شعورِ جاں سے ملبس
بے پیکر و پیرہن ہیں ہم لوگ

انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے اس لیے اس کو آزادی محبوب ہے، اس حقیقت کی طرف رئیس نے کیا خوب توجہ دلائی ہے ؎

خود اپنے وجود میں مقیّد ۔۔۔ پابستۂ بے رسن ہیں ہم لوگ

زمانۂ مطلق بھی ہے مقید بھی اس پیچیدہ مسئلے کو رئیس صاحب نے کتنے سادہ الفاظ میں
بیان کیا ہے جس سے ذات باری کے گمان ہونے کا مفہوم ہوتا ہے سہ

گماں نہ کر کہ زمانہ کبھی نیا ہوگا
یہی جو ہے یہی ہوگا یہی رہا ہوگا

اس مادیت اور لا ادریت کے دور میں رئیس آخرت کی زندگی پر نہ صرف یقین ہی
رکھتے ہیں بلکہ وہ اس یقین کو دوسروں کی طرف منتقل کرنے کے لیے مؤثر یقین آفریں اور دل نشین
پیرایۂ بیان کے بھی مالک ہیں سہ

خلوت قبر سے نکلتی ہے	اس طرح بن سنور کے روحِ حیات
جس طرح جشنِ شب سے جلوۂ صبح	جس طرح بادلوں سے چاندنی رات

یقینی اور یقین دہانی کا یہ عالم ہے کہ کثرتِ عالم کی تعبیر وہ کثرتِ صفات سے کرتے اور
کثرتِ صفات کو ذات وصفات کے چہرے پر رنگا رنگ نقابوں سے تعبیر کرتے ہیں سہ

کچھ نہیں اک جمالِ ذات پہ ہیں
صد حجابات رنگ رنگ صفات

مگر شعر مابعد میں جب وہ کہتے ہیں سہ

اور یہ بھی تمام وہم و گماں
اور یہ بھی تمام معروضات

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے وجدان و عرفان پر جیسے انھیں اعتماد نہ رہا ہو۔ رئیس کے یہاں
علم و ادب میں جہاں حکمت و فلسفہ کی چاشنی ہے وہاں تذبذب اور تشکیک کی ملاوٹ بھی
پائی جاتی ہے سہ

یہ حقیقت کی تجلی ہے مری نظروں میں
یا فقط سایۂ اوہام ہے معلوم نہیں

انسان اللہ کی صنعتِ خلاقی کا مظہر ہے اس لیے مجازاً صنعتِ خلق کا ظہور اس سے
ہوتا ہے سہ

ہزار عالم و آدم ہزار خالق و خلق
ابھی ہیں عرصۂ تخلیق میں یہ شکلِ غبار

بصیرت و بصارت میں امتیاز نہ کیا جائے تو اس شعر کے معنی کا شعور مشکل ہے جزوی مشاہدے کا کلی مشاہدے میں محو ہو جانے کا نام نظر کا بینائی میں گم ہو جانا رکھا گیا ہے ؎

ڈھونڈتا پھرتا ہوں خود اپنی بصیرت کی حدود
کھو گئی ہیں مری نظریں مری بینائی میں

استغنائے عشق سے حسن میں ذوقِ تجسس پیدا ہو گیا ہے ؎

یہ کون قریب آ رہا ہے
خود میرے ہی نقشِ پا پہ چل کر

حقیقتِ کائنات

کیا ہے یہ کائناتِ کن فیکون　　قطرۂ از محیطِ موجودات
کیا ہے یہ عالمِ وجود و بقا　　ذرۂ از جہانِ مخلوقات

جس بحرِ بیکراں کا ایک قطرۂ کائنات کن فیکون ہو اور سارا عالمِ وجود جس دنیا کے آگے ذرے کی برابر ہوں اس کی لامتناہی وسعتوں کا اندازہ لگانا محال ہے مگر جس قلب میں یہ لامتناہی وسعتیں سما سکیں وہ وسیع تر ہے۔ رئیس "دل" کو لامتناہی وسعتوں کا حامل قرار دیتے ہیں۔ جب بیکراں بتلاتے ہیں تو "دلِ مومن" کی تعریف اس پر صادق آتی ہے ؎

دل غمِ دو جہاں میں ڈوب گیا
بے کراں بے کراں میں ڈوب گیا

خیر و شر دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں ؎

خیرِ مطلق تھا شر سے آلودہ
خیرِ مطلق کو شر سے پاک کیا

خاموشی اور اعماقِ فکر دیکھیے حرکتِ نفسی کو منازلِ حیات میں قطعِ سفر سے تعبیر کیا گیا ہے ؎

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

مسرتِ مجاز اور غمِ حقیقت کو بھی دیکھیے ؎

شگفتگی کو ٹٹولا فسردگی پائی
مسرتوں کو نچوڑا ٹپک پڑے آنسو

"چہ قیامتی کہ نمی رسی زکنار ما بکنار ما" کی تفسیر ملاحظہ ہو ؎

یہ نازِ حسن ہے یا امتحانِ عشق اے دوست
کہ تیرے ساتھ رہوں اور تجھ کو پا نہ سکوں

محبوب کی کم آمیزی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے ؎

ان سے محفل میں ملاقات بھی کم تھی رئیس
اُف وہ آداب جو برتے گئے تنہائی میں

غالب نے کہا تھا کہ "موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی" لیکن رئیس خرامِ صبا سے محبوبِ صبا خرام کی صدائے پا سنتے ہیں ؎

چلی کچھ آج اس انداز سے نسیمِ بہار
کہ بار بار کسی کی صدائے پا آئی

نیازِ عشق نازِ حسن سے بدلا تو ؎

اب آپ کی آنکھ میں ہیں آنسو
سیلاب کا رُخ بدل گیا ہے

حال کے آئینے میں دوست کی تجلی جاودانی صورت میں نظر آتی ہے ؎

میں حضورِ دوست فکرِ دوش و فردا کیا کروں
یہ وہ لمحہ ہے جو ماضی میں نہ مستقبل میں ہے

غرورِ عشق میں شانِ کبریائی ملاحظہ ہو؂

مجسّمہ ہے نیاز آئیں نوائے دل
یہ تجھ میں بے نیازی ہے کہاں کی

وہ رگِ جاں سے قریب ہے دل اس کا عرش ہے وہ پاس ہے ساتھ ہے۔
انفس و آفاق اس کی جلوہ گاہیں ہیں مگر؂

باہمہ قربت دل دیدہ
ہائے وہ دل نشیں و نادیدہ

خود آگہی کو رئیس جہنّم کہتے ہیں جس میں خود جل رہے ہیں؂

میرے قریب نہ آ اے بہشتِ بے خبری
خود آگہی کے جہنّم میں جل رہا ہوں میں

حُسن کی کشش مشہور ہے دل محبوب کی طرف خود بخود کھنچتا ہے یہ کیفیت شعوری ہے مگر گریز کو جذبِ لاشعوری بتانا رئیس کی فکر کا وہ کارنامہ ہے جس کی داد اہلِ فکر ہی دے سکتے ہیں؂

جمالِ دوست کی جانب کشش ہے عینِ شعور
رہا گریز تو وہ جذبِ لاشعوری ہے

ایک بات کو مختلف روپ میں پیش کرنا، ایک مفہوم کو رنگا رنگ اسلوب سے ادا کرنا، ایک حقیقت کو گوناگوں الفاظ و عبارت کے جامے میں ملبوس کرنا جہاں شاعرانہ صلاحیتوں کا مظہر ہوتا ہے وہاں شاعر کے تخیلی تموّل اور علمی سرمائے کا بھی اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ رئیس امروہوی میں یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ جب ہم ان کی بعض منظومات مثلاً "آفرینش نامہ" دیکھتے ہیں تو پوری نظم جو تین صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اس کا ماحصل دو لفظوں اطلاق و قید یا مطلق و مقید ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر نے ان فلسفیانہ اصطلاحات کی خشک زمین کو نہایت شگفتہ اور بہت ہی تر و تازہ نظم سے باغ و بہار بنا دیا ہے۔ پوری نظم زورِ بیان، ندرتِ کلام اور شوکتِ الفاظ کا

مرقع ہے۔ اسی طرح "عدم" کے عنوان سے جو نظم ہے وہ بھی رئیس کا ادبی شاہکار ہے۔ پوری نظم مرقع ہے۔ تلازمِ الفاظ اور مترادفات کا پُرشوکت استعمال قاآنی کی یاد تازہ کرتا ہے فی الجملہ منظومات سے شاعر کی وسعتِ نظر و فکر کی گہرائی مطالعے کی ہمہ گیری اور مشاہدے کی جامعیت کا پتہ چلتا ہے۔

○

احمد ندیم قاسمی

حضرت رئیس امروہوی عمدہ شاعر اور پیارے انسان تھے۔ انسانی رشتوں کا احترام اس حد تک تھا کہ ایک بار اگر رئیس صاحب کسی سے مل لیتے تو اسے عمر بھر نہ بھولتے۔ میں انھیں گزشتہ چالیس برس سے جانتا تھا، کبھی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا، جب مجھے ان کے طرزِ عمل یا گفتگو کے کسی پہلو سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ یوں سمجھیے کہ وہ سراسر محبت اور سراپا خلوص تھے، انھیں کھو کر پاکستان کے تہذیب و فن نے بہت بڑا سرمایہ کھو دیا۔

پروفیسر شور علیگ

فن کاری ابلاغ

رئیس امروہوی برِصغیر کے مشخّص فن کار ہیں۔ وہ چنداں محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کے تازہ مجموعۂ کلام "پسِ غبار" کے آرٹ پر اظہارِ رائے سے پیشتر بے محل نہیں اگر ضمناً اور تمہیداً اس دور کے آرٹ سے متعلق یہ کہا جائے کہ اس دور کا آرٹ کچھ دو نوعیتوں کا ہے۔ ایک وہ آرٹ جس کا خالق شاعر ہے اور دوسرا وہ آرٹ جو خود شاعر کا خالق ہے۔ پہلی نوعیت کا آرٹ نسباً تو فطری ہے لیکن حسباً آفاقی ہے، اس آرٹ کا تعلق بلا قیدِ نسل و رنگ انسان اور انسانی معاشرے سے ہے، یہ آرٹ چونکہ کائنات کو ایک کثیر الاطراف حقیقت تسلیم کرتا ہے۔ اس لیے اس کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت اس کے ادراک کی وہ جامعیت ہے جو مرزا غالب کی زبان میں کسی آرٹ کو "قطرے میں دجلہ" اور "جزو میں کل" کے مشاہدے کی دیدہ وری عطا کرتی ہے ؎

ذرہ بے مایہ سے لینا سراغِ آفتاب
قطرۂ ناچیز کو لبریزِ طوفاں دیکھنا

آرٹ کے اندر اس نوعیت کی دیدہ وری کا ارتکاز چونکہ زندگی کے کسی ایک بھی رُخ پر نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کے ادراک اور شعور کے محرکات "زمان و مکان کے انقلابات" "حالات کا ردّ و بدل" اور "معاشرے کی شکست و ریخت" کے وہ سارے اسباب ہوتے ہیں جن کا تعلق بلا واسطہ یا بالواسطہ انسان، انسانیت اور سماج سے ہوتا ہے۔ اس آرٹ کی نوعیت بالکل اس قوسِ قزح کی سی ہوتی ہے جس کے اندر رنگوں کی بوقلمونی اور کثرت کے باوصف

ایک وحدتِ جمال منعکس ہوتی ہے۔ آرٹ کے اندر حیاتِ انسانی کی رنگا رنگی کے اسی ارتکاز کا نام بالزیک BALZAC کے نزدیک "فطرتِ مرتکز" (NATURE CONCENTRATED) ہے۔ اس آرٹ کا مابہ الامتیاز چونکہ اس کا ہمہ گیر شعور ہوتا ہے اس لیے اس کی اقدار خالص مادی نہیں ہوتیں بلکہ خیر کی تخلیق اور جمالیاتی بھی ہوتی ہیں۔ اور اگر سچ پوچھا جائے تو زندگی کے جلال اور جمال کے اسی توازن میں آرٹ کی جامعیت اور آفاقیت کا راز پوشیدہ ہے۔ اس راز کی پردہ کشائی میں پوپ (POPE) نے ایک جگہ بڑے سچے کی بات کہی ہے۔ اس کے بقول "جہاں تک روما کے عقاب پرواز کرتے رہے آرٹ ان کا تعاقب برابر کرتا رہا ——————

"ART STILL FOLLOWED WHERE ROME'S EAGLES FLEW" دراصل حیاتِ انسانی میں کسی دور کا آرٹ زندگی کے جلال و جمال کی ثنویت کا شعور اپنے اندر اسی وقت پیدا کرتا ہے جب کہ اس کے زاویۂ نظر میں آفاقیت ہو، کائنات کے اندر اضداد کا وہ ابدی تصادم اور توازن جو فلسفے میں ہیگل (HEGEL) کا نظریۂ حیات ہے۔ زندگی کے عرفان کا ایسا شعور ہے جو ہر آفاقی آرٹ کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ آپ چاہے مرزا غالب کی آواز سے

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

سنیے یا یاس یگانہ کی اس آواز پر غور کیجیے سے

ہاں وسعتِ زنجیر تک آزاد بھی ہوں میں
ہستی مری مجموعۂ اضداد رہے گی

یا پھر اقبال کی زبان میں سے

آ میں تجھے سمجھاؤں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

کی ایمائیت اور رمزیت کو سوچیے تو آپ کو زندگی اپنی ثنویت کے ساتھ کسی نہ کسی روپ میں بھیس بدل کر ضرور نظر آئے گی، کہیں اس کا چہرہ بالکل بے نقاب ہوگا، کہیں چہرے پر رمز و کنایہ کا پردہ پڑا ہوگا۔ بہرحال زندگی کا یہی شعور آرٹ کی صداقت ہے اور یہی صداقت آرٹ کو آفاقی بناتی ہے۔

رئیس امروہوی کے آرٹ کا جائزہ لینے سے پہلے اس دوسری قسم کے آرٹ کا تذکرہ بھی ضروری ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا یعنی کچھ اس نوعیت کا آرٹ ہے کہ اگر آپ اس کے اپنے وجود اور اس کے خالق کے وجود کے درمیانی رشتے پر غور کریں تو آپ کو یہ دونوں چیزیں بقول "کسے" ایک دوسرے کی "والدہ" نظر آئیں گی ؎

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

بہر حال یہ آرٹ ایک ہی وقت میں اپنا معلول بھی ہوتا ہے اور اپنی علت بھی۔ "معلول" اس معنی میں کہ اس کا وجود ایک ایسے ضابطۂ تخلیق کا نتیجہ ہوتا ہے جس کو یہ اپنی تخلیق سے پہلے مرتب کر لیتا ہے۔ اور "علت" اس معنی میں کہ اس کا "صحیفۂ آسمانی" ایک ایسا طے شدہ دستور ہوتا ہے جس کی رو سے ہر وہ شخص آرٹ کا پیغمبر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ جس کی پشت پر اس کے منشور کی مہر ثبت ہو، عقل کی بلوغت، شعور کی بالیدگی اور درک و نظر کی وہ گہرائی جس کے بغیر کسی آفاقی آرٹ کی بالیدگی ممکن ہی نہیں۔ اس آرٹ کے لیے چنداں ضروری نہیں۔ اس آرٹ کی نیک نیتی کے باوجود ڈاکٹر اقبال کو اس کے شعور کی یک جہتی اور فکر کی عصبیت سے اس لیے اتفاق نہ تھا کہ ان کے نزدیک اس کی نظر کا مرکز صرف "شکم" ہوتا ہے ؎

بر مساوات شکم دارد اساس

آج سے تقریباً سو ڈیڑھ سو سال پہلے ناسخ لکھنوی نے عقل کے اوپر پیٹ کے تسلط کا جو فساد

فکر رہتی ہے رات دن تیری
جیتے جی تو نے مجھ کو مارا پیٹ

محسوس کر کے کہا تھا، وہ فساد انسان کی زندگی میں اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسان کی بھوک لیکن آرٹ کے شعور کا مرکز اگر صرف شکم نہیں تو اقبال کا یہ سوال ؎

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے من یا شکم

زندگی کی ثنویت کا ایک ایسا اہم سوال ہے جس کا جواب آرٹ کسی طے شدہ منشور سے نہیں دے سکتا بلکہ اپنے زاویۂ نظر کی آفاقیت اور زمانے کے ارتقائی مزاج کو سمجھ کر دے سکتا ہے آرٹ کے اس اجمالی جائزے کے ساتھ جہاں تک رئیس امروہوی کے آرٹ کا تعلق ہے ان کے

آرٹ کا مزاج اور کردار وہی ہے جو آفاقی آرٹ کے خصائص ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں نہ نعرہ بازی ہے، نہ خود اشتہاریت، نہ منشوری تبلیغ، نہ میکانکی اندازِ فکر، نہ جہلِ مرکب کا سفید چشم نشہ، نہ برخود غلط تکبر، نہ جماعتی تنفر، نہ جذباتی تعصب، نہ شکم زدگی، نہ نان زدگی، بلکہ ان کے آرٹ کا جو آئیڈیل ہے اس کی رو سے ان کے نزدیک کسی نوعیت کا منشوری آرٹ صحیح معنی میں "آرٹ" نہیں ہوتا۔ صرف "ابلاغی فن کاری" ہوا کرتی ہے۔ ان کے یہاں "آرٹ" "ابلاغی فن کاری" کا نام نہیں بلکہ آرٹ عبارت ہے اس "تخلیق" سے جس کو وہ "فن کار کا ابلاغ" کہتے ہیں۔ آرٹ کے اس تصور کے تحت تخلیق فن شیلر (SCHILLER) کی زبان میں فطرت کا وہ "دستِ راست" ہوتا ہے جس کی تخلیق کا عظیم منتہائے نظر ایک انسان کبیر کا تصور ہے۔ رئیس صاحب کے لفظوں میں ؎

نقشِ اوّل ایک تیرہ خاکدان
نقشِ آخر ایک انسانِ کبیر!

رئیس صاحب کے آرٹ میں تخلیق کے محرکات "انسان دوستی" "آزادی" "ارتقا" اور "واقعیت" کا ایک ایسا ہمہ گیر شعور ہے جس میں زندگی کا رقص بھی ہے اور خون کی ہولی بھی، واقعات کے اس زمانی اور مکانی شعور میں ان کے یہاں خود رفتگی میں خود آگاہی کا جو عالم پایا جاتا ہے اس سے ان کے طرزِ نظر کا پتہ چلتا ہے ؎

عالمِ بے خودی میں گہرا سانس
سینۂ کائنات میں ہے سفر

یا

ہم اس تلاطمِ پنہاں میں غرق رہتے ہیں
جہاں زمان و مکاں ساتھ ساتھ بہتے ہیں

آرٹ کے شعور میں اس نوعیت کی "خود آگاہی" "بے خودی" جب تک موجود نہ ہو آرٹ انفعالی زیادہ ہوتا ہے اور فعال کم۔ حافظ کی انفعالیت اور اس کی شدت سے اقبال کو یہی شکوہ تھا۔ غالب کے یہاں ہر اس رند پر پیمانہ حرام ہے جس کو بے خودی کے اندر اندازۂ گفتار

نہ ہو سے

پیمانۂ بر آن حرام است کہ غالب
در بے خودی اندازۂ گفتار نداند

رئیس امروہوی بڑے جگر دار آدمی ہیں، ان کے شعور پر محرکاتِ خارجی کا ردِ عمل وہاں بھی خالص انفعالی نہیں ہوتا جہاں زندگی کو ناسازگار حالات اور حوادثات کی صعوبتوں سے ٹکرانا پڑتا ہے سے

کوئی قدم نہ اُٹھے سوئے منزلِ مقصود
دعا یہ مانگ کہ ہر راہ پُر خطر ہو جائے

اور

قلم جو دستِ قلم کار میں نہ ہو محفوظ
تو حرفِ صدق بہ انگشت ہائے پا لکھیے

دراصل آرٹ کے اندر جہاں انفعالیت بھی ایک جذبۂ فعال بن جاتی ہے وہاں زندگی سے موت بھی اس کی خود اعتمادی کو نہیں چھین سکتی اور زندگی کا یہ شعور اسی آرٹ کا وہ حصہ ہے جس کو فطرت کے جلال و جمال دونوں کا بیک وقت عرفان ہو۔ یہی آرٹ کی عالی ظرفی ہے اور یہی اس کا وقار ہے

جہاں ہے رسمِ قتلِ انبیا کی
وہاں مبعوث فرمایا گیا ہوں

رئیس صاحب کا آرٹ بڑا پہلو دار ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا تصور چونکہ نامیاتی اور ارتقائی ہے اس لیے ان کے نزدیک انسان کی آزادی اور انسانیت کا ارتقا ایک ناقابلِ انکار تاریخی جبریت ہے۔ ان کا آرٹ جہاں حال کے ماتھے کی سلوٹوں کو نمایاں کرتا ہے، وہاں مستقبل کے قہقہے کی بشارت ہے سے

پڑھے کیوں کر کوئی اس دفترِ تہذیبِ انساں کو
ورق اکثر کتابوں کے لہو میں تر نکلتے ہیں

یہ ان کی ایک آواز ہے لیکن ؎

اٹھنے والا ہے نئی دنیا کے چہرے سے نقاب
وقت کو ہے ایک ضربِ آخری کا انتظار

ان کی دوسری آواز ہے، ان کے آرٹ کی یہ بے پناہ رجائیت ان کے فن کو بڑا جان دار بناتی ہے۔ ان کی متعدد منظومات مشاہدہ، کائنات تازہ۔ "سوال یہ ہے" قبل آفرینش اور "انسانِ کبیر" وغیرہ زندگی کے جس عظیم نصب العین کی حامل ہیں اس سے ان کے فن کی صحت اور توانائی دونوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ "پسِ غبار" کی نظموں کے علاوہ جہاں تک ان کے تغزل کا تعلق ہے ان کی غزل اپنی شائستگی، عالی ظرفی، خلوص اور دیانت کے اعتبار سے کچھ کم باوقار نہیں۔ ان کے یہاں حسن اور عشق کے واردات کی جو تحلیل نفسی پائی جاتی ہے اس کی صداقت غزل کی آبرو ہے ؎

اگرچہ محبت نے اب تک کسی کی نہ دنیا بنائی نہ دیں کو سنوارا
خدا کی قسم پھر بھی ترکِ محبت نہ ان کو گوارا نہ ہم کو گوارا

دل جہاں آنسو بہا کر بھی بہل سکتا نہیں
اس جگہ ہنس کر بسر کرنا ہمارا کام ہے

وہ آج شام کو وعدے پہ آئیں گے قاصد
مجھے قبول مگر آج شام ہو تو سہی

کتنے معانقے تھے کہ بے جذبۂ وصال
صرفِ فشارِ سینہ و آغوش ہو گئے

نہیں کھلتا کہ کون شخص ہوں میں
اور کس شخص کی طلب میں چلا

پہلے نگاہِ ناز نہ تھی آشنائے راز
اب سر بسر رموز و اشارات ہو گئی

ان کی غزل میں احساسِ جمال کے ساتھ عرفان و حکمت کا جو حکیمانہ شعور جھلکتا ہے

رئیس ۔ فن و شخصیت

وہ دورِ حاضر کے بے شمار غزل نگاروں میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ آرٹ خواہ موضوعی ہو چاہے معروضی اس کی سطح کبھی بلند نہیں ہو سکتی جب تک فکر و نظر کی گیرائی شاعر کو اس مقام پر نہ پہنچا دے ؎

پہلے تو ساتھ سا تھا ابد و ازل گئے
پھر ہم حدودِ کون و مکاں سے نکل گئے

جہاں تک مہر روز افروز پہنچا
وہیں تک صورتِ سایہ گیا ہوں

ہاتھ پھیلا کے کھینچتے ہیں درخت
ہر جہتِ حادثہ کا رُخ ہے کدھر

ابھی تک آفرینش کا لبادہ
بقدرِ قامتِ آدم نہیں ہے

نہ لہریں ہیں نہ گردابِ تلاطم
یہ دریا اپنی گہرائی میں ہے گم

کوئی بتلائے کہ کیا کیا ہے پسِ پردۂ رنگ
تکمۂ گل تو فقط بندِ قبا ہوتا ہے

رئیس امروہوی کے آرٹ میں تخلیق اور ابتکار کے ساتھ عرفانِ حیات کا جو گہرا شعور ملتا ہے اس کا عالم ان کی نظم اور غزل دونوں میں یکساں ہے۔ ان کے یہاں حکیمانہ اندازِ تفکر اور کلاسیکل رچاؤ کا جو رچاؤ ہے وہ ان کے فن کا ایسا امتیازی وصف ہے جس سے معاصرین میں ان کا مقام بلند ہے ؎

شہیدِ لفظ سکوت اختیار کر کہ یہاں
سخن کمال سخن کے سوا کچھ اور بھی ہے

تمہیں شکستہ دلوں کا خیال ہی تو نہیں
خیال ہو تو کرم کے ہزار ہا پہلو

شگفتگی کو ٹٹولا فسردگی پائی
مسرّتوں کو نچوڑا ٹپک پڑے آنسو
گرا ہے شاخِ گل سے ایک پتّہ
کسی نے کیا مجھے آواز دی ہے؟
بھوت بن کر مجھے ڈراتی ہیں
میری ناآفریدہ تخلیقات
ہر عہد کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ
اک شخص سے تلخ کام ہو کر
ہر شخص کو پیار کر رہا ہوں
ہم نے اے دوست! رفاقت سے بھلا کیا پایا؟
جو گئے بے آب تو، میں شجرِ بے سایا

○

ایلس فیض

مجھے معلوم ہے کہ فیض احمد فیض، رئیس امروہوی کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ میں نے ان کی زبان سے رئیس مرحوم کی بہت تعریفیں سنی ہیں اور ان کا خیال تھا کہ رئیس مرحوم عظیم شاعر تھے۔ میں یہ الفاظ فیض اور رئیس مرحوم دونوں کی یاد میں تحریر کر رہی ہوں۔

ڈاکٹر حنیف فوق

رئیس امروہوی کی یاد میں

انشاء اللہ خاں انشاء کو دو لطیفے روز سنانے کی خدمت تفویض ہوئی تو ذہنی توازن ہی منتشر ہوگیا۔ رئیس امروہوی کم و بیش چالیس سال روزانہ حالاتِ حاضرہ پر قطعہ لکھتے اور چھپواتے رہے، لیکن ان کی قادر الکلامی اور بذلہ سنجی میں فرق نہ آیا۔ منظر علی خاں کے علی بابا اور اردو ادب کے رئیس امروہوی اس لحاظ سے قابلِ ذکر شخصیت تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ مقدار کی زیادتی معیار پر اثر انداز ہوئی ہے اور صحافتی انداز شاعرانہ فکر کو کیمیائے سخن بننے میں حائل ہوا ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قادر الکلامی اور ظرافت ان کی شاعری کے دو چمکتے ہوئے جوہر ہیں۔ رئیس امروہوی نے قطعات کے علاوہ بہت کچھ لکھا ہے، غزلیات، قصیدے، مرثیے، رومانی اور قومی منظومات اور مثنویات۔ غرض یہ کہ ان کے قلم نے متعدد اصنافِ سخن کا احاطہ کیا ہے اور نثر میں ان کی خامہ فرسائی نفسیات و مابعد النفسیات سے لے کر عجائبِ نفس، مظاہرِ نفس، جنسیات، مراقبہ، جنات، ہپناٹزم، توجہات، مراقبۂ سانس، عالمِ برزخ، حاضراتِ ارواح اور طنزیہ مضامین کے متعدد موضوعات پر حاوی ہے۔ اخبار "جنگ" میں ان کی وفات کے بعد شائع ہونے والے کالم میں (۲۳ ستمبر ۱۹۸۸ء) فلسفی کا عجیب تجربہ کے عنوان سے رئیس امروہوی نے موت کی پُراسرار حقیقت کا جائزہ لیا ہے اور برطانیہ کے فلسفی سر الفریڈ آئر کی مرگ آسا بے ہوشی کے تجربے کا ذکر کرتے ہوئے اس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ اگر حیات بعد الموت کا

عقیدہ صحیح ہے تو اس کے خیال میں "موت ہماری زندگی، ہمارے شعوری تجربات کا ایک تسلسل ہوگی۔" رئیس امروہوی کے زیر قلم وسیع موضوعات کے تناظر سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض ذاتی یا تجارتی مجبوریوں یا مصلحتوں کے باوجود ان کا ذہن واقعات و مشاہدات کے تسلسل کو اپنی گرفت میں لانے کے لیے مصروف رہا ہے۔ روز مرّہ کے واقعات کے بیان کی بنا پر بڑی آسانی سے ان کی تحریروں کے متعلق استہزائی انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ "واہ کیا واقعہ نگاری ہے۔" لیکن یہ صحیح نہیں۔

رئیس امروہوی کی نظمیہ اور نثریہ تحریروں میں ان کی شاعری زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور اس میں غزل کی رومانی ریزہ خیالی اور جوش کی شوکتِ الفاظ کے عناصر بھی موجود ہیں، لیکن اس کا بڑا حصّہ واقعہ نگاری پر مشتمل ہے، البتہ یہ واقعہ نگاری ہر جگہ صحافتی سطح کی حامل نہیں۔ یوں تو ایک جگہ عالم بالا کا ذکر کرتے ہوئے احمد شاہ بخاری پطرس نے لکھا ہے کہ "جب اقبال نے تقدیر امم پر تقریر شروع کی تو افسوس مرزا غالب کے خراٹے لینے کی آواز آنے لگی۔" رئیس امروہوی کی واقعہ نگارانہ شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قاری کی دل چسپی کو اپنی جانب مرکوز رکھتی ہے اور خراٹے کی نوبت نہیں آتی۔ پھر اس میں مختلف ذہنی سطحوں کے ذوق کی تسکین کا سامان موجود ہے؛ لیکن شاعری کے اس سندباد نے اپنی وسیع سیاحت میں جو کچھ حاصل کیا اسے قادر الکلامی کی تابناکی اور ظرافت کی دل کشی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی قادر الکلامی کی توسیع غزل میں احساس کی صورتِ اظہار قصیدوں اور مثنویوں میں لفظی صناعی اور قطعات میں عناصرِ ظرافت سے ہوتی ہے۔

شان الحق حقی نے اپنی شاعرانہ فکر کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ ؎

بے نشان بہاریں شامل\
اک ہمارا بھی تار بیراہن

رئیس امروہوی نے واقعہ نگاری سے بالاتر خیال و حقیقت کی آمیزش کو اپنی شاعرانہ فکر کا جزو بناتے ہوئے لکھا کہ ؎

کانٹوں سے نگار انگلیاں ہیں
ملبوس بہار سی رہا ہوں

دونوں کے یہاں انسانی آرزوؤں کے مطابق ایک نئی دنیا کی تشکیل کا وہ تصور ملتا ہے جسے خاص طور پر ترقی پسند تحریک نے فروغ دیا تھا۔ لیکن جس کی سرمستیٔ احساس سے شاعرانہ فکر کبھی خالی نہیں رہی ہے البتہ رئیس امروہوی کا روزمرہ کے منظرنامے سے جو تعلق رہا تھا، اس کی وجہ سے ان کی شاعری میں بیانِ واقعہ کا انداز ابھرا ہے، لیکن اس انداز کو شوخی، بذلہ سنجی اور لفظوں کے کھیل کے عناصر ظرافت نے جلا دی ہے۔ عطیہ کی فیضی رحمین سے شادی کے سلسلے میں شبلی نے لکھا تھا ؎

بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مومن کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

رئیس امروہوی نے نہرو کے دورِ مجد کے وسیع تناظر میں ظرافت و طنز کی گہری ضرب لگائی ہے وہ کہتے ہیں ؎

جپ رہا ہے آج مالا ایک پنڈت کی عرب
برہمن زادے میں شانِ دلبری ایسی تو ہو
حکمتِ پنڈت جواہر لال نہرو کی قسم
مر مٹے اسلام جس پر کافری ایسی تو ہو

ان متاثرات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ رئیس امروہوی کی شاعری میں بیان کی قدرت کے ساتھ ساتھ جہاں فکر کی آمیزش ہو جاتی ہے، وہاں شاعری کے کرشماتی جلوؤں کا نظارا کیا جا سکتا ہے۔

اردو شاعری میں ظرافت کی روایت کا سراغ تو ابتدا ہی سے ملتا ہے لیکن قومی شعور اور اجتماعی زندگی کی عکاسی نے اسے نئی شکل دے دی۔ حالی جیسے ثقہ شاعر نے بھی ظرافت کے گل کھلائے اور طنز کے نشتر چلائے پھر اکبر سے لے کر ظفر علی خاں تک موضوعاتِ حاضرہ کی شاعری میں نیا رنگ آیا۔ ظریف لکھنوی سے ضمیر جعفری تک مزاح

ظرافت کے کئی اسالیب نظر آتے ہیں۔ ابتداء سے اب تک کا جائزہ لیں تو طنز و ظرافت کے پردے میں تمدن اور معاشرت کی بدلتی ہوئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ خسرو کی یہ خوش فکری کہ ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

ساقی فاروقی کی اس آوازِ خود احتسابی سے کتنی مختلف ہے کہ ؎

میں کیا بھلا تھا یہ دنیا اگر کمینی تھی
در کمینگی پر چوب دار میں بھی تھا

رئیس امروہوی نے بھی اس روایت کے تسلسل میں حصہ لیا ہے، لیکن ان کی آواز میں بیان اور خطاب کا انداز ہے جس میں اردو اور فارسی شاعری کے وسیع مطالعے کے اثرات نظر آتے ہیں اور جس نے شوکتِ الفاظ کے آہنگ سے کام لیا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو نوائے سروش نہیں تو صدائے خروش ضرور قرار دیتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس ملک کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حوادث نے ان کی شاعری میں غالب عنصر کی حیثیت سے جگہ پائی ہے۔ ان کے قطعات کے علاوہ مثنویات اور قصائد میں بھی یہ رنگ نمایاں ہے۔ لیکن ہر جگہ ان کی قدرتِ بیان جاذبِ نظر پیکر تراشتی ہے، اور لفظوں کے وفور کے ساتھ کہیں کہیں لفظوں کی کفایت سے بھی کام لیتی ہے مثلاً ؎

کراچی کی ریت اور کراچی کی رُت
بنا دے گی انساں کو مٹی کا بت

ان مثنویات میں قصائد میں اکثر ایسے واقعات کا ذکر ہے جو اب اپنی دلچسپی کھو چکے ہیں، لیکن ان کی نفسِ صناعی کی دلکشی برقرار رہتی ہے۔ قوافی کے استعمال میں بھی ان کی قدرت اور اختراعانہ صلاحیت نظر آتی ہے مثلاً ؎

وہ مے زاہدوں نے جو چکھی نہ ہو
پڑی جس میں توبہ کی مکھی نہ ہو

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے خوجی کی یہ آواز کہ "پلا ساقیا مالوے کی افیم" اردو شاعری میں اس نوع کی دل چسپ مثال ہے۔

یہ آواز رئیس امروہوی کے "بھنگ نامہ" میں صدائے بازگشت کے طور پر ملتی ہے، لیکن یہاں افراد نہیں حاکم و محکوم سب بھنگیائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رئیس امروہوی نے سیاسی موضوعات کو پیش کرتے ہوئے خاص طور پر سیاسی رہنماؤں کی منافقت و ریاکاری کو ہدفِ طنز بنایا ہے۔ قصائد میں رئیس امروہوی نے بالخصوص مشکل قوافی نکالے ہیں، اور اپنے طور پر نئے قوافی وضع بھی کیے ہیں مثلاً کھنت، ستت، اڑنت۔ "اردو" اور "کراچی" دونوں رئیس امروہوی کے خاص موضوع ہیں۔ شہر کراچی کے بارے میں رئیس امروہوی نے جو پہلے کہا تھا وہ آج بھی صادق آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

واقعی شہر کراچی میں ہے فی الحال اے دوست
بانیٔ کار ہر اک ردّ و بدل کی مکھی
ناظم آباد سے تا حد ملیر و لانڈھی
بھنبھناتی ہے فسادات و خلل کی مکھی

جی چاہتا ہے کہ وہ اپنی شاعری میں صرف بیانِ واقعہ کی حد تک نہ رہتے، اور اسباب و علل کا تجزیہ بھی کرتے، جو شاعرانہ ہوتے ہوئے بھی معاشرتی تضادات کو اپنی گرفت میں لے لیتا اور وسیع تر سماجی اتحاد کی بنیادیں فراہم کرتا۔ رئیس امروہوی اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ "ملا نہیں اور مسٹر نہیں" اپنے ایک قصیدے میں جس کا عجیب عنوان ۲/۱ ہے، وہ کہتے ہیں کہ ؎

گڑگڑاہٹ پہ تعجب ہے مجھے مسٹر کی
کیوں نہ گڑائے کہ مسٹر میں ہے گڑ ۲/۱

بخدا اس کی طوالت سے نہیں تو آگاہ
شیخ کی ریش کہ آتی ہے نظر ۲/۱

۱۹۵۶ء نفاذِ اردو کا سال ہے۔ رئیس امروہوی نے اردو کے بارے میں جو پہلے

کہا تھا وہ آج بھی قابلِ غور ہے کیوں کہ جہاں اردو پاکستان سے شیرینی بیان ہے وہاں پاکستان بھی اردو سے شیرینی کا رہے۔ رئیس امروہوی اپنی مثنوی "اردو نامہ" میں کہتے ہیں کہ ؂

اے بزرگانِ مجلس دستور
ملک میں تم ہو صاحبانِ شعور
کہیں ایسا نہ ہو کہ عجلت میں
جوشِ جذبات و فرطِ غفلت میں
قومی رفتار سست کر ڈالو
فیصلہ نادرست کر ڈالو!

رئیس امروہوی کی اردو زبان اور اردو ادب کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔

○

پروفیسر ممتاز حسین

رئیس صاحب مرحوم کی وفات سے اس قدر شدید صدمہ ہوا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں؟ میں نے رئیس صاحب کو ہمیشہ بہت محبت کرنے والا اور سچا انسان دوست پایا۔ اس قدر پیارے انسان کو کس نے قتل کر دیا؟ میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا کہ کیا کہوں؟ خدا رئیس صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

اپنی خاکستر جاں میں مدفون

اس شہر غدار میں جب بھی رئیس صاحب سے ملاقات ہوتی تو یہ مصرع یاد آجاتا۔

؎ عالم "آزادگاں" ہے اک جہاں سب سے الگ

جہاں قدم قدم پر مفادات کی جنگ ہوتی ہو، جہاں یوسف سے بھائی قدم قدم پر بیچے جاتے ہوں، جہاں اوپر اوپر پھول کھلے ہوں اور بھیتر بھیتر آگ، وہاں رئیس صاحب میں دنیا کی بہت سی "آلودگیوں" کے باوجود ایک ایسی معصومیت تھی، جسے حالات کی دھوپ بھی کملا نہ سکی۔ ان کے چہرے کے آنگن میں بڑھاپے کی جھریوں کی کیاریوں میں بچپن کے پھول کھلتے تھے۔ کوئی اچھی بات سنتے تو آنکھوں میں جیسے قمقمے روشن ہو جاتے اور پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد مراقبے میں چلے جاتے۔

رئیس صاحب ایک ثقافتی شخصیت تھے۔ یہ بات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ بہت کم ادیبوں کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ سماجیات (عمرانیات) میں مختلف زاویوں سے معاشرہ اور اس کے عوامل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ادب عمرانیاتی تجزیے اور مطالعے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستانی معاشرہ کی تشکیل، تعمیر اور تضادات کی نشاندہی جن ادیبوں کی تحریروں سے ہوتی ہے ان میں شاید ہی کوئی رئیس امروہوی سے زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔ رئیس مرحوم سے بڑے شاعر اور نثر نگار ہوں

اور قلم کاروں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن اس امتیاز میں ان سے بڑے شاعر اور قلم کار بھی ان کے حریف نہیں۔ رئیس کے قطعات میں ہماری قومی زندگی کے چالیس برسوں کے واقعات، مسائل اور حالات کے نقوش ہی موجود نہیں بلکہ ان پر شاعر کا تبصرہ بھی اس کی گہری بصیرت کی شہادت دیتا ہے اور اس کے حس مزاح اور ذمہ دارانہ طنز نگاری کی دستاویز بھی ہے۔

ہماری معاشرتی زندگی پر رئیس امروہوی کی تحریروں میں نواب اچھے مرزا کے خطوط بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ خطوط لکھنؤ کے اس مرزا نے قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں میں کراچی کی زندگی سے متعلق لکھے۔ کراچی کی زندگی اودھا اور دوآبہ کے رہنے والوں کے لیے ایک نیا تجربہ تھی۔ افقی انداز کی زندگی عمودی بن رہی تھی۔ بڑے بڑے آنگنوں کی جگہ فلیٹوں نے لے لی جو آسمان سے زیادہ قریب تھے مگر جن میں رہنے والے آسمان سے دور ہو گئے تھے۔ ادھر مدتوں سے مٹتے ہوئے تاریخی کراچی کی بدلتی ہوئی سڑکوں سے گزرتے ہوئے مجھے بارہا نواب اچھے مرزا کا خیال آیا۔ اب الفنسٹن اسٹریٹ اور وکٹوریہ روڈ کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ وکٹورین طرز کی خوب صورت عمارتوں کی جگہ بے رنگ "طویل القامت" پلازے اور عمارتیں لے چکی ہیں۔ وہ چائے خانے اب ذہنوں میں رہ گئے ہیں یا کاغذ پر جن میں ادیب، استاد، طالب علم، سیاست داں، مصور بیٹھا کرتے تھے اور ایک دوسرے سے افادہ کرتے ہوئے اپنے ذہن اور فکر کو بھی وسعت دیتے تھے۔ رئیس مرحوم نے اس کراچی کو کسی حد تک آنے والوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ انھوں نے کراچی کی جو قلمی تصویریں بنائی ہیں ان میں رنگا رنگی، وسعت اور جزئیات رسی نہیں۔ رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کو واضح طور پر اور سرشار کو نیم واضح طور پر یہ احساس تھا کہ وہ ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے مرقع کش ہیں اور رئیس امروہوی ایک ایسے دور اور تہذیبی مرکز کے مرقع ساز ہیں جس کی بساط ان کی نظروں کے سامنے بچھائی جا رہی تھی۔ پھر وہ ذور شخصی مسائل کا ذور تھا، لیکن برِ عظیم جنوبی ایشیا میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے اس مرکز سے وابستہ

لوگ اپنے ذاتی مسائل پر اجتماعی کاوش سے غالب آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رئیس امروہوی کی یہ تحریریں اسی اجتماعی کاوش کا ایک حصّہ ہیں۔

ان دنوں کراچی میں زندگی کے قرینے، یو۔ پی، بہار اور دکن کے اندازِ زیست سے مختلف تھے۔ لیکن ان علاقوں سے آنے والوں نے اس ماضی کی یاد میں محض آنسو نہیں بہائے جس کے آثار وہ سرحد کے اس پار چھوڑ آئے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو اس ماضی سے ہم رشتہ کرتے ہوئے اپنے خیال کو گوارا بنانے اور مستقبل کی تعمیر میں اسے صرف کرنے کی سعی کامیاب کی۔ بڑے بڑے مردان خانے، حویلیاں اور احاطے چھوڑ کر آنے والوں نے رحمن تکاؤ اور رنچھوڑ لائن کے درمیانی کھلے حصّوں اور چھتوں پر مشاعرے کی محفلیں سجائیں۔ متوسط سائز کا کمرہ ملا تو اس میں کتب خانہ بھی قائم ہوا اور ہفت روزہ ادبی جلسے کا ڈول بھی ڈالا گیا۔ ان مشاعروں میں ہم طالبعلموں نے سیّد آلِ رضا، حیدر دہلوی، نہال سیوہاروی، بہزاد لکھنوی، ذوالفقار علی بخاری، ارم لکھنوی (مرحوم)، رئیس امروہوی (مرحوم)، تابش دہلوی، نازش حیدری، راغب مراد آبادی، محشر بدایونی اور ایسے ہی کتنے شاعروں کو دیکھا اور ان سے شناسائی حاصل کی جو قربتوں کے سانچے میں ڈھلتی گئی۔ یوں پرانی نسل نے نئی نسل کی تہذیبی رہنمائی کی۔ پاکستان چوک کے ایک کمرے میں انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ قائم تھا اور وہاں ادبی جلسے ہونے لگے۔ جنریشن گیپ (خلائے نسلی) کا سوال یوں پیدا نہ ہوا کہ یہ نسلیں ایک ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں۔ رئیس امروہوی مرحوم نے کتنے ہی نوجوان شاعروں کی سرپرستی کی۔ ان کے شعروں کی اصلاح کی۔ "ایمرجنسی" میں شعر کہہ کر دیے اور یوں جن لوگوں نے کراچی کو محض ایک تجارتی مرکز نہ بننے دیا، اور ایک ثقافتی مزاج بھی دیا۔ ان میں رئیس امروہوی کی ذات بہت نمایاں ہے۔

رئیس امروہوی بہت زود نویس اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ہم جن لوگوں کی بدیہہ گوئی کے شاہد اور قتیل ہیں ان میں مولانا ظفر علی خاں کے بعد رئیس امروہوی سب سے ممتاز رہیں، ویسے ڈاکٹر عندلیب شادانی اور جناب راغب مراد آبادی بھی

ہمارے عہد میں بدیہہ گوئی کے اماموں میں سے تھے۔ رئیس امروہوی بدیہہ گو ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ ویسے یہ بات بھی میں نے کئی بار ان سے عرض کی کہ رئیس صاحب! اگر آپ کم قادر الکلام ہوتے تو زیادہ بہتر شاعر ہوتے اور وہ ہمیشہ اس بات پر مسکرا دیتے۔ بات یہ ہے کہ وہ آسانی اور قوت کے ساتھ اپنے خیال کو نظم کر دیتے اور یوں انھیں نئے اسالیب اور اظہار کی تلاش کے مرحلے میں کم داخل ہونا پڑتا۔ ویسے ان کی غزل گوئی میں "اظہار تراشی" ملتی ہے اور اسی لیے ان کی غزلوں پر آگے گفتگو کی جائے گی۔

رئیس صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ کسی صنف میں بند نہ تھے۔ قطعات، قصائد، مثنویات، رباعیات، نظموں میں کتنی ہی اصناف کو انھوں نے برتا ہے۔ ہمارے عزیز خامہ بگوش نے پچھلے دنوں شماریات کے علم اور فن میں اپنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے بدرجۂ یقین یہ بات تحریر کی کہ اوسطاً رئیس صاحب تے، ۲۴ اشعار یومیہ کہے۔ اب اس تعداد کو ۳۶۵ (کہ سال میں اتنے ہی دن ہوتے ہیں) سے ضرب دیجیے اور پھر جو نتیجہ حاصل ہوا سے ۴۴ سے ضرب دیجیے (کہ رئیس امروہوی مرحوم نے اتنے ہی برس زلفِ سخن کی مشاطگی کی ہے) یوں رئیس امروہوی کے اشعار کی تعداد کا اندازہ ہو سکے گا۔ اندازہ اس لیے عرض کیا گیا کہ ان کی شاعری کا ایک خاصا بڑا حصہ دوسروں کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کتنے ہی بزم آراؤں کی بزم آرائی ان کے دم سے تھی۔ کتنے ہی اختر ان سے مستعار لی گئی روشنی میں چمک رہے ہیں۔ شاید یہ امروہہ کی ایک ادبی روایت ہے۔ مصحفی امروہوی، رئیس امروہوی، نسیم امروہوی اور افسر امروہوی اپنے افکار اور اشعار دوسروں کو دیتے رہے کبھی ضرورت کے تحت اور کبھی بجا سہی عزیزاں بطرح دار۔ اپنے فن کو دوستوں اور عزیزوں پر قربان کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

اس ساری ادبی ہنگامہ آرائی اور محفل آفرینی کے بیچ رئیس صاحب نے اپنے لیے ایک خلوت خانہ بھی تعمیر کیا اور وہ ہے ان کا گنجِ غزل، الہامی مے ناب و سفینۂ غزل کی

رفاقت میں حافظ شیرازی کی سنت کا اتباع کرتے ہوئے رئیس نے بھی خلل سے پناہ لی۔ ان کی فراغت کا گوشۂ چمن ان کی غزل ہے۔

رئیس مرحوم کی غزل میں عشق کے معاملات خام بھی ہیں اور دلبروں کی بات بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی غزل میں فرد کا کائنات سے، مخلوق (انسان) کا خالق سے، اور اپنی دنیا سے مکالمہ بھی ہے۔ اُن کی غزل کا یہ فکری پہلو غزلیات کی لفظیات اور پیکر میں ڈھل گیا ہے۔ غزل گو فکر کو جذبے کا رنگ و آہنگ عطا کر دیتا ہے۔ رئیس کی غزل سلسلہ ہے سوال کا۔ وہ بڑے سوالوں سے اُلجھتے ہیں اور ان سوالوں یا ان کے جوابوں کو غزل کا شعر بنا دیتے ہیں۔ رئیس ان شاعروں میں سے ہیں جن کی غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل صرف ایک تہذیبی اقدار کی تخلیق یا بازیافت کا وسیلہ بھی ہے۔ پروفیسر کلیم الدین مرحوم غزل کے مزاج کو سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔ شاید ان کی ذہنی ساخت ایسی تھی کہ وہ اندرونی اور داخلی ربط، تہذیب اور تہذیب جذبات تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ رئیس مرحوم کو روحانیت اور سریت سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کی یہ روحانیت اور ماورائیت اور غزل کی روحانیت (تصوف اور اس کی اقدار) اور ماورائیت (پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود) سے مختلف اور نئی چیز تھی۔ اس میں حاضرات، موکل، مراقبہ، آسیب۔ سبھی عناصر شامل ہیں۔ رئیس اس سریت سے نبرد آزما رہتے ہیں۔

عجب اک سرِّ مبہم ہے مری ذات
نہ سمجھا ہوں نہ سمجھایا گیا ہوں

بھوت بن کر مجھے ڈراتی ہیں
میری نا آفریدہ تخلیقات
کون آیا مرے تعاقب میں
وہی فکر و خیال کے جنات
کس نے پیچھے سے قہقہہ مارا
یہ اندھیرے میں کون ہے مرے ساتھ

اس سمتیت سے قطع نظر رئیس کی غزل میں مقام آدم اور مرتبۂ انسانی اور کائنات میں اس کی حیثیت پر بڑے فکر انگیز شعر ملتے ہیں۔ میں نے خیال نہیں بلکہ شعر کہا ہے۔ رئیس امروہوی کی غزل ایک سنجیدہ چیز ہے۔ غزل ہمارے فکر، ہماری شاعری، اور ہماری ثقافت کی آخری حد ہے اور ہمارے عہد میں اس آخری حد کو اور آگے لے جانے اور بڑھانے والوں میں رئیس شامل ہیں۔ انھوں نے برّ عظیم کی روایات، فارسی کے لسانی اور اظہاری امکانات اور یونان و روم و مشرق وسطیٰ کے اساطیر و روایات سب کو اپنے شعر میں سمو کر غزل کی بارگاہ میں اپنے نذرانے کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ ایک متجسس، بے تاب اور بیدار ذہن اور محبت کرنے والا دل رکھتے تھے۔ ہر لمحہ تازہ سوال ان کی غزل میں ابھرتے ہیں اور حشر و نشر کا سماں پیدا کرتے ہیں۔ صنعت سوال و جواب کو رئیس امروہوی اور سراج الدین ظفر سے زیادہ کامیابی کے ساتھ ہمارے عہد کے کسی غزل گو نے نہیں برتا۔ گویا یہ صنعت محض شعری نہیں بلکہ ایک فکری حوالہ اور سانچہ ہے جو کچھ عرض کیا گیا اس کی تصدیق و توثیق کے طور پر رئیس کی غزلوں کے اشعار پیش کیے جارہے ہیں۔ اسے ایک باضابطہ انتخاب تو نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ سارے مجموعوں کا انتخاب اس وقت پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں یہ یقین ضرور ہے کہ یہ اشعار میری تنقید کا حصّہ بن کر میرے معروضات کی توثیق کریں گے۔

رئیس جب زندہ تھے تو بھی اسی خاکسترِ جاں میں مدفون تھے۔ جسے ان کی غزل کہتے ہیں۔

از غزلیاتِ رئیس

ملبوسِ بہار (الف، لبسِ غبار اور حکایتِ نَے)

عجب کیا ہے جو قدرت دنگ ہے آئینِ قدرت سے

کہ آئینہ بناتے ہیں تو حیراں ہم بھی ہوتے ہیں

اس غزل کو مقدرِ انسانی کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔

جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں
وہیں سولی پہ لٹکایا گیا ہوں
مرے نقشِ قدم نظروں سے اوجھل
مگر ہر موڑ پہ پایا گیا ہوں
نہ جانے کون سے سانچے میں ڈھالیں
ابھی تو صرف پگھلایا گیا ہوں

دمک رہی ہے زمان و مکاں کی پیشانی
ستارۂ ابدی ہوں خلا سے آیا ہوں

اے اپنی ہی خلوتوں میں محبوس
شاید تری انجمن ہیں ہم لوگ
ہر عہد کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم
ہم اپنی زندگی تو بسر کر چکے رئیس
اب کس کی زیست ہے جو بسر کر رہے ہیں ہم

ہم کسی سے ملے مگر تا دیر
کوئی موضوعِ گفتگو نہ ملا

تیرِ ستم کی زد پہ سہی یہ خوشی تو ہے
کیا کیا چھپے ہیں سینۂ اہلِ ستم میں ہم

کون و مکاں کے سناٹے میں ایک ہی لَو وہ گونج رہا ہے
تیرے بھیتر میرے اندر بول دما دم مست قلندر

زندگی میں کہ ہمہ معرکہ آرائی ہے
کس قدر نظم ہے، ترتیب ہے، رعنائی ہے

تم لوگ ہو آندھیوں کی زد میں
میں قحطِ ہوا سے مر رہا ہوں

انفاسِ سحر لاکھ سہی ترجمۂ شوق
کچھ اور بھی کہنا ہے مجھے ہیبتِ شب میں

میں ہوں خود اپنی ہی خاکسترِ جاں میں مدفون
دفن ہو جیسے خرابے میں کوئی سرمایہ

تمہیں شکستہ دلوں کا خیال ہی تو نہیں
خیال ہو تو کرم کے ہزار پہلو

یہ شام اور روشنی کی یہ قطاریں
اُداسی اور گہری ہو گئی ہے

رئیس ۔ فن و شخصیت

فروغِ حُسن سے ہو کر گزر رہا ہوں میں
ہر ایک لمحۂ دید ایک سالِ نوری ہے

کیا تذکرہ سپاہِ شہادت نصیب کا
غلطاں یہ خوں ہے پرچمِ میرِ سپاہ تک

زمانہ پی تو رہا ہے شرابِ دانش کو
خدا کرے کہ یہی زہر کارگر ہو جائے

مجھے ختمِ اسیری سے ملا کیا؟
فقط آزاد ہو کر رہ گیا ہوں

سروشِ غیب سے مکالمہ

میں نے کہا کہ مجھ کو بکھرنے کا خوف ہے
اس نے کہا کہ روح کے اجزا بہم کرو
میں نے کہا کہ کشتِ تمنا پڑی ہے خشک
اس نے کہا کہ گریۂ خونیں سے نم کرو
میں نے کہا کہ ضبطِ نگارش کا خوف ہے
اس نے کہا کہ صفحۂ جاں پہ رقم کرو

ہم فقیروں کے لیے یکساں ہیں دونوں حادثے
گردشِ رفتارِ دوراں، جنبشِ ابروئے دوست

یہ آوازیں کبھی مطرب بنیں گی
یہی مطرب کبھی آواز ہوں گے
کہاں ہم اختتام نغمہ کے بعد
اگر ہوں گے تو صرف آواز ہوں گے

○

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

رئیس امروہوی صرف بڑے شاعر ہی نہیں، بہت بڑے انسان بھی تھے، اور ہمارے استاد رشید صدیقی فرماتے تھے کہ جو بڑا انسان نہ ہو وہ بڑا شاعر کیا ہوگا: رئیس دوستوں کے ہی دوست نہیں، دشمنوں کے بھی دوست تھے، اس عہد کی ایک کثیر جہت شخصیت تھے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

رئیس صاحب سے میری پہلی ملاقات پاکستان کے بعد غالباً ۱۹۵۶ء میں کراچی میں ہوئی تھی اور پھر ملاقات ملاقاتوں میں بدل گئی، کیوں کہ وہ اس قدر باغ و بہار تھے کہ ان سے ملنے والا ان کا مداح ہو جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا کرے۔

محمد علی صدیقی

رئیس امروہوی — جامِ جہاں نما

رئیس امروہوی قلمروئے سخن کے ایک اہم فرماں روا تھے اور گزشتہ دو صدیوں کے عرصے پر محیط وہ دوسرے شاعر بن گئے جسے بجا طور پر شہیدِ سخن تسلیم کیا جائے گا۔ ایک قاتل کی گولی کا نشانہ بنتے وقت وہ جس کام میں مصروف تھے اس تاریخی تحریر کا عنوان "میری زندگی میرا فن" تھا۔ یہ خوں آشام تحریر ابو ظہبی کے "جشنِ رئیس" جسے جنوری ۱۹۸۹ء میں منعقد ہونا تھا، کے لیے لکھی جا رہی تھی لیکن افسوس کہ ان کی زندگی کے ساتھ تحریر بھی نامکمل رہی۔

لیکن اس تحریر پر بکھرے ہوئے خون کے چھینٹے گواہ رہیں گے کہ رئیس امروہوی مرتے وقت تک "شاعری کی دیوی" کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر رہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس تحریر نے اُن کے میثاقِ محبت پر موت کو گواہ بنا لیا ہے۔ رئیس امروہوی کی موت کسی کلاسیکی یونانی ڈرامے کا آخری سین معلوم ہوتی ہے۔ اس سین میں ڈرامے کا ہیرو علم و ادب کے ساتھ اپنی بے پایاں محبت کا اظہار کرتے ہوئے جان دے دیتا ہے۔ اس مقابلۂ نور و ظلمت میں ہر چند کہ میدان، ظاہری طور پر ظلمت کے ہاتھ رہا، لیکن ہوا یہ ہے کہ رئیس امروہوی ایک ایسے شہیدِ سخن کے روپ میں ابھرے ہیں جس نے زندگی کی توقیر و تعظیم میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ رئیس امروہوی کا قتل اس گراں خواب قوم کے لیے بیداری کی نوید لے کر آیا ہے رئیس نے آج سے کافی عرصہ قبل ایک شہید کی قربانی کی بابت مندرجہ ذیل ردِ عمل دیا تھا۔

دفن جس خاک میں کل اس کو کیا تھا ہم نے
آج اس خاک سے ہے زندگیٔ نو کی نمود
روح میں ابدیت کا ہے شرارہ کوئی
ورنہ یہ سوزِ حیاتِ ابدی ہے بے سود
ہیں زمانے میں وجود اور عدم کے معیار
یہ نہیں ہے تو نہ معدوم نہ کوئی موجود . . . .

رئیس امروہوی انسانی روح میں ابدیت کے جس شرارے کی کارفرمائی دیکھنا چاہتے تھے، وہ ان کے یہاں شرارے کی بجائے شعلۂ جوالہ کی مانند تھی۔ ان کا جسم ایک آتش خانۂ وجود تھا، جو ہمہ وقت تخلیق کی آگ سے منور رہتا تھا۔ میں نے اس تخلیقی آگ کے اردگرد ملک کے زعما و اکابر کی اتنی بڑی تعداد کو مصروفِ طواف و اکتساب دیکھا ہے کہ کبھی کبھار یہ خیال گزرتا تھا کہ آخر رئیس امروہوی انسان ہیں یا جن؟ خوش اخلاقی بہت اچھی خو ہے۔ شریف اور مہذب لوگوں کا لازمی وصف ہوتی ہے لیکن آخر خوش اخلاق آدمی کو زندہ رہنے کے لیے کبھی کبھی اپنے خول میں بند ہو جانے کی خواہش بھی دامن گیر ہوتی ہے۔ رئیس صاحب کے لیے دوسروں سے مغایرت یا پہلوتہی ممکن نہ تھی۔ وہ بسا اوقات یہ چاہا کرتے تھے کہ کاش ان کے پاس پرائیویٹ لمحات کے لیے طویل فرصتیں ہوا کریں لیکن ایسا بوجوہ نہ ہو سکا اور وہ اور ان کے گھر کے دروازے سب کے لیے کھلے رہے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کی شام واقعہ بھی ان کے گھر کے دروازے کھلے تھے ـــــ قاتل کے لیے بھی اور دوستوں کے لیے بھی ـــــ وہ فارمولا قسم کے شاعر و ادیب نہ تھے۔ آخر یونانی کلاسیکی ڈرامہ کے روح فرسا اختتامی سین نے انھیں آلیا۔ وہ اس وقت جہاد بالقلم مصروف تھے۔ عالم کے قلم کی سیاہی اور شہید کے خون کی سرخی میں اگر کوئی فرق تھا تو وہ بھی معدوم ہو کر رہ گیا۔ رئیس امروہوی ایک کھلی کتاب تھے۔ ان کے یہاں دکھی اور مغموم لوگوں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ ان کے کالم اس دنیا کی محض ایک جھلک ہیں جو ان پر ہر جانب سے پڑتا رہتا تھا اور وہ مسکرا مسکرا کر اپنے ملاقاتیوں سے ملتے رہتے۔ شاید انھیں یہ

معلوم تھا کہ ہر دوست اور ملاقاتی دوست نہیں ہوا کرتا لیکن وہ بھی کیا کر سکتے تھے۔ جو شخص بھی ایک بار ان کے قریب آجاتا وہ ان کے حلقہ بگوش ہو جایا کرتا اور ان کے حلقہ بگوشوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ میں نے ان کے یہاں اجمل خٹک اور امیر حمزہ شنواری کو ہمہ عقیدت سپاس دیکھا ہے۔ بلوچستان، پنجاب اور سندھ کے ادیبوں اور رہنماؤں کو اس طرح بغل گیر ہوتے اور چہچہاتے دیکھا ہے کہ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہو سکا کہ وہ کسی کے لیے بھی غیر یا اجنبی ہو سکتے ہیں۔ رئیس امروہوی کے گھرانے سے میرے گھرانے کا دوستانہ تعلق صدیوں پر محیط ہے اور انھوں نے مجھے بار ہا اختلافِ رائے کے باوجود اس درجہ محبت و شفقت دی کہ آج یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ان کی موت کے ساتھ ان کے چاہنے والے بھی اس قدر زندہ رہنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے جس طرح ان کے ہوتے ہوئے محسوس ہوا کرتا تھا۔

رئیس صاحب ۴۳ سال کی عمر میں کراچی آئے اور یہاں ۴۱ سال تک زندہ رہے۔ ان برسوں میں وہ کراچی کی پہچان بن گئے تھے۔ روزنامہ جنگ کے قطعہ نگار کی حیثیت سے وہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ وہ سیاسی قطعہ نگاری کے باوا آدم تھے اور ایک بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں کوئی شاعر بھی اس میدان میں ان کا حریف نہیں ہے۔ اب تک رئیس امروہوی کے قطعات کی چھ جلدیں سامنے آ چکی ہیں۔ پہلی دو جلدیں "قطعات" کے نام سے اخبار جہاں پبلی کیشنز کراچی نے شائع کی تھیں جن میں ۵ جون ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۵۵ء تک کے منتخب قطعات شامل ہیں۔ اس کے بعد ۸۶-۱۹۸۷ء میں ان کے قطعات کا چار جلدوں پر مشتمل ایک اور انتخاب جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۶ء تک پر مشتمل ہے، شائع ہوا اور اس طرح یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کے قطعات ــــــ ۱۹۸۶ء تک ــــــ کتابوں کی صورت میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ "قطعات" کی چھے جلدیں ۲۶۲۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ۱۹۸۶ء سے تا اختتامِ زندگی کہے گئے قطعات بھی جلد یا بدیر سامنے آجائیں گے۔ ان قطعات میں پاکستان اور دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے اہم معاملات پر فی الفور ردِ عمل ملتا ہے اور شاید ہی کوئی سیاسی، سماجی،

معاشی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی یا سائنسی مسئلہ ہو جس پر رئیس امروہوی نے قدم نہ اٹھایا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ رئیس نے ان قطعات کے باب میں خود ہی کہہ دیا ہے۔

جو ناسخِ آثارِ کہن ہے وہ کتاب
بے خطرۂ تنسیخ لکھی ہے میں نے
آئینۂ امروز ہیں میرے قطعات
اس عہد کی تاریخ لکھی ہے میں نے

اور پھر اس پر طرہ یہ کہ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ ان کے قطعات سے بسا اوقات جبینِ خسروی پر شکنیں پڑ جاتی تھیں، لیکن وہ برملا کہتے تھے۔

گر مزاجِ خسروی پر بار ہے میرا کلام
میں مزاجِ خسروی کی تا بہ کہ پروا کروں
کلمۂ حق آ ہی جاتا ہے زبانِ صدق پر
طبعِ شاہانہ مکدر ہے تو ہوا میں کیا کروں

ظاہر ہے کہ رئیس امروہوی کے قطعات منظوم سیاسی جرنلزم کی صف میں آتے ہیں لیکن ان قطعات میں اکثر و بیشتر ایسے قطعات سے مٹ بھیڑ ہوتی ہے جو کم سے کم اچھے یا بہت اچھے ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ رئیس امروہوی کے یہاں واجبی نوعیت کے قطعات کی تعداد دیگر تمام قطعہ نگاروں کے جملہ اچھے قطعات کی تعداد کے برابر ہی ہوگی۔ رئیس امروہوی کے یہاں مشکل یہ ہے کہ وہ اپنی رائے کی صورت گری کے لیے بہترین سے کم پر سمجھوتہ کرتے نظر ہی نہیں آتے۔

زندگی نامہ

رئیس امروہوی ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کو شمالی ہند کے مردم خیز قصبہ امروہہ میں پیدا ہوئے وہ اپنے شہر کے نقوی السادات خاندان کے رکن رکین تھے۔ اس خاندان کے جدِ امجد سید شرف الدین شاہ ولایت سہروردی سلسلے سے بیعت تھے اور وہ ملتان کے روحانی مرکز

کی طرف سے شمالی ہند میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے معمور کیے گئے تھے۔ رئیس امروہوی کو زندگی بھر تصوف سے دل لگاؤ رہا اور ان کی حکیمانہ شاعری میں متصوفانہ خیالات کا وفور اسی سبب سے ہے۔ ان کے والد علامہ سید شفیق حسن ایلیا اپنے وقت کے جید عالم تھے اور یہ خاندان غدر ——— جنگ آزادی ——— میں انگریز حکمرانوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ انھوں نے روایتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علوم مشرقی کی اعلیٰ ترین اسناد حاصل کیں۔ انگریزی زبان سے ان کا معاملہ تاخیر سے شروع ہوا، لیکن وہ حیرت انگیز طور پر انگریزی کتب سے براہ راست استفادے کی قدرت حاصل کر چکے تھے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ماہنامہ "مسافر" مراد آباد کی ادارت سے کیا۔ اس کے بعد وہ ۱۹۴۱ء میں مسلم لیگی روزنامہ "جدت" مراد آباد کے مدیر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ دہلی منتقل ہو گئے اور روزنامہ "انصاری" سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے کچھ عرصہ ماہنامہ "مشہور" میں بھی کام کیا اور پھر وہ تقسیم برصغیر سے کچھ عرصہ قبل روزنامہ جنگ کے شعبۂ ادارت میں شامل ہو گئے۔ "جنگ" دہلی میں قطعہ نگاری کا جون ۱۹۴۷ء سے آغاز کیا جو ان کی وفات حسرت آیات تک جاری رہا۔ ان کے چھوٹے بھائی سید محمد تقی جنگ دہلی کے مدیر تھے اور کراچی میں بھی دونوں بھائی ایک کاغذ کے دو صفحات کی طرح ایک ساتھ ہی رہے۔ جنگ کراچی نے اپنے اداریہ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۸۶ء میں اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ جنگ اور رئیس امروہوی ایک دوسرے کی پہچان بلکہ لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ جہاں جہاں "جنگ" پڑھا جاتا تھا وہاں رئیس امروہوی قارئین کے لیے ایک عادت ثانیہ بن چکے تھے۔ ان کے قطعات کیا تھے "جام جہاں نما" تھے اور انھوں نے ایک قطعہ میں اس حقیقت کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

برہمی کس لیے اگر تم کو
کوئی صورت نئی دکھاتا ہوں
میں ہوں "جام جہاں نما" جو کچھ
دیکھتا ہوں وہی دکھاتا ہوں

رئیس صاحب کے چند قطعات ملاحظہ فرمائیے (پہلے مارشل لا کے نفاذ تک) اور آپ یہ دیکھیے اور داد دیجیے کہ ان کے یہاں بدلتے ہوئے حالات کی کس طور ترجمانی ہوئی ہے۔ اختلاف رائے کا حق محفوظ، لیکن رئیس صاحب نے زبان و بیان کی کیا کیا لطافتیں برتی ہیں۔ ان قطعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو پر نگاہ رکھتے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن پلان

اگر انگریز ہی بخشندۂ اورنگ وافسر تھا
اگر انگریز ہی بخشندۂ اورنگ وافسر ہے
تو پھر ماؤنٹ بیٹن پلان اپنا مقدّر تھا
تو پھر ماؤنٹ بیٹن پلان اپنا مقدّر ہے

(تاریخ اشاعت ۶ر جون ۱۹۴۷ء)

کفر ٹوٹا

رفتہ رفتہ پٹیل اور نہرو
خفیہ خفیہ معاہدہ کر کے
لائے تقسیم ہند پر ایمان
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

(۱۵ر جون ۱۹۴۷ء)

اِدھر اُدھر

ہوئے ہیں منقسم پنجاب و بنگال
عجب شیخ و برہمن کا ہے عالم

اُدھر بھارت کے بٹوارے کا ہے دکھ
اِدھر تقسیمِ پاکستان کا غم
(۷ر جولائی ۱۹۴۷ء)

تیرھویں اگست

اسی دن کے لیے صدیاں گزاریں
عجب روزِ سعید و سعد آیا
ہزاروں ماہ و سال اس پر نچھاور
یہ دن دو سو برس کے بعد آیا
(۱۳ر اگست ۱۹۴۷ء)

چودھویں اگست

دیارِ ہند، تیری عظمت و شوکت مسلّم ہے
جبینِ تاریخ کی، تیرے شرف کے سامنے خم ہے
وہ اک دن ہی سہی تاریخ کی آزاد قوموں میں
وجودِ آزادِ پاکستان کا تجھ سے مقدّم ہے
(۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء)

جشنِ قتلِ عام

حرّیت کا جشنِ لاثانی بھی ہے
اہتمامِ ذبحِ انسانی بھی ہے
ہر کوچک میں یہ جشنِ قتلِ عام
عید روزہ، عیدِ قربانی بھی ہے
(۱۹ر اگست ۱۹۴۷ء)

رمیدہ

(۱۹ اکتوبر کو دلّی سے کراچی پہنچنے پر)

کیوں نہ اپنے سے خود رمیدہ ہوں
کہ غزالِ شکار دیدہ ہوں
ہر صرِ حادثات کی زد پر
اک برگِ خزاں رسیدہ ہوں

(۱۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

جلاوطن

رئیس راندۂ درگاہ و انجمن ہو کر
شکستہ پا و زبوں حال و خستہ تن ہو کر
الٰہی! صدمۂ ہجرت ہمیں گوارا ہو
وطن میں آئے ہیں اپنے جلاوطن ہو کر

(۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

گاندھی

جس نے امیدِ زیست تھی باندھی
لے اڑی اس کو موت کی آندھی
گالیاں کھا کے، گولیاں کھا کے
چل بسے اُف مہاتما گاندھی

(۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء)

مہاجر، اونٹ

کس نے کہا رئیس کراچی میں آج کل
کچھ بھی نہیں ہے، زہرِ مصیبت کے گھونٹ ہیں
کس چیز کی کمی ہے ہمارے دیار میں؟
مفلس ہیں، اہلِ زر ہیں، مہاجر ہیں، اونٹ ہیں

(۱۶ر فروری ۱۹۴۸ء)

جنّت مل گئی

جلوۂ صبحِ بنارس، نزہتِ شامِ اودھ
شُکر کہ ہر دولت کراچی کی بدولت مل گئی
ہر نظر سُو حسن و جلوہ، ہر قدم سُو رنگ و بو
ہم نے پاکستان مانگا تھا سو جنّت مل گئی

(۲ر فروری ۱۹۴۸ء)

زبانِ یارِ من

ہمیں اسلامیانِ سندھ سے سچّی محبت ہے
کہ پاکستان میں اب تک انہیں کے میہماں ہیں ہم
مگر افسوس اظہارِ محبّت سخت مشکل ہے
زبانِ یارِ من سندھی و من سندھی نمی دانم

(۱۷ر مارچ ۱۹۴۸ء)

مہاجر

مہاجر لشتگانِ قلبِ صد پارہ کو کہتے ہیں
مہاجر فاتحینِ نفسِ امّارہ کو کہتے ہیں

مگر اس لفظ کے کچھ اور معنی ہیں کراچی میں
غریب و خانماں برباد و آوارہ کو کہتے ہیں

(۱۹ راپریل ۱۹۴۸ء)

حلقوم

مجھ سے دُنیا کو توقع ہے غزل خوانی کی
وہ روش، اے دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں؟
جھنجھناتے ہوئے اشعار تو کہہ سکتا ہوں
کھنکھناتا ہوا حلقوم کہاں سے لاؤں

(۲۴ راپریل ۱۹۴۸ء)

چار چیزیں

چار چیزیں ہیں جو چھپ سکتی ہیں پاکستان میں
لاکھ ان کی جستجو میں ٹھوکریں کھائے نگاہ
رہنماؤں کی حماقت۔ پارساؤں کا فریب
با اثر لوگوں کی رشوت اہلِ دولت کے گناہ

(۱۲ رمئی ۱۹۴۸ء)

کفر ساز

یہ کہتا تھا، اک واعظ کفر ساز
کہ تکفیر کو آزمانا پڑا
کراچی سے کافر جو سب چل دیے
مسلماں کو کافر بنانا پڑا

(۳ رجولائی ۱۹۴۸ء)

جیتے ہیں

جو زندہ قوم کے افراد ہیں بحسبِ یقیں
خود اپنے بازوئے جہد و عمل پہ جیتے ہیں
ہمارے پاس نہ بازو نہ دست قلعہ کشا
ہم اپنے قائداعظمؒ کے بل پہ جیتے ہیں

(۱۲/ ستمبر ۱۹۴۸ء)

اِنّا الیہ راجعون

چھن گئے ہم سے ہمارے قائدِ اعظمؒ رئیس
کر دیا دستِ اجل نے کتنی امیدوں کا خون
قوم کی رجعت پسندی کا سبب ثابت نہ ہو
قائدِ اعظمؒ کی موت انّا الیہ راجعون

(۱۳/ ستمبر ۱۹۴۸ء)

روتے آئے تھے

حدودِ ہند سے اس ارضِ پاک میں ہم لوگ
جفائے غیر سے محفوظ ہوتے آئے تھے
دیارِ قائدِ اعظمؒ میں آکے علم ہوا
کہ اپنے قائدِ اعظمؒ کو روتے آئے تھے

(۱۵/ ستمبر ۱۹۴۸ء)

تبادلہ

جب کہ مابین ہند و پاکستان
پاگلوں کا تبادلہ ہوگا

سوچتا ہوں کہ ایسے عالم میں
ہم ادیبوں کا حشر کیا ہوگا؟

(۱۹ر نومبر ۱۹۴۸ء)

گولی ماردو

ایک صاحب کو جو گولی ماریں مسکن ملا
رو کے فرمایا کہ جیتے جی نہ یہ آزار دو
میں کراچی چھوڑ کر دوزخ میں رہ سکتا نہیں
مجھ کو مت لے جاؤ "گولی مار" گولی ماردو

(۲۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء)

نام و نشان

کسی درویش نے یہ لکھوایا
اپنا نام و نشاں خدا کی قسم
پیشہ؟ ہجرت! دیار؟ پاکستان
باپ کا نام؟ قائداعظمؒ

(۲۴ر جنوری ۱۹۴۹ء)

لیاری

کراچی کی دُنیا میں ہیں اے رئیس
تضادات وہ جن کا ثانی نہیں
کلب میں اُبلتا ہے طوفاں مے
لیاری میں اک بوند پانی نہیں

(۳ر مارچ ۱۹۴۹ء)

پاک ریڈیو

ہم پاک ریڈیو سے نہیں غیر مطمئن
کانوں میں نثر و نظم کا رس گھولتا تو ہے
اے قوم! اس کی نغمہ سرائی کی قدر کر
مانا کہ بے سرا ہے مگر بولتا تو ہے

(۱۷/ اپریل ۱۹۴۹ء)

آ، مری جان

ابتدا ہی سے نہیں ذوقِ قیادت ورنہ
جی مچل جائے تو چل سکتے ہیں چالیس ہم بھی
مشغلہ کوئی تو یاروں کا ہو بے کاری میں
آ مری جاں! نئی لیگ بنا لیں ہم بھی

(۱۳/ نومبر ۱۹۵۰ء)

گور و کفن

اجرتیں گورکنوں نے جو گھٹا دیں اپنی
ان کو اللہ کرے باغِ عدن مفت ملے
تلخ ہے زیست گرانباری قسمت کے سبب
مفت مر جائیں اگر گور و کفن مفت ملے

(۴/ جون ۱۹۵۱ء)

مردم شماری

شہر کی مردم شماری پر چھڑی کچھ گفتگو
اک سخنور نے یہ فرمایا۔ جو اہلِ حال ہیں
شہر میں ہے یہ تناسب شاعر و قوال کا
سو میں نو نکلے ہیں اگر شاعر تو دس قوال ہیں

(۱۴ر جنوری ۱۹۵۱ء)

لکھنؤ

نواحِ سندھ و کراچی کہ آج ہے ویران
یہیں بہشت کی رنگینیاں سجا دیں گے
اودھ کا ذکر نہ کر لکھنؤ کا نام نہ لے
اسی دیار کو ہم لکھنؤ بنا دیں گے

(۱۷ر جنوری ۱۹۵۱ء)

کراچیٔ اعظم

اللہ اللہ کراچیٔ اعظم
مرکزِ خوب و زشت ہے یہ شہر
کہہ رہے تھے یہ قاضی القضاۃ
مجرموں کی بہشت ہے یہ شہر

(یکم مئی ۱۹۵۱ء)

پنڈی کی خاک

پنڈی کی خاک خونِ وفا سے ہے لالہ رنگ
پیشِ نظر ہے منظرِ میدانِ کربلا
ممکن نہ تھا کہ روک سکیں اس شہید کو
جنت میں منتظر تھے شہیدانِ کربلا

(۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۱ء)

یہ کہانی

کیسا جمہور کیا عوام اے دوست
مختصر اپنی یہ کہانی ہے
چند افراد کی قیادت ہیں
چند کنبوں کی حکمرانی ہے

(۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء)

مسدسِ حالی

ذکر حالی کے مسدس کا چھڑا اک بزم میں
ایک صاحب جن کو فلمی گیت سارے یاد تھے
ہائے کس انداز سے ارشاد فرمانے لگے
کیا مسدس حالی مرحوم کے استاد تھے

(۲۳ر جنوری ۱۹۵۲ء)

آل پاکستان

مرتبہ بر رہ نما کا آل پاکستان ہے
اور پاکستان کی اولادِ حال ستان ہم
لیڈروں میں اور ہم لوگوں میں اتنا فرق ہے
"آل پاکستان وہ ہیں" آلِ پاکستان ہم

(۲۱ رجون ۱۹۵۲ء)

پانچ صدیاں

اپنی آزادیوں کے پانچ برس
سخت تھے؛ مگر نڈھال نہ تھے
آج محسوس ہو رہا ہے ہمیں
پانچ صدیاں تھیں، پانچ سال نہ تھے

(۱۳ راگست ۱۹۵۲ء)

کرکٹ ٹیم

کرکٹ ٹیم نے لاج اہلِ وطن رکھ لی۔
اور ہم کارِ سیاست میں اناڑی نکلے
بھارتی ٹیم کو رن میں جو ہرا کر آئے
لیڈروں سے کہیں بہتر وہ کھلاڑی نکلے

(۲۸ راکتوبر ۱۹۵۲ء)

عناصرِ اربعہ

چار عناصر ہیں زندگانی کے
آتش و آب و خاک و موجِ باد
اور اپنے عناصرِ اربعہ
فرقہ بندی و ظلم و جہل و فساد

(۱۳ مارچ ۱۹۵۳ء)

ہم اور تم

تم جہاں تھے قبلِ پاکستان اب بھی ہو وہیں
ہو گئے اس خطۂ محبوب پر قربان ہم
پاک باشندے سبھی دونوں مگر یہ فرق ہے
جسمِ پاکستان تم ہو جانِ پاکستان ہم

(۲۲ جولائی ۱۹۵۲ء)

اجتماعی سبق

ہم تو بنگال کے الکشن کو
اجتماعی سبق سمجھتے ہیں
بعض کہتے ہیں اس کو "قہرِ خدا"
بعض اسے "فضلِ حق" سمجھتے ہیں

(۲۴ مارچ ۱۹۵۴ء)

لاٹھی پستول

قسمتِ قوم اُن کے ہاتھوں میں
فعل جن کا بجا نہ ثابت قول

آہ اندھے کے دوش پر لاٹھی
واہ، پاگل کے ہاتھ میں پستول

(۳۱/ دسمبر ۱۹۵۴ء)

تاریخ مرگِ مسلم لیگ

مرگِ مسلم لیگ ہے وہ حادثہ
جس سے قوم و وطن میں ہے اضطراب
لیگیوں کو فکر تھی تاریخ کی
مغفرت بولی کہ لکھ "غفراں مآب"
۱۳۷۴ھ

(۲۲/ دسمبر ۱۹۵۴ء)

لیگ۔ لاش

اے لیگ اے لیگ اے لیگ اے لیگ
اے لاش اے لاش اے لاش اے لاش
تیرا بھی کوئی غم خوار ہوتا
اے کاش اے کاش اے کاش اے کاش

(۲۴/ دسمبر ۱۹۵۴ء)

جامِ جہاں نما

برہمی کس لیے اگر تم کو
کوئی صورت نئی دکھاتا ہوں
میں ہوں "جامِ جہاں نما" جو کچھ
دیکھتا ہوں وہی دکھاتا ہوں

(۷/ اپریل ۱۹۵۵ء)

جشنِ اوّل

جمہوریت کا یہ جشنِ اوّل
دلدار و دلکش دلچسپ و دل خواہ
اللہ اکبر اللہ اکبر
الحمد للہ الحمد للہ

(۲۳ / مارچ ۱۹۵۶ء)

جمہوری نہ تھا

دور تھے تقریبِ قومی سے عوام
گو کہ ان کو شکوۂ دوری نہ تھا
جشنِ جمہوری کا عالم کیا کہیں
جشن تھا ہر چند جمہوری نہ تھا

(۲۷ / مارچ ۱۹۵۶ء)

اہلیہ

بیانِ حقیقت میں ہم نے رئیس
یہ نکتہ بڑے کام کا کہہ لیا
کہ اس ملک میں اہلیت کی بجائے
ترقی کا معیار ہے اہلیہ

(۲۱ / نومبر ۱۹۵۶ء)

مارشل لا

دیارِ پاک میں ہے کارفرما
بعد اقبال، پاکستان کی فوج
گرفتِ پنجۂ افواج کا سال
نہیں جز "پنجۂ فوج ظفر موج"
(۱۳۷۸ھ)

(۱۴؍ اکتوبر ۱۹۵۸ء)

ریت کے گھروندے

اپنے شعلے سے جل کے خاک ہوئے
برق بن کر جو کبھی کوندے تھے
اجتماعی قیادتوں کے محل
کچھ نہ تھے ریت کے گھروندے تھے
(۴؍ مارچ ۱۹۵۹ء)

سالِ انتقال

منتقل ہونے لگا دارِ حکومت ملک کا
فکرِ سالِ انتقال اب تو ضروری ہو گئی
حسرتِ دارِ حکومت کیوں نہ ہو تاریخِ سال
حسرتِ دارِ حکومت تھی جو پوری ہو گئی
(۲۴؍ جون ۱۹۵۹ء)

بدل

ہند میں مری املاک گرانقدر ایسی
جن کے دعویٰ کا نہ موقع ہے نہ کوئی آج محل
کوئی سرکار مجھے اس کا بدل کیا دے گی
قلعۂ شاہ جہاں مقبرۂ تاج محل

(۱۹۵۹ء)

بدستور

اصل شے ضبطِ مملکت ہے رئیس
ضابطے کا تو نام چلتا ہے
بحثِ دستور سے نتیجہ کیا
حسبِ دستور کام چلتا ہے

(۲۹/مارچ ۱۹۵۹ء)

اشتراکی

چاند میں ہلکی ہلکی سُرخی ہے
روسی راکٹ کا شعبدہ تو نہیں
بعض اہلِ نظر کو ڈر ہے کہ چاند
اشتراکی نہ ہو گیا ہو کہیں

(۹/ستمبر ۱۹۵۹ء)

جشن

جو زندہ قوم کی روحِ حیات ہوتا ہے
وہ اضطراب کہیں بھی نظر نہیں آتا

عجب کہ ملک میں ہر سو ہے انقلاب کا جشن
خود انقلاب کہیں بھی نظر نہیں آتا
(۳۰/اکتوبر ۱۹۶۰ء)

گوارا

اگرچہ بھارتی طرزِ عمل سے
نہیں ہے کوئی بھی رشتہ ہمارا
مگر یہ پرتگال سامراجی
گوا والو! نہیں ہم کو گوارا
(۲۰/دسمبر ۱۹۶۱ء)

بونے

اور گمراہ کر دیا ہم کو
قوم کے قائدین کچھ رو نے
دور بینوں کے پیشوا! اندھے
دیو نادوں کے رہ نما! بونے
(۱۵/ستمبر ۱۹۶۲ء)

سمٹ رہی ہے

قومی معاشرہ ہے نا منصفی پہ قائم
بے حصہ مادّی تقدیر بٹ رہی ہے
اے اقتصادیات قومی کے سربراہو
افلاس کیوں نہ پھیلے دولت سمٹ رہی ہے
(۱۰/دسمبر ۱۹۶۳ء)

نہرو کی موت

بس اک نقش تھا آریہ دیس میں
جو بھارت کا قومی نشان بن گیا
جو سمٹا تو نہرو کی موت بنا
جو پھیلا تو ہندوستاں بن گیا

(۲۸ / مئی ۱۹۶۴ء)

ٹیلی وژن

اے ملتِ دیدہ ور مبارک
یہ ٹیلی وژن کا دورِ مسعود
البتہ یہ خوف بعض کو ہے
ٹیلی ہے بہت وژن محدود

(۴ / نومبر ۱۹۶۷ء)

واپس کرو

صحافی کی تحریر و تنقید پر
کہاں تک یہ پابندیاں، بس کرو
تمہارا کرم ہم نے واپس کیا
ہمارا قلم ہم کو واپس کرو

(۲۱ / فروری ۱۹۶۹ء)

اعلان

اُس نے آخر یہ کر دیا اعلان
گو مخالف مرے زمانہ ہے

برسرِ اقتدار آؤں گا
برسرِ اقتدار آنا ہے

(۱۶/جنوری ۱۹۷۰ء)

دو فی صدی

صنعت میں روزگار میں جہدِ معاش میں
کوٹہ ہو فسرحق جین تو کیا حق ملے ہمیں
نامستحق ہیں اہلِ کراچی، یہ طے ہوا
دو فی صدی حقوق بھی ناحق ملے ہمیں

(۱۸/اگست ۱۹۷۱ء)

سیاہی

مُلک کے مصائب سے یہ تو ہو گیا ظاہر
کوئی دھو نہیں سکتا بخت کی سیاہی کو
سندھ کے حوادث سے یہ تو ہو گیا روشن
چند لوگ کافی ہیں مُلک کی تباہی کو

(۱۰/اگست ۱۹۷۲ء)

سو فی صدی

ہم لوگ اس سرزمین سے ہر چند آگے نہیں
کچھ اس زمین پہ حق ہے یا رشدی ہمارا
دو فی صدی سے بھی کم حصّہ حقوق میں ہے
قربانیوں میں کوٹہ سو فی صدی ہمارا

(۱۰/اکتوبر ۱۹۷۱ء)

سبزۂ بیگانہ

ہم سے ہے محفلِ مے و مے خانہ کا وقار
ہم خارج از طریقتِ مے خانہ ہی سہی
ہم سے ہے اب بھی فصلِ بہاراں کا اعتبار
ہم اس چمن میں سبزۂ بیگانہ ہی سہی

(۲۸ راگست ۱۹۷۲ء)

چار عنصر

ثقافت الگ ہے سیاست الگ
اگرچہ یہ دونوں ہیں ہم قافیہ
ثقافت کے ہیں چار عنصر رئیس
زبان دین تاریخ جغرافیہ

(۱۹۷۷ء)

معاشرہ بدر

جو لوگ کہ صاحبِ نظر ہیں
جو لوگ کہ صاحبِ ہنر ہیں
جو لوگ کہ صاحبِ خبر ہیں
وہ لوگ معاشرہ بدر ہیں

(سنہ ۱۹۸۰ء)

شہرِ خموشاں

مرحوم ہو چکی ہیں سیاسی جماعتیں
پیارے! یہ واردات خوشی کی نہ غم کی ہے

کل ہم نے اک شہرِ خموشاں کی سیر کی
ہر قبر پر لکھا تھا کہ یہ کالعدم کی ہے

(۲۲/ مارچ ۱۹۸۲ء)

حُمقار

چالیس سال عہدِ سیاست کے واقعات
بے خطرۂ سزا و جزا لکھ رہے ہیں ہم
لیکن ہر ایک حرف پہ احساس ہے کہ صرف
اعمال نامۂ حُمقار لکھ رہے ہیں ہم

(۱۱/ فروری ۱۹۸۶ء)

قومیتیں

نوعِ انسانی تری تفریق سے
کیسی کیسی علّتیں پیدا ہوئیں
مُلک سے ملّت بنی ملّت سے قوم
قوم سے قومیتیں پیدا ہوئیں

(۱۳/ جولائی ۱۹۸۶ء)

دامِ ملامت

مارشل لا کے ضوابط سے جو پابند رہے
وہ کبھی دامِ ملامت سے نہ چھوٹے ہوں گے
جتنے آئین مرے مُلک میں ٹوٹے ہیں رئیس
اتنے آئینے کسی گھر میں نہ ٹوٹے ہوں گے

(۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

چشمِ خوں

وہ شہر جس میں کبھی تھا عروجِ فکر و نظر
وہاں رواجِ جنوں کے سوا کچھ اور نہیں
مرے چمن میں تمھیں ہے تلاشِ غنچہ و گل
یہاں تو چشمۂ خوں کے سوا کچھ اور نہیں

(۲۰ دسمبر ۱۹۸۶ء)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ہر ایک عنوان کے پیچھے ایک پوری داستان ہے، سیاسی بحث و تمحیص کے پس منظر میں ایک ردِ عمل ہے۔ رئیس امروہوی کے قطعات کی مدد سے پاکستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

رئیس امروہوی نے "جنگ" کے لیے مسلسل قطعہ نگاری اور کالم نویسی کی لیکن اس کے ساتھ ان کی تصنیفات کی تعداد چالیس سے متجاوز ہے۔ اس تعداد میں نفسیات اور مابعد الطبیعات سے متعلق کتب کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان کی بیشتر کتابیں قطعات اور کالم نویسی کے متعلقات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے قطعات کی تعداد بیس ہزار سے متجاوز ہے۔ ان کا کالم ایک نوع کی "کچہری" تھی۔ ان کے پاس لاتعداد خطوط آیا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک لاکھ سے زائد خطوط کے جوابات لکھے اور اس طرح وہ بلحاظ تعداد خطوط اردو زبان کے ایک بہت ہی اہم خط نویس تھے۔ رئیس امروہوی کے خطوط اور دیگر مخطوطہ کا سب سے بڑا ذخیرہ سیّد انیس شاہ جیلانی (مبارک لائبریری، محمد آباد، رحیم یار خاں) کے پاس محفوظ ہے۔ میں رئیس امروہوی کے خطوط کے بارے میں اپنی رائے پیش کرنے سے قاصر ہوں لیکن ظاہر ہے کہ ان خطوط کی غالب اکثریت جواب طلب نجی مسائل کے بارے میں مشوروں اور ہدایتوں پر مشتمل ہوگی، خواہ ان خطوط کی ادبی حیثیت زیادہ وقیع نہ ہو لیکن شاید اردو کا کوئی شاعر عوامی مسائل میں اس قدر منہمک رہا ہو۔

شاعری

رئیس امروہوی کا اختصاص خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو لیکن وہ اوّل و آخر شاعر تھے اور وہ بھی ایک غزل گو شاعر۔ رئیس امروہوی کا پہلا مجموعہ کلام الف (غزلیں) ساٹھ کی دہائی میں طبع ہوا اور یہ شائع ہونے ہی اردو غزل کا شاہکار ثابت ہوا۔ اس کے بعد "پس غبار" شائع ہوا اور پھر حکایت نے، خبوسِ بہار، بہ حضرت یزداں، آثار (۱۹۸۵)، بحر السحر (۱۹۸۵) اور ضمیر خامہ (۱۹۸۸) علی الترتیب شائع ہوئے۔ "ضمیر خامہ" رئیس امروہوی کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری مجموعہ ہے۔ کلیاتِ رئیس امروہوی زیر طباعت ہے

"ضمیر خامہ" مثنویات اور قصائد پر مشتمل ہے۔ رئیس امروہوی اپنی شاعری میں مثنویات اور قصائد کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ "میری فکر کا طاقتور ترین دھارا مثنویات اور قصائد میں موجزن ہے۔ شاید شاعری کے اس عظیم الشان سرمایے کو پیشِ نظر رکھتے ہی مشہور محقق مشفق خواجہ نے رئیس امروہوی کو اردو زبان کا سب سے منفرد شاعر تسلیم کیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق رئیس امروہوی نے اپنی شاعری میں اردو زبان کے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ وہ اختصاص ہے جو رئیس امروہوی کو قلی قطب شاہ، نظیر اکبر آبادی، واجد علی شاہ اختر اور میر انیس سے بھی زیادہ ثمر آور PROLOLIFIC بنا دیتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے رئیس امروہوی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ رئیس کی غزل روایتی مزاج کی حامل نہیں ہے۔ یہ بڑی حد تک جدید حسیت کی شاعری ہے۔ رئیس کے یہاں غالب کی سوال انگیزی اور اقبال کے جذبہ دروں کا ایک پُراثر فکری مرکب کارفرما نظر آتا ہے۔ اگر رئیس نے اردو غزل پر زیادہ توجہ دی ہوتی تو وہ ممکن ہے کہ زبان کے اہم شاعر کی بجائے اردو غزل کے بہت نمایاں شاعر کے طور پر سامنے آتے لیکن ان کی غزلوں کا سرمایہ بھی اس قدر وسیع ہے کہ جب کوئی نقاد ان کی غزل پر قلم اٹھائے گا تو زیادہ بہتر طور پر انصاف کر سکے گا۔ میں نے رئیس امروہوی کی غزل کا جس قدر بھی مطالعہ کیا ہے، مجھے وہ ایک بلند پایہ، تعقل پسند

غزل گو کی حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ رئیس امروہوی نے جس خوبصورتی سے غزل کی روایت کا احترام کیا وہ اس وجہ سے بھی قابلِ رشک ہے کہ روایت شکن خیالات اور روایت کا تال میل ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہے۔

رئیس امروہوی کی غزل گوئی کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن اس مضمون کا اقتضا یہ ہے کہ رئیس امروہوی کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک مختصر لیکن تجزیاتی خاکہ پیش کیا جائے۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے روزنامہ جنگ کراچی کی اشاعت ۲۱ر اپریل ۱۹۶۳ء میں العظمتہ اللہ کے عنوان کے تحت رئیس امروہوی کی شاعری کے بارے میں لکھا تھا کہ "ان کی شاعری شعر و حکمت کا ایک ایسا نقطۂ اتصال ہے جس پر ہماری زبان اور ہماری شاعری ناز کرتی رہے گی۔ اس کے دوش بدوش حالاتِ حاضرہ اور مسائلِ سیاسی میں بھی وہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے قطعات ہر روز شائع ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہنگامی، خشک اور جھلسے ہوئے مسائل میں بھی بسا اوقات وہ ایسی چمک دمک پیدا کر دیتے ہیں کہ آنکھوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر مجھ بندۂ ناچیز یعنی جوش ملیح آبادی کے شانے پر اس پابندی کا کوہِ گراں رکھ دیا جائے تو اخبار کے لیے ہر روز بلا ناغہ ایک قطعہ نہ سہی، چار پانچ نثر کے فقرے ہی لکھ دیا کرے تو مجھ کو یقین ہے کہ یا تو میں "العظمتہ اللہ" کا نعرہ لگا کر کپڑے پھاڑ ڈالوں اور شہر چھوڑ کر جنگلوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوں یا پھر گلیوں گلیوں مخلوقِ خدا کو ڈھیلے مارتا پھرنے لگوں۔۔۔۔۔۔

اسی ایک بات پر نگاہ کر کے اس امر کا کان پکڑ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ رئیس کو الفاظ، طرزِ بیان اور خیالات پر اس بلا کی قدرت اور فرماں روایانہ قدرت حاصل ہے کہ آج کا کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ہی رئیس وہ تنہا شاعر ہے جس نے ڈنکے کی چوٹ ثابت کر دیا ہے کہ زود گوئی اور معیاری شاعری میں تضاد و عناد نہیں۔۔۔۔ اگر میرا تمام کلام لے کر رئیس اپنا یہ شعر مجھے دے دیں تو میں اپنے کو تاروں زماں سمجھنے لگوں سے

شاید اسے عشق بھی نہ سمجھے
جس کرب میں عقل مبتلا ہے

مندرجہ بالا اقتباس ذرا طویل ہو گیا ہے لیکن جوش جیسے شاعر کی جانب سے آج سے ۴۳ سال قبل واشگاف الفاظ حیرت انگیز نہیں ہیں۔ میں نے بارہا جوش کو رئیس امروہوی کی شان میں رطب اللسان دیکھا ہے اور میرا خیال ہے کہ جوش نے رئیس کی شاعرانہ حیثیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔

حضرت نیاز فتحپوری نے رئیس امروہوی کی شاعری پر نگار پاکستان میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"رئیس کی شاعری کی بابت صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جانا کہ وہ عمومیت و سطحیت سے بلند ہے بڑی پست بات ہے ۔ ان کے یہاں تو بات چلتی ہی ہے فراز سے اور ختم ہوتی ہے مدارج علو کے تعین پر، جسے تصوّف کی زبان میں "اوّل یا آخر ہر انتہی" کہتے ہیں۔ یوں تو شاعری نام ہے حسن خیال، حُسن فکر و تصور اور شعور ادب و ادراک کا لیکن اگر ذریعہ ابلاغ و اظہار حسین نہ ہو تو محض فکر و تصور بیکار ہے۔ رئیس کی شاعری میں یہ دونوں باتیں بڑے توازن کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ وہ جتنا اچھا سوچتے ہیں اتنا ہی اچھا اسے ظاہر بھی کر سکتے ہیں"

فیض احمد فیض نے رئیس امروہوی کو "قاموسی شاعر" قرار دیا تھا۔ فیض احمد فیض عبداللہ کالج کی پرنسپلی کے زمانے میں رئیس امروہوی صاحب کے یہاں آیا کرتے تھے۔ جوش، ذہین شاہ تاجی، جی الانا، پروفیسر کرار حسین، پروفیسر جوّاد مسقطی، حکیم محمد علی طیبی، راجہ صاحب محمود آباد، اور متعدد اکابر وقتاً فوقتاً رونق محفل ہوا کرتے تھے۔ رئیس صاحب کے گھر ایک ایسی GALAXY نظر آیا کرتی تھی کہ بلاشک و شبہ یہ گھر کراچی کی علمی و ادبی زندگی کا مرکز معلوم ہوتا تھا۔ اب ان حضرات میں بیشتر اس دنیا میں نہیں رہے اور ان کی جگہ نئے اکابر نے چہرہ گری شروع کر دی تھی۔

رئیس امروہوی اپنی محفل میں کبھی بھی میر محفل نظر نہ آئے ۔ وہ ان محفلوں کو اس قدر

غیر رسمی بنا چھوڑتے تھے کہ کبھی کبھی بے اختیار ہنسنے کو دل چاہتا تھا۔ رئیس امروہوی ان نشستوں میں وہ وہ لطائف سناتے کہ محفل زعفران زار ہو جایا کرتی تھی۔ اب وہ محفلیں سونی ہو گئی ہیں۔

رئیس امروہوی نے خود کو "جام جہاں نما" کہا تھا اس پر طرّہ یہ کہ وہ ساری عمر زہر تو زندگی دیکھنے اور دکھانے کی لذت سے لطف اندوز ہوتے رہے اور یہ نہ سوچا کہ وہ ایک دن سب کو گریہ ناک کر دیں گے۔ رئیس امروہوی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ "میرا فرض تو لکھنا ہے، صرف لکھنا، کبھی روشنائی سے، کبھی قطرۂ اشک سے، کبھی خونِ جگر سے" ؎

لکھ لکھ کے اشک و خوں کی حکایاتِ زندگی

آرائشِ کتابِ بشر کر رہے ہیں

کس قدر سچے تھے وہ اپنے اظہار میں۔ رئیس نے "خونِ جگر" محض ادبی اظہار کے طور پر نہیں کہا تھا۔ وہ اپنی بات کے سچے اور کھرے تھے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کے کلام پر "تب و تابِ جاودانہ" کی مثال صادق آتی ہے۔ رئیس کی موت سے ملک کی ادبی و فکری زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ واقعتاً ایک مہیب خلا ہے جس کا پر ہونا مشکل ہے۔ بہت ہی مشکل۔

O

حکیم محمد سعید

میرے دوست "رئیس امروہوی" کیا نہیں تھے، ہر میدان کے رئیس! ہر شعبۂ علم کی ریاست ان کا مقدر رہی اور تا حیات رہی! علم و حکمت ان کا عنوانِ زندگی، شعر و ادب ان کا دن رات، سچی بات یہ ہے کہ رئیس ایسے انسان تھے جس پر ساری انسانیت فدا۔

اکرام بریلوی

رئیس امروہوی کے قطعات

ابتدائے آفرینش سے شاعر و ادیب، انسانوں کی بہادری، فطرت سے اس کی کش مکش، مصیبت کے ماروں کی کہانیاں، روح کے داخلی کرب، عشق و محبت کی داستانوں، رشک و حسد، غصہ و نفرت، رنج و ملال اور مادّی آسودگی کے خوابوں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنا کر پیش کرتے رہے ہیں۔ ان تمام موضوعات کے اظہار کے پردے میں ان کا ایک ہی مقصد رہا ہے اور وہ یہ کہ انسان ان تمام ناقابل برداشت آلام و مصائب پر فتح حاصل کر کے اپنی زندگی کو مسرت و کامرانی سے ہمکنار دیکھ سکے۔ اس کا مطلب ہوا کہ وہ ادب جو زندگی کی معنی آفرینی پہ اصرار کرتا ہے وہی زندگی کا عکس بنتا اور اسے آئینہ دکھاتا ہے۔ یہی ادب کا وہ نامیاتی کردار ہے جو زندگی کی شادابی میں لمحہ بہ لمحہ مصروف کار نظر آتا ہے اور ترقی کی راہیں کھولتا ہے۔ اسی طرح ادب نہ صرف ہمارے معاشرے بلکہ اس کی معمولی سی معمولی تبدیلی اور انسانی سوچ کی نشان دہی کرتا ہے۔ معاشرے کی یہ تبدیلی اور انسانی سوچ کی نئی سمت اپنے محیط میں سیاسی اور سماجی بھی ہو سکتی ہے اور ثقافتی اور اخلاقی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ یا ردّ و قبول کی مظہر بھی، اور ایسے نئے رجحانات و محرکات کی آئینہ دار بھی جو ایک خاص عہد اور اس کے اندر سانس لینے والے انسانوں کی امیدوں، امنگوں اور معاشرے کی تشکیل نو کی غیر شعوری طور پر ذمے دار بن جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ادب پر یہ ذمّے داری بھی عائد ہوجاتی ہے کہ وہ فنی معیار و اعتبار کے لحاظ سے خوب صورت بھی ہو اور حقائق کے اظہار میں زندگی کی دیانت داری اور خلوص کے ساتھ ترجمانی بھی کرے۔

یہ تو ادب کی ایک عمومی (BROAD BASED) تعریف ہوئی۔ لیکن زیادہ توجہ دی جائے تو ادب کے دو روپ ہیں۔ ایک وہ جو کسی مخصوص لمحے کی تخلیق ہو اور کسی واقعے سے متاثر ہو کر فوری طور پر لکھا جائے، جیسے "رودکی" کی مشہور زمانہ غزل "بوئے جوئے مولیاں آید ہمی"، یا زوالِ بغداد پر شیخ سعدی کا مرثیہ یا پھر امیر خسرو کی مثنویاں اور شاہ ابو اسحاق کے قتل پر حافظ شیرازی کی غزل "جنگ بلقان" اور طرابلس پر شبلی اور اقبال کی نظمیں بلکہ "جواب شکوہ" اور "طلوعِ اسلام" کے اکثر و بیشتر اشعار کہ جن میں انسانی عظمت و وقار کی جدوجہد میں بہت سے ہنگامی موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ادب کا دوسرا روپ وہ ہے جو کسی اہم اور دور رس تاریخی لمحے کی تخلیق ہو اور اس لمحے کے ساتھ بھلا دیا گیا ہو (اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر کی تخلیقات کا بہت سا حصّہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ بھلا دیا جاتا ہے) اور اس بھلائے ہوئے ادب کو محقق تلاش کر کے سامنے لاتے ہیں کیوں کہ اس انداز و نہج کا ادب تخلیق کرتے ہوئے، اس شاعر یا ادیب نے انسانی ضمیر کے تحفظ کی خاطر جنوں کی حکایت خونچکاں رقم کرتے ہوئے اپنے ہاتھ قلم کرا دیے مگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی کہ "قلم گوید کہ من شاہِ جہانم" چنانچہ ادب کا وہ حصّہ جو ہنگامی ضرورت کے تحت لکھا گیا، وہ تاریخ کا حصّہ ہے اور وہ ادب جو زندہ ہے اور زندہ رہے گا تاریخ ادب کا عظیم کارنامہ۔

اس تمہید کی روشنی میں رئیس امروہوی کے قطعات ہنگامی اور وقتی ہوتے اور کیوں کہ اپنے عہد کی زندگی سے ہم رشتہ و وابستہ ہیں اس لیے تاریخ کا حصّہ بھی ہیں اور ادب کا عظیم کارنامہ نہیں تو کارنامہ ضرور ہیں۔ رئیس امروہوی کے قطعات قومی زندگی کے حقیقت پسندانہ مطالعے پر زور دیتے ہیں۔ حقیقت پسندی کی ایسی

صحت مند اور مثبت روایت جس سے سماجی تبدیلی کا جذبہ، قوم پرستی، عوام دوستی اور جمہوری جدوجہد کی لازوال کرنیں پھوٹتی ہیں اور جبر و استحصال سے پاک معاشرے کے ذمرت امکانات روشن ہوتے دکھائی دینے لگتے ہیں بلکہ حقیقت پسندی کی یہ روایت ایک دیرپا "ذہنی ہتھیار" کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ مگر چونکہ ترقی پذیر ممالک کے مسائل اور مشکلات کے حل کے درمیان ان ممالک کی سیاسی اشرافیہ کا نوآبادیاتی ذہن حائل ہے جو عوامی امنگوں کے درمیان رخنہ اندازی میں مصروف ہے اور در پردہ ایسے کام کر رہا ہے جس سے تیسری دنیا کے وسائل پر نوآبادیاتی دور کی لوٹ کھسوٹ کا سماجی اور معاشی نظام قائم رہے اور حقیقی آزادی اور آزاد معیشت کے قیام میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ اس نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ اور رکاوٹ کی بنا پر رئیس امروہوی کی قطعہ نگاری کا کام بڑا دشوار اور صبر آزما ہو جاتا ہے مگر وہ ہمت نہیں ہارتے کیوں کہ ان کا ادبی مشن بہت وسیع اور عمیق ہے۔ وہ سماج کو انسانی آزادی، عدل اور مساوات کی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ان کے قطعات میں مردہ ضمیر اور یاسیت کے بجائے معنویت اور رجائیت ہے کیوں کہ ان عناصر کے بغیر نئے سماج، حقیقی آزادی اور آزاد معیشت کی تعمیر و ترقی، انسانی حقوق اور شرف آدم کی بحالی ناممکن ہے، اب ملاحظہ کریں۔

جو ناسخِ آثارِ کہن ہے وہ کتاب\
بے خطرۂ تنسیخ لکھی ہے میں نے\
آئینۂ امروز ہیں مرے قطعات\
اس عہد کی تاریخ لکھی ہے میں نے

یہ اور اس کے ساتھ رئیس امروہوی نے اپنے قطعات میں قاری کی خوشی کے ساتھ علم کی فراہمی کو بھی ہمیشہ اور ہر مرحلے پر ملحوظ خاطر رکھا اور یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جو شاعر افادیت کو لطافت کے ساتھ ہم آمیز کرکے ہی حاصل کرسکتا

ہے۔ رئیس امروہوی اس مرحلۂ صائب سے کامیابی سے گزرے ہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ ان کے قطعات کی شاعری ہر شخص کی پسندیدہ گردہ گئی ہے

یہ ذکر تھا کہ فخرِ کراچی ہیں کون لوگ
اک راہ نمائے قوم پکارا کیا کہ ہم
اک شوخ نازنیں بھی گزرتی تھی راہ سے
برقعے الٹ کے اس نے اشارا کیا کہ ہم

ہماری قوم کے شعلہ نوا افراد کیا کہنا
عجب پُر لطف باتیں طبع کی تیزی میں کرتے ہیں
اصولاً سوچتے ہوں گے وہ اردو وارننگ میں
مگر جب بات کرتے ہیں تو انگریزی میں کرتے ہیں

میں لُٹ گیا ٹرام میں اے صاحبانِ دل
خود میرا مال میرے مقابل اُڑا لیا
بٹوے پہ ہاتھ صاف کیا اک بزرگ نے
اک صاحبہ کو کچھ نہ ملا دل اڑا لیا

جس دور میں رئیس امروہوی سانس لے رہے تھے وہ صارفیت ——————
(CONSUMERISM) کا دور تھا۔ رئیس نے صارفیت کی اس خرابی کو بخوبی سمجھ لیا
تھا کہ صارفیت انسان اور انسانی معاشرے کو بڑی تیزی اور شدت کے ساتھ کرپٹ
(CORRUPT) کر رہی ہے اور انسان اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کا غلام بنتا
جا رہا ہے اور یہ انسانی رویہ اسے اندر ہی اندر کھوکھلا بنا کر تمام اعلیٰ کیفیتوں سے
محروم کر رہا ہے۔ رئیس امروہوی کا یہ احساس ان کے قطعات میں طرح طرح سے اظہار

پاتا ہے اور مایوسی اور بے عملی کو دور کر کے سوچنے، آگے بڑھنے اور ترقی کرنے پر اکساتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یارو! صلۂ سوختہ جانی مانگو
بہتے ہوئے چشموں کی روانی مانگو
روزی جو مقدر میں ہے مل جائے گی
فی الحال تو اللہ سے پانی مانگو

جو انقلاب کی لذت سے آشنا نہ ہوئی
وہ قوم جہد و ترقی میں کامیاب نہیں
مزہ تو یہ ہے کہ لوگوں کے دل بدل جائیں
وزارتوں کا بدلنا تو انقلاب نہیں

رئیس امروہوی کا یہ دعویٰ کہ "اس عہد کی تاریخ لکھی ہے میں نے" شاعرانہ تعلی ہے کیوں کہ تاریخ میں ایک مربوط اور منظم ترتیب کے ساتھ تسلسل کا ہونا لازمی اور لابدی حقیقت ہے، ان کے قطعات کو اگر پاکستان کے تاریخی ارتقا کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کا یہ دعویٰ کہ "آئینۂ امروز ہیں مرے قطعات" بجا طور پر درست اور مناسب نظر آتا ہے کیوں کہ ان کے قطعات وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے مختلف النوع معاملات و مسائل کا دفتر ہیں جس کا عمومی "اسلوب بیان طنزیہ، انداز نظر تنقیدی اور پیرایۂ اظہار کسی قدر ظریفانہ ہے۔" اس طرح ان کے قطعات بڑے حقیقت افروز ہیں اور ان میں ادب، زندگی اور تاریخ کے مابین ایک قوس سی کھنچتی دکھائی دیتی ہے دیکھیے ؎

میں یہ کہتا تھا انصاف ممکن نہیں
نیچے سے حرص دولت نہ جب تک ہٹے

اس طرح وہ مری بات پر بھپٹ پڑے
جیسے گولر پھٹے یا بگوڑر پھٹے

طمانچہ کارگر اس وقت ہوگا
کہ بالکل بند ہو انسان کی مٹھی
سیاست میں قدآور لوگ آئیں
رئیس انسب ہے چھٹ بھیوں کی چھٹی

نازو نعمت سے مدتوں ہم نے
بے بی جمہوریت کو پالا ہے
اب یہ محسوس ہو رہا ہے رئیس
شیر کے مونہہ میں ہاتھ ڈالا ہے

رموز ارض۔ رسولِ فلک جناب سے سیکھے
حدیثِ پیلے وطنی۔ سنت و کتاب سے سیکھے
طلسم توڑ کے سس آف دی سوائل کا
جہانِ خاک کی تسخیر ابو تراب سے سیکھ

یہ سازشیں، یہ تصادم، یہ مصلحت کوشی
قدم قدم پہ سیاسی تضاد ہیں کیا کیا
یہ رشوتیں، یہ خیانت، یہ نفع اندوزی
معاشرے میں معاشی فساد ہیں کیا کیا

افلاس ہے باعثِ جرائم
اس راز کو فاش تو کیجیے
اصلاحِ معاشرہ کہاں تک
اصلاحِ معاش تو کیجیے

رئیس مجرم نہیں، جرائم کے اسباب کا قلع قمع چاہتے ہیں۔

مجرموں کی پشت پر درّہ زنی کافی نہیں
جہل کو، اوہام کو، غفلت کو کوڑے ماریے
قابلِ تعزیر اسبابِ جرائم ہیں رئیس
بھوک کو، افلاس کو، رشوت کو کوڑے ماریے

دستور اور آئین سے متعلق ان کے قطعات ملاحظہ ہوں۔

کوئی جوہر ہی نہیں ذہن کے گنجینے میں
اک پُر اسرار خلش سی ہے مرے سینے میں
آپ آئین میں ترمیم سے پہلے سوچیں
بال پڑ جائے گا ترمیم سے آئینے میں

خوشی سے مصائب کو لو باس آئی
جو امید آئی بصد یاس آئی
نہ دستوریت آپ کے پاس آئی
نہ جمہوریت آپ کو راس آئی

وہ رہبری و رہبران پر اس انداز سے اظہار خیال کرتے ہیں۔

کچھ تو ہو تسکین خاطر کا سبب
مستقل نوحہ گری کب تک کریں

اعتبار رہبراں اب تک کیا
احتساب رہبری کب تک کریں

رئیس امروہوی نام نہاد مذہب، کٹر ملائیت اور غلط قسم کی مذہبی احبار پرستی کے بھی خلاف تھے جس سے خواص تو سیاسی مقاصد و مفاد حاصل کر کے معاشرے میں اپنی جڑیں مضبوط کر لیتے ہیں مگر عوام الناس زندگی کی ادنیٰ نعمتوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ اس کی تکرار رئیس امروہوی کے قطعات میں دیکھیے۔

فکر کہ۔ شوخیٔ افکار کہاں سے لاؤں
قلب ۔ تاریک ہے انوار کہاں سے لاؤں

لیلۃ القدر تو بیدار ابدی لائی ہے
لیلۃ القدر کی اقدار کہاں سے لاؤں

عہدِ نو کی ضد کہ روحِ ارتقا نافذ کرو
قلب کہتا ہے کہ عشقِ باصفا نافذ کرو

عقل کہتی ہے فقط سود و ربا نافذ کرو
عشق کہتا ہے نظامِ مصطفیٰ نافذ کرو

شرارِ آرزو کے سوختہ جانوں پہ کیا گذری؟
بتا اے شمعِ کشتہ! تیرے پروانوں پہ کیا گذری؟

کوئی پوچھے تو عہدِ نو کے اسلامی مورخ سے
مسلمانوں کے ہاتھوں سے مسلمانوں پہ کیا گذری؟

ہر بات میں ضد اے دلِ بے صبر! یہ کیا ہے
کردار میں لغزش ہے تو نیت میں خطا ہے

اقبال! تری قوم کا یہ حال ہوا ہے
جذبوں میں خودی ہے نہ خیالوں میں خدا ہے

اشفاق احمد

روحانیت کی دنیا میں ظاہر اور باطن کی دنیا کچھ اس طرح سے معمّا سازی کرتی ہے کہ ایک اچھے بھلے ذہن کی گرفت سے اس کا علاقہ نہیں ہو پاتا۔ یہ کچھ اور ہی بات ہے اور کچھ اور ہی معاملہ ہے۔ اس کو اظہار کے پیکٹ میں بند کر کے عقل کے حوالے نہیں کیا جا سکتا، لیکن رئیس امروہوی کی تحریریں کچھ ایسی سیتھنی تھیں جو براہِ راست دل کو اپنی گرفت میں لیتی تھیں۔ اس موبنی کو نہ ابلاغ کا نام دیا جا سکتا ہے نہ اظہار کا، لیکن اس کائنات ذرگرتی کمان کا تیر تھا جس کا ایک طاقت ور کمان دار نے چلّے چڑھایا تھا۔ ایک منحنی سا، بے حد رنجامرنج، ہلکا پھلکا انسان کہ جس کے پاؤں کی آہٹ کبھی زمین نے بھی محسوس نہ کی ہو، اس قدر طاقت ور، شجیع اور بے خوف ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے آپ کو رئیس مرحوم کی تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کی ذات سے بھی آگاہ ہونا پڑے گا۔ اپنے ماحول اور اپنے گرد و پیش سے پوری آگہی رکھنے اور اس میں بھرپور زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ ان کا روحانی کائنات سے الگ سے ایک رشتہ استوار کر کے رکھنا اور اپنے اندر معنویت کا ایک اور مفہوم بھی رکھتا ہے۔ اپنے پُراسرار محبوب لوگوں کی زندگی بھی ایک راز ہوتی ہے اور موت بھی ——— وہ اپنے ارادوں کے ساتھ رہتے تھے اور اپنی مرضی کے پورے پورے مالک ہوتے تھے ———

شبنم رومانی

گہرے سمندروں کا سفر

تخلیقِ فن کرنے والوں میں شاعر کا رتبہ سب سے بلند ہے، جو "لاشئے" سے اشیا کو اور غائب سے حاضر کو جنم دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں مگر وہ اپنی ذہانت ذکاوت، مطالعے، مشاہدے، تجربے اور وجدان کی مدد سے ایسے شاہکار تخلیق کرتا ہے جو نہ صرف انسانیت کا درسِ عظیم دیتے اور قوموں کی تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ اپنے کیف و کم میں ایسا جادو بھی رکھتے ہیں جو سر چڑھ کر بولتا ہے

یہ شاعری کی بدنصیبی ہے کہ اس عہد کے بیشتر شعرا نے، اپنی آسانی کے لیے، چند سانچے بنالیے ہیں اور ان میں ادھر ادھر کا مواد ڈال کر رائج الوقت اشعار نکال لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بالعموم ان سب کی لے ایک رنگ و آہنگ ہے، جیسے کارخانے میں مال تیار ہوا ہو، حال آنکہ ادب کا حُسن اختلافی ہے۔ گلہائے رنگا رنگ ہی سے باغِ ادب کی بہار ہوتی ہے۔ ہر شاعر کا اپنا اندازِ نظر اور اپنا اسلوبِ اظہار ہونا چاہیے۔ کوئی انقلاب کی مشعل لے کر اٹھے تو کوئی رومان کی قوسِ قزح بنائے۔ کوئی فکر کا قبلہ درست کرے تو کوئی زبان کی اصلاح و توسیع کا بیڑہ اٹھائے۔

صنعتی معاشرے کی اس ادبی صورتِ حال میں رئیس امروہوی کی تخلیقی شخصیت سب سے الگ نظر آتی ہے، جو ایک دس منزلہ عمارت کے مانند ہے اور جس کی ساری بالکونیاں اور کھڑکیاں سڑک کی طرف کھلتی ہیں۔ غزل گو، نظم گو، مثنوی گو، قصیدہ گو، تاریخ گو،

مزاح نگار، کالم نگار، نفسیات نگار اور تنقید نگار رئیس امروہوی کے بارے میں کچھ لکھنا جان جوکھوں کا کام ہے کہ اس دس منزلہ عمارت کی کسی بالکونی سے نیچے گر کر وفات پا جانے کا حادثہ بھی رونما ہو سکتا ہے۔ اس لیے محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ گراؤنڈ فلور سے آغاز کیا جائے یعنی ان کی غزل سے ـــ یہ انتخاب یوں بھی غلط نہیں ہے کہ غزل ہی سے انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا اور غزل ہی ان کی آئندہ زندگی کی ضمانت بھی نظر آتی ہے۔

رئیس امروہوی دورِ حاضر کے نظریاتی اور تجرباتی ریلوں میں پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہے ہیں۔ انھوں نے حیات اور کائنات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ مشکل ترین موضوع ہے مگر رئیس متفکرانہ بصیرت اور فلسفیانہ ذہن لے کر آئے ہیں اور اپنا کام بہ طریقِ احسن انجام دے رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا سوتا غالب کے ذہن سے پھوٹا ہے ـــ وہی کیا اور کیوں کا چکر ـــ وہی زندگی کے اندیشہ ہائے دور دراز، وہی الجھی ہوئی دوڑ کے ازلی اور ابدی سروں کا کھوج ؎

ہر اک گل کی جبیں پر لکھا ہوا ہے "کیا؟"
ہر اک غنچے کے دل میں کھدا ہوا ہے "کیوں؟"

ان کی شاعری اسی "کیا" اور "کیوں" سے شروع ہوتی ہے۔ اشیاء کے قلوب میں اترنے اور ان کی ماہیت کو جاننے کی جیسی شدید خواہش رئیس کے ہاں ملتی ہے ان کے کسی دوسرے ہمعصر کے ہاں نظر نہیں آتی ؎

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

رئیس کی شاعری کو اگر "گہرے سمندروں کا سفر" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کی نظر ادھر ادھر سے ہو کر نہیں گذرتی۔ تہہ در تہہ اور حجاب اندر حجاب اترتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں خوب صورتی کا خارجی احساس کم اور داخلی احساسات کی خوب صورتی زیادہ ملتی ہے۔

ریاضِ دہر سے اے دوست! سرسری نہ گزر
روش روش ہے تحیّر فروش و بوقلموں

مگر تلاشِ حقیقت کے اس عمل میں رئیس پر یہ بیتی کہ وہ شہیدِ داخلیت ہوگئے۔ اتنی شدید داخلیت اور اتنا مہیب کربِ ناصبوری کسی اور کے ہاں شاذ و نادر ہی ملے گا۔

میں ہوں خود اپنی ہی خاکسترِ جاں میں مدفون
جس طرح دفن خرابے میں کوئی سرمایہ

اُبھار اے موجِ طوفاں خیز مجھ کو
یہ کشتی ریت میں ڈوبی ہوئی ہے

خود اپنے ہی قلبِ خونچکاں میں
خنجر کی طرح اُتر رہا ہوں

مہجور رہے انجمن میں ہم لوگ
اپنے میں جلا وطن ہیں ہم لوگ

میری آنکھیں تو محبت میں کبھی نم نہ ہوئیں
کون روتا ہے الٰہی مرے دل میں چھپ کر

رئیس امروہوی اپنی ذات میں ایک "محشرِ خیال" ہیں۔ انسانی اذہان کی کھدائی (EXCAVATION) کرتے کرتے اور حیات کی بوقلمونی کا جائزہ لیتے لیتے اب وہ حقائق کے ایک ایسے خوفناک جنگل میں پہنچ گئے ہیں جہاں انسان تو انسان فرشتہ بھی کانپنے لگے۔ یہ دہشتِ لفظ اور وحشتِ معنی اب ان کی شاعری میں عجب حسن کے ساتھ ظاہر ہو رہی ہے۔ ایک طرف زندگی کی برہنہ سچائیاں ہیں تو دوسری طرف کائنات کے اسرار کی پرچھائیاں۔

عرفانِ حیات کی یہ منزل بہت کڑی ہوتی ہے ؎

ذہن پر ایک کھردری سی لکیر
کنکھجورے کا راستہ تو نہیں
تیرے جسمِ حسیں میں پوشیدہ
باغِ جنت کا راستہ تو نہیں

ہائے ماضی کی دل نشیں یادیں
ہائے خونخوار بھیڑیوں کی برات
چیونٹیاں جیسے ذہن پر رینگیں
اُف یہ میرے لطیف احساسات
بھوت بن کر مجھے ڈراتی ہیں
میری نا آفریں تخلیقات
کون آیا مرے تعاقب میں
وہی فکر و خیال کے جنات
دفعتاً کس نے قہقہہ مارا
یہ اندھیرے میں کون ہے مرے ساتھ؟

دیوار پہ دائرے ہیں کیسے
یہ کون ہے کس سے ڈر رہا ہوں؟

پیڑوں کے گھنے، مہیب سائے
یہ کون ہے مجھ پہ حملہ آور؟
پتوں میں جھپک رہی ہیں آنکھیں
شاخوں پہ چمک رہے ہیں خنجر!

اردو شاعری میں یہ اسلوب بالکل نیا ہے۔ کنکھجورے، اژدہے، خونخوار بھیڑیے، چیونٹیاں، بھوت، جنّات، حملہ آور سائے اور خوف کے مارے، یہ سب غزل کی لغات نہیں ہیں مگر جناب رئیس نے ان کو جس سہولت کے ساتھ جزوِ غزل بنایا ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ اَن دیکھی سچائیوں کو الفاظ میں اس طرح ڈھالنا کر ان کو ٹٹول کر دیکھا جا سکے اعجاز نہیں تو کیا ہے۔

رئیس کے رنگ و آہنگ پر کچھ پرتو عربی شاعری کا بھی ہے۔ اُن کے ہاں جگہ جگہ وہی فضا کسی بنتِ قبیلہ کی داستان، کسی کارواں کی گھنٹیوں کا ترانہ اور کسی تودۂ ریگ پر قدموں کے نشان بن کر اُبھری ہے۔

اڑتے ہیں ہوا کی سمت ذرّے
یادوں کے چلے ہیں لاؤ لشکر

مل جائے شناسا نہ کوئی راہِ طلب میں
چھپ جایئے کچھ دیر کو ٹیلوں کے عقب میں

اُس شہسوارِ ناز کو شاید خبر نہیں
اک صیدِ نیم کشتہ حریفِ خدنگ ہے

ابھی حُسن کی خیمہ گاہیں کہاں
ابھی اور ویرانہ ویرانہ چل
وہ بنتِ قبیلہ نہ ہو منتظر
ذرا تیز اے عزمِ مستانہ چل
وہ سلمائے صحرا نہ ہو مضطرب
رہِ دوست میں عذر خواہانہ چل

غزالوں کی آبادیاں ہیں قریب
غزل خوانیاں کر، غزالانہ چل

رئیس امروہوی کی شاعری کا سب سے اہم پہلو اس کی رجائیت ہے۔ حال کی تمام خونناکیوں کے باوجود وہ مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ وہ اس دن کے منتظر ہیں جب انگارے پھول بن جائیں گے، چاند انسان کے قدموں تلے چمکے گا اور انسان من حیث المجموع ایک پُرامن اور پُرمسرت دنیا کا معمار ہوگا ؎

تخمینۂ حوادثِ طوفاں کے ساتھ ساتھ
بطنِ صدف میں وزنِ گہر کر رہے ہیں ہم
صدیوں تک اہتمامِ شبِ ہجر میں رہے
صدیوں سے انتظارِ سحر کر رہے ہیں ہم

فروغِ صبح سے کہہ دو کہ انتظار کرے
چراغِ شام کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

ڈھل گئی ہستیٔ دل یوں تری رعنائی میں
مادہ جیسے نکھر جائے توانائی میں

یہ شامِ غم ہی نویدِ فروغِ جاں تو نہیں
پسِ غبار کوئی تازہ کارواں تو نہیں

جو نئی دنیا ابھی تخلیق کی منزل میں ہے
اس کا کربِ آفرینش بھی ہمارے دل میں ہے

غنچۂ نو سے دمِ صبح یہ کہتی تھی نسیم
زندگی اور نکھرتی ہے فنا ہو کے

زندگی میں کہ ہمہ معرکہ آرائی ہے
کس قدر نظم ہے، ترتیب ہے، رعنائی ہے

کیوں، کتنے جہاں اپنے ذرّوں سے تراشے ہیں
بولا اسے ویرانے، بہ چیخ اے مری تنہائی

اب دور نہیں ہم سے تسخیرِ مہ و انجم
کچھ اور قریب آ جائے گنبدِ مینائی!

انسانی زندگی کی عظمت، انسانی شعور کی اہمیت، زمین کی محبّت کا ادراک، مادّے کی رعنائی کا احساس اور ایک جدید ترین دنیا اور ایک عظیم ترین معاشرے کی تشکیل و تعمیر کی آرزو ارئیس امروہوی کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اس لحاظ سے وہ عہدِ حاضر کے ایک انقلاب انگیز شاعر ہیں۔

رئیس کی شاعری کے سلسلے میں شعورِ حیات، اور اسرارِ کائنات کا میں نے اتنا ذکر کیا ہے کہ اس پر حکیمانہ اور فلسفیانہ یبوست کا گمان گزرتا ہے، مگر ایسا نہیں ہے۔ دراصل رئیس کی شاعری بہت پہلودار ہے۔ وہ فلسفی کا دماغ مگر شاعر کا دل رکھتے ہیں۔ وہ عاشق ہیں اور انھوں نے محبّت کے سارے معرکے جوانی کی بھرپور توانائیوں کے ساتھ سر کیے ہیں۔ عشق ان کے ہاں صرف احساس نہیں ہے بلکہ تجربہ بھی ہے ؎

یا رب غمِ عشق کیا بلا ہے
ہر شخص کا تجربہ نیا ہے

تجربے کے اس نئے پن کے ساتھ انھوں نے تغزّل میں بھی نہایت خوب صورت اور نازک اضافے کیے ہیں۔

لگا ہے کہ جیسے تم بھی نہیں کرتے محسوس
تم میں ایک ایسی پُراسرار ادا اور بھی ہے

تو نے کیا کہہ دیا دلِ مشتاق
وہ کئی روز سے ہیں سنجیدہ

دل کو اب تیری توجہ کا یقیں آیا ہے
وہ بھی کچھ تیرے تغافل کے سوا ہو لے سے

حضورِ حسن بھی با وصفِ اعترافِ شکست
نگاہِ شوق کا انداز جارحانہ تھا

اس سلسلے میں رئیس کی ایک غزل کا مجھے خاص طور سے ذکر کرنا ہے اس غزل کا ایک ایک شعر ایک دفترِ معنی رکھتا ہے اور کسی بھی زبان کی شاعری کے مقابل پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ؎

شب ہے اور بابِ انتظار ہے باز
دے رہا ہے کوئی فقیر آواز

اس شعر کی فضا پر غور کیجیے، جتنا جتنا غور کیجیے کہانی کے اوراق کھلتے جائیں گے۔ اکیلے اس شعر پر ایک عمدہ افسانہ لکھا جا سکتا ہے ؎

ان کو دیکھا کہ گفتگو کر لی
اک سنے ہیں تجلّی و آواز

اس موضوع پر فراق کا شعر بھی خوب ہے مگر یہاں تو تجلّی ہی کو آواز بنا دیا گیا ہے۔

دل جو لرزاں ہے شاخِ گل کی طرح
دفعتاً کون کر گیا پرواز

اس شعر کی محاکات بے مثل ہے۔ احساس کو شکل عطا کرنا اور محسوس کو مشہود بنا دینا رئیس ہی کا حصہ ہے۔ جن لوگوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا ہے وہی اس شعر کا صحیح لطف اٹھا سکتے ہیں۔

رئیس امروہوی نظم کے بھی اتنے ہی اہم شاعر ہیں جتنے غزل کے، ان کی بعض ابتدائی نظمیں اختر شیرانی کی اور بعض جوش کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ مگر یہاں بھی وہ اس کلیے کو توڑ کر باہر

آ گئے ہیں اور "عفریت اور دیوتا " " دور ایا " " عجب بوسے سوال " " آج رات " " مرزا غالب " " انکشافات خاک " " وحشت " اور بہت سی دوسری نظموں میں انھوں نے اسلوب کے خاصے کامیاب تجربے کیے ہیں۔ پابند شاعری کے خلاف اتنی " ہو حق " کے باوجود ان کی یہ نظمیں آج بھی اپنا IMPACT رکھتی ہیں اور فکر و خیال کی نئی راہیں کھولتی ہیں ۔ میں ان نظموں پر الگ سے اظہار خیال کروں گا۔ مگر وہ جو فضلی کہہ گئے ہیں کہ

نظم ہے اپنی جگہ خوب، مگر ہائے غزل

تو رئیس کی نظم اپنی جگہ خوب بلکہ خوب تر سہی، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی نامو سی شخصیت میں غزل ہی ان کا طرۂ دستار ہے، اور اب جب کہ وہ پختگی اور پختہ کاری کی انتہا تک پہنچ چکے ہیں، اور اپنی زنبیل میں اپنے ذہنی اور حسی تجربات کا بہت بڑا سرمایہ رکھتے ہیں، ان کو ایک بار پھر غزل کی طرف واپس آجانا چاہیے کہ فیض و فراق کی طرح یہی ان کے بڑھاپے کا مضبوط سہارا ہو سکتی ہے ۔

O

ظہیر کاشمیری

رئیس امروہوی سے تعلق دوستی ساری عمر رہا۔ وہ منفرد شاعر، مستند قطعہ نگار اور معتبر کالم نگار تھے ۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے فکر و احساس میں ایک اپج پیدا ہوتی ہے، اور ابلاغ کے نئے افق روشن ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کے قطعات پُر مغز، معنی آفرینی اور اپنے اندر اک کاٹ لیے ہوتے ہیں۔ انھوں نے PARANORMAL SUPER SEASONS تجربات و مشاہدات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۔

حمایت علی شاعر

رئیس امروہوی کے نام

(ایک خط — ایک مطالعہ)

رئیس بھائی

تسلیمات عرض

آپ کی دو کتابیں "ملبوسِ بہار" اور "بحضرتِ یزداں" بذریعہ ڈاک مجھے ملیں۔ شکر گزار ہوں کہ آپ اپنی تصانیف سے مجھے نوازتے رہتے ہیں۔

آپ کی دونوں کتابیں بہت اہم ہیں۔ "ملبوسِ بہار" یوں کہ اس میں آپ نے اپنی غزلوں کا انتخاب خود کیا ہے اور "بحضرتِ یزداں" اس لیے کہ یہ آپ کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جن سے آپ کا فکری تشخص متعین ہوتا ہے۔ ویسے تو غزلیں بھی شاعر کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں مگر اپنی ہیئت اور آدابِ اظہار کی بنا پر اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ شاعر غزل کے منفرد اشعار میں بکھر جاتا ہے اور غزل اپنی منتشر مزاجی کے سبب چونکہ زندگی کے مختلف تجربوں کو بہ یک وقت سمیٹتی ہے اور جذبات و محسوسات کے مختلف رنگوں کو تیزی سے منعکس کرتی جاتی ہے، اس لیے نگاہ کسی ایک رنگ پر نہیں ٹھہر پاتی اور اشعار کی ہمہ رنگی میں وہ رنگ نمایاں نہیں ہو پاتا جسے شاعر کی پہچان کہا جا سکے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ غزل اپنی ہیئت کے اعتبار سے ایک شکستہ آئینے کے مصداق ہوتی ہے، جس میں ایک ہی شکل مختلف زاویوں سے نظر آتی ہے اور شاعر کی مکمل شخصیت کا ادراک اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک آئینے کے مختلف

ٹکڑوں کو جوڑ نہ لیا جائے۔ یہ صورتِ حال بالخصوص اُن شعرا کو سمجھنے میں دقت پیدا کرتی ہے جن کا اپنا کوئی فکری تشخص بھی ہو۔ کلاسیکی غزل گو شعرا کے مطالعے میں یہ مسئلہ اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ کم و بیش سبھی شعرا ایک ہی عقیدۂ حیات کے پابند ہیں یعنی وحدت الوجود کے ——— میر سے لے کر غالب تک عقیدے کا یہ تسلسل موجود ہے۔ غالب میں کہیں کہیں اپنے عہد کے بدلتے ہوئے رجحانات ضرور دکھائی دیتے ہیں مگر مجموعی طور پر وہ بھی تصوف پسند ہی تھے۔ اردو شاعری میں یہ روش اقبال سے تبدیل ہوتی ہے اور جوش سے ہوتی ہوئی آپ تک خاصی بدل جاتی ہے۔ میرا مطلب ہے ——— شاعری میں تعقل کا عمل، منتشر انداز میں پہلے غالب کے یہاں نمودار ہوا، پھر اقبال کی شاعری میں اس طرح نمایاں ہوا کہ شعری روایت بن گیا۔ جوش صاحب نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور اب آپ کی شاعری میں ایک خاص زاویے سے آپ کی پہچان بن گیا۔ میں اس زاویے کو سائنسی آگہی سے تعبیر کرتا ہوں۔

اقبال نے اپنے عہد کی آگہی کو غزل کی وساطت سے بیان کیا تو غزل کا لہجہ ہی بدل گیا اور وہ ان کی نظم کے قریب تر آ گئی۔ جوش چونکہ بحیثیت صنف ——— غزل ہی کے منکر تھے اس لیے انھوں نے نظم کو وسیلۂ اظہار بنا لیا۔ چنانچہ وہ تبدیلی جو غزل کے اسلوب میں در آئی تھی، نظم کے ارتباط سے ایک نیا رنگ اختیار کر گئی اور آپ کی غزل اسی نئے رنگ کی نمائندہ ہے۔

آپ کی غزل کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جو آپ کو ہم عصروں سے الگ کرتی ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ کی اکثر غزلیں کیفیت اور خیال کے اعتبار سے کم و بیش ایک ہی فضا رکھتی ہیں۔ غزل کا ہر شعر منفرد اور جدا ہونے کے باوجود، داخلی طور پر ایک دوسرے سے مربوط نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ غزل بھی نظم کی طرح کہتے ہیں یعنی پہلے مطلع اور پھر ترتیب وار دوسرے اشعار ——— اس خصوصیت کے سبب آپ کی غزل بہت کم انتشارِ جذبات و خیال کی شکار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی چند غزلوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں
وہیں سولی پہ لٹکایا گیا ہوں

مہجور رہِ انجمن ہیں ہم لوگ
اپنے ہی میں جلا وطن ہیں ہم لوگ

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

کیسی نجات، امل نہ سکے گی پناہ تک
اب تیر آ رہے ہیں مری خیمہ گاہ تک

پیرِ مغاں تھے، صحبت اہلِ صنم میں ہم
ٹھہرے نمک حرام، سوادِ حرم میں ہم

سیاہ ہے دلِ گیتی، سیاہ تر ہو جائے
خدا کرے کہ ہر اک شام، بے سحر ہو جائے

میں ایسی غزلوں کی طرف عمداً اشارہ نہیں کر رہا ہوں جو کسی خاص زمین کے سبب یک آہنگ ہیں ـــــــ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ریزہ کاری/ آزاد روی کی بنا پر غزل کے مختلف اشعار، بیک وقت شاعر کے مختلف تجربوں کو سمیٹتے ہیں اور اس کا رمز یا انداز بیان اکثر شاعر کو اپنے پردوں میں چھپا لیتا ہے ـــــــ ... آپ کی غزلوں میں بھی آپ کا فکری تشخص اس حد تک بے نقاب نہیں ہوتا جس حد تک کہ آپ کی نظموں میں نمایاں ہوا ہے۔

"بحضرتِ یزداں" کو آپ کے مجموعہ ہائے کلام میں وہی حیثیت حاصل ہے جو حضرت جوش کی کتابوں میں "الہام و افکار" کو ـــــــ جوش کا فکری رویہ ان کی دوسری کتابوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے مگر ان میں بے شمار ایسی نظمیں بھی ہیں جو مختلف و متنوع موضوعات رکھتی ہیں "الہام و افکار" ان کے فکری ارتقاء کا آئینہ کہی جا سکتی ہے۔ "بحضرتِ یزداں" میں بھی

آپ کا فکری ارتفاع آئینے کی طرح روشن ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے آپ کی غزلوں کے ان اشعار کو بھی پرکھنے میں مدد ملتی ہے جو آنکھوں میں چکا چوند تو پیدا کرتے ہیں مگر اتنی مہلت نہیں دیتے کہ شاعر کو نظر بھر کے دیکھا جاسکے۔ ایک شعر کے بعد دوسرا شعر آجاتا ہے، اور ذہن کا دوسرا افق روشن ہوجاتا ہے۔ نظموں میں تسلسل خیال' شاعر کی شخصیت کا پورا احاطہ کرتا ہے اور اس کی شخصیت اپنے تمام خدوخال اور قدوقامت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔

اس طویل تمہید سے مقصود یہ ہے کہ آپ روایت کے پاسدار شاعر ہونے کے باوجود ان شعرا میں سے نہیں ہیں، جو شعر برائے شعر کہتے ہیں یا جن کی شاعری کسی فکر کی پابند نہیں۔ یہاں فکر سے میری مراد اس آگہی سے ہے جسے میں نے سائنسی آگہی کہا ہے اور جو ہماری صدی کی عطا ہے۔ اس صدی نے حیات و کائنات کے بارے میں جو انکشافات کیے ہیں اور انسانی فطرت کے جن پُراسرار گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے، ان کی روشنی میں ہماری ملاقات ایک نئے انسان سے ہوتی ہے۔ یہ انسان' روائتی آدمی کی طرح آنکھیں بند کیے زندگی کا سفر طے نہیں کررہا ہے بلکہ ہر قدم پر نہ صرف اپنے گردو پیش پر نظر رکھتا ہے بلکہ اپنی سمت کا تعین بھی خود ہی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اندر بیشتر پرانے عقیدے ٹوٹ چکے ہیں اور نئے عقائد' نئے علوم کی رہنمائی میں مرتب ہو رہے ہیں۔

یہ صدی مسلسل تغیرات سے گزر رہی ہے اور خارجی ہی نہیں بلکہ داخلی طور پر بھی مسلسل ایک کشمکش سے دوچار ہے اور انسان اس شکست و ریخت میں اپنی بقا کے امکانات تلاش کر رہا ہے۔ کہیں وہ اپنی بازیافت میں مصروف ہے اور کہیں اپنی تعمیرِ نو میں۔ کہیں وہ اپنی گم شدہ اور نو ساختہ کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور کہیں اپنے آپ کو مٹی کا ڈھیر محسوس کرنے لگا ہے۔ ایسا مرحلہ پچھلی صدیوں کے انسان کی زندگی میں کبھی نہیں آیا تھا۔ کم از کم کچھ اقدار مشترک تھیں جو ماضی و حال کا ہاتھ ملائے رکھتی تھیں۔ اس صدی میں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہاتھ ہی ایک دوسرے سے چھوٹ گئے ہیں۔ ایک نئی دنیا وجود میں ضرور آرہی ہے مگر وہ دنیا کیسی ہوگی' کسی کو خبر نہیں ــــــ کیوں کہ

ہزار عالم و آدم - ہزار خالق و خلق
ابھی ہے عرصۂ تخلیق میں بہ شکلِ غبار

آپ نے اپنے عہد کے بارے میں بہت صحیح کہا ہے کہ

عہدِ جانفزا رُک رہا ہے امید و بیم کا
قافلہ کس سمت مُڑ جائے، بتا سکتا نہیں

"بحضرتِ یزداں" میں آپ کا ذہنی کرب بہت شدت سے نمایاں ہوا ہے۔ ہر چند کہ یہ کرب غزلوں میں بھی ہے مگر یہاں کچھ اور بھی غم دامن گیر ہیں۔ ہجرت کا غم، وطن میں اجنبی رہنے کا غم اور غمِ جاناں وغیرہ۔ ان سب غموں نے غزلوں میں آپ کے ذہنی کرب کو مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے مگر نظموں میں سارے غم ایک وحدت اختیار کر گئے ہیں اور اپنی صدی کے بنیادی مسائل سے ٹکرا کر مختلف سوالات کی شکل میں پھوٹ پڑے ہیں۔

"بحضرتِ یزداں" اپنی صدی کا تجزیہ بھی ہے اور سوالیہ بھی ——— روایتی عقائد کا محاسبہ بھی ہے اور نئے نظریات کا محاکمہ بھی ——— اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ذہن مسلسل سوچتا ہے اور اس پر حیات و کائنات کے اسرار کھلتے جاتے ہیں۔ کہیں انسانی تاریخ کی غلط تاویلات کا پردہ چاک ہوتا ہے تو کہیں انسانی فطرت کے تضاد کی المناک عکاسی ملتی ہے۔ کہیں انقلابی فکر کی ترغیب ہے تو کہیں مقدس توہمات کی تکذیب، کہیں تقدیر کا غم ہے تو کہیں مشیّت کا ستم، کہیں نفسیات کا مطالعہ ہے تو کہیں تخیلات کا جائزہ ——— ان سب موضوعات کے ساتھ ایسے موضوعات پر بھی نظمیں ہیں جنہیں مجرّد حقیقتیں کہا جا سکتا ہے۔ بالخصوص "جراحتِ تخلیق" اور "وقت" ——— ان نظموں کو پڑھتے ہوئے مجھے وہ حدیث یاد آ گئی جس میں زمانے کو خدا کہا گیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ علامہ اقبال نے برگساں کو جب یہ حدیث سنائی تھی تو وہ بھی چونک پڑا تھا۔ آپ نے بھی وقت کو کئی زاویوں سے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے تخلیق کے اسرار سے پردہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح "عدم" اور "آفرینش نامہ" بھی فکر انگیز نظمیں ہیں۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے مجھے حضرت جوش کی نظم "سینۂ عدم میں موجود کا پیچ و تاب" یاد آ گئی اور اس نظم کا وہ ناقدانہ تجزیہ بھی جو حضرت نیاز فتح پوری نے

"ما لہ و ما علیہ" کے تحت "نگار" میں کیا تھا، اور شاید آپ کو بھی یاد ہو کہ جوشؔ صاحب نے "نقاد" کے عنوان سے جو نظم کہی تھی، وہ اسی تجزیے کے جواب میں تھی۔ آپ کی نظمیں اپنے انداز کی منفرد نظمیں ہیں اور جوشؔ صاحب کی نظم سے بجز موضوع کوئی علاقہ نہیں رکھتیں۔ "عدم" صرف عدم کی صورت گری ہے اور "آفرینش نامہ" عدم سے وجود کی طرف سفر کی شاعرانہ تفسیر —— اسی طرح "عالم ناآفریدہ" اور "انکشافِ خاک" انسانی ارتقا کی تاریخ کا وہ المیہ پیش کرتی ہیں جو آدم گزیدگی سے اس کی خلاقی تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان نظموں میں روشن امکانات کے باب کھلے ہوئے ہیں۔

مرے ذہنِ رسا پر جلوہ گر ہے
نیا اک عالمِ ناآفریدہ
وہ دنیا جس کی پیشانی پہ تحریر
حیاتِ نو کا نقشِ برگزیدہ
وہ دنیا جس کے مردانِ خودآگاہ
مئے تخلیق کے لذت چشیدہ

"قصۂ مریخ و ماہ" بھی ایک نئے عالم کا اشاریہ ہے اور "عالم تازہ بہ تازہ" انسان کا وہ حسین خواب جو روزِ ازل سے اس کی آنکھوں میں بیدار ہے۔ یہ نہایت خوب صورت نظم ہے جو اس شعر پر ختم ہوتی ہے ؎

اٹھنے والا ہے نئی دنیا کے چہرے سے نقاب
وقت کو ہے ایک ضربِ آخری کا انتظار

ظاہر ہے کہ اسی دنیا میں وہ عظیم انسان بھی پیدا ہوگا جس کی بشارت آپ نے "انسانِ کبیر" میں دی ہے۔

اس کتاب میں دو نظمیں مجھے اور بھی پسند آئیں —— ایک "بقولِ شیخ" اور دوسری "مرزا غالب" —— یہ نظمیں آپ کے اس مخصوص تیکھے اندازِ بیان کی نمائندہ ہیں جو اکثر قطعات میں جھلکتا ہے یعنی ایک لطیف طنز اور شائستہ خوش مذاقی —— ظاہر ہے یہ ہنر آپ ہی

کا حصّہ ہے۔

رئیس بھائی۔ یہ ادبی دور جس میں شاعری بے چہرہ ہی نہیں بے دماغ (MIND LESS) بھی ہو گئی ہے۔ آپ کا کلام' اسے نہ صرف ایک چہرہ عطا کرتا ہے بلکہ ایک سوچنے والا ذہن بھی ——— اور جہاں تک اس کے لباس کا تعلق ہے وہ یقیناً روایت سے آراستہ ہے، مگر اس روایت سے جو اپنا ایک مخصوص حُسن اور رفتار بھی رکھتی ہے اور اسی کا پُروقار انداز میں عہدِ حاضر سے مخاطب ہے سہ

ادھر آ، رہروِ گم کردہ منزل
چراغِ جادۂ افکار ہوں میں

○

سیّد ہاشم رضا

دنیا میں کچھ لوگ اپنی زندگی ہی میں مر جاتے ہیں اور کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ میرے مرحوم دوست رئیس امروہوی جب تک زندہ رہے، روشناسِ خلق رہے اور مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ ان کی دل آویز شخصیت پر جناب سیماب اکبر آبادی کا یہ شعر صادق آتا ہے سہ

میں بعد مرگ بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر مری محفل، مرا مزار نہ پوچھ

"رئیس الشعراء" رئیس امروہوی پر استاد ذوق کا یہ شعر بھی چسپاں ہوتا ہے سہ

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے یہی نہ، کر دو پشت چار پشت

نقاش کاظمی

رئیس امروہوی[1]
فکر و فن کی روشنی میں

رئیس صاحب محض شاعر اور نثر نگار ہی نہیں بلکہ ایک پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ عملی طور پر بھی بہت کچھ ہیں یعنی سیاسی، سماجی، علمی، ادبی، معاشرتی اور روحانی وغیرہ۔ انھوں نے تمام ہی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور طبع آزمائی کی یہ صورتیں کبھی آمد اور کبھی آورد سے متعلق رہیں جس کے بارے میں خود رئیس صاحب یوں فرماتے ہیں۔

> مجھے نثر و نظم کے ہر موضوع پر لکھنا پڑتا ہے کبھی بے اختیار
> کبھی بہ جبر، کبھی خالص آمد کے عالم میں، جیسے نزولِ الہام ہو۔
> کبھی آورد کی حالت میں جیسے ہجومِ اوہام ہو۔

اب انھیں شعر کہتے ہوئے تقریباً ساٹھ برس ہونے کو ہیں ان کی شاعری کا بڑا حصہ فلسفہ، منطق، نفسیات، سائنس، معرفت، علم نجوم، اور ریاضی پر مشتمل ہے۔

رئیس صاحب نے "پسِ غبار" کے دیباچے میں اپنے بارے میں لکھا ہے کہ شعر سے میرا رشتہ اکتسابی نہیں موروثی ہے۔ میں نے ہوش کی آنکھیں نہیں سر کی آنکھیں کھول کر اپنے

---

[1] یہ مضمون ۱۹۷۱ء میں تحریر کیا گیا تھا اور جناب رئیس امروہوی کے ساتھ ایک شام کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ (ن۔ک)

گردو پیش شاعری اور شعر ہی کو جلوہ گر پایا۔ رئیس صاحب کی جسمانی اور ذہنی تربیت دیوان خانوں اور حویلیوں کے ماحول میں ہوئی ہے۔ دیوان خانے میں شطرنج کی بساطیں بچھتی تھیں، شعر کی بیاضیں کھلتی تھیں، حقے کے دور چلتے تھے اور بیت بازی وغیرہ کے جلسے جمتے تھے۔ اس طرح ہوتا یوں تھا کہ دنیا سمٹ کر خود حویلیوں میں آجایا کرتی تھی حقے کے دور تو آج بھی رئیس صاحب کے سبزہ زار پر چلتے ہیں لیکن شاید شطرنج کی بساط محبت یاراں کے ساتھ ساتھ اکھڑ گئی۔ لوگ جب بھی ان سے ملاقات کے لیے ان کے پاس جاتے ہیں انھیں حویلی کے باہر لان پر ہی کام کرتے دیکھتے ہیں، نہ شطرنج کی بساط رہ گئی نہ بیت بازی کا شغل، البتہ غور کرنے پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ رئیس صاحب ہر ملاقاتی سے کہہ رہے ہوں کہ

کانٹوں سے فگار انگلیاں ہیں

ملبوس بہار سی رہا ہوں

سی رہا ہوں، زہر حیات پی رہا ہوں، آدمی رہا ہوں، الجھایا گیا ہوں، ڈسوایا گیا ہوں، دفنایا گیا ہوں، سلگایا گیا ہوں اور۔۔۔۔

جہاں ہے رسم قتل انبیاء کی

وہاں مبعوث فرمایا گیا ہوں

کی صورت میں واحد متکلم کا صیغہ وحدت میں کثرت کا جلوہ نما ہے ان اشعار میں رئیس صاحب نے خود کو مجموعی طور پر انسان یا آدمی محسوس کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہی شاعری کا سماجی منصب ہے یعنی شاعری کا سماجی منصب وہ جس کے لیے ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے شاعری سماج۔۔۔ ہم رشتہ ہونے کے سبب سامعین و قارئین کو مسرت سے سرشار کرتی ہے کہیں یہ مسرت کم ہوتی ہے کہیں زیادہ۔

رئیس صاحب نے بھی سماجی مسائل پر قلم اٹھایا ہے لیکن یہ اس قلم کی بات نہیں جس کے رشحات، قطعات اور نواب لچھے مرزا کی صورت میں نظر آتے ہیں بلکہ میرا اشارہ اعلیٰ شاعری کے اس متاع کی جانب ہے جہاں رئیس صاحب یوں گویا ہوتے ہیں۔

ابھی نئی سحروں کا نہ انتظار کرو
ابھی نئے افقوں کی تلاش جاری ہے

ہم لوگ بذات خود ہیں دنیا
دنیا نے بنا رکھی ہیں ذاتیں

مری تخلیق نغمے سے ہوئی تھی
مگر فریاد ہو کر رہ گیا ہوں

اور اسی رو میں جب رئیس صاحب کے کانوں میں یہ آواز آتی ہے کہ

کسی کے گھر جلائے گا سیلاب بلا مرے بعد

تو اس طرح جواب دیتے ہیں ۔

اب آپ کی آنکھ میں ہیں آنسو
سیلاب کا رُخ بدل گیا ہے

شاعری میں زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ادب کے اساتذہ نے کہا ہے :۔

زبان ہی وہ جزوِ عظیم ہے جو کہ پرانے و نئے اور قدیم و جدید کو ایک دوسرے سے مربوط کیے ہوئے ہے یہی نہیں بلکہ زندوں اور مردوں میں بھی ایک برادرانہ اتحاد زبان اور بیان کے ذریعے قائم ہے ۔ زبان میں تو خیر وقفہ وقفہ سے تبدیلیاں ممکن ہیں، لیکن ابلاغ کی صورت تبدیل ہو کر بھی ابلاغ رہتی ہے ۔ زبان ہر عہد کی نمائندہ ہوتی ہے اور اپنے اندر ہر زمانے اور عہد کی تغیر پذیری اور تبدیلیوں کو سمیٹ کر آنے والے زمانے کو پیش کرنے کے لیے تیار رہتی ہے ۔

رئیس امروہوی صاحب کی شاعری کو اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی شاعری

قدرتِ کلام کا ایک نادر نمونہ نظر آتی ہے۔ نظم ہو کہ غزل، قطعہ ہو کہ رباعی۔ قصیدہ ہو یا کچھ اور زود گوئی اور اظہارِ ابلاغ کی موجیں ان کے شاعرانہ سمندر میں ٹھاٹھیں مارتی نظر آتی ہیں وہ گزشتہ ۵۹۔۶۰ سال سے اس مشغلے میں مصروف ہیں اور اس فن کو اپنے لیے وقت گزاری کا سلسلہ بھی سمجھتے ہیں لیکن قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قلم برداشتہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں اور جو کچھ بھی لکھ دیتے ہیں کوئی غلط قرار نہیں دے سکتا۔

رئیس صاحب کے کلام کو بغور پڑھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ان کی عشقیہ شاعری بھی ذاتی اور نجی نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ عشقیہ شاعری محض دو اشخاص کے درمیان ابلاغ کا ذریعہ ہوتی ہے لیکن اگر حد سے زیادہ اشخاص اس شاعری کو پڑھ کر مسرور ہو جائیں تو ایسی شاعری یقیناً معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی شاعری کا نمونہ ہوتی ہے لہٰذا رئیس صاحب کی نظمیں اور غزلیں اپنے رتبے اور مرتبے کے اعتبار سے اس صف میں شمار کی جا سکتی ہیں، جسے بڑی شاعری کہا جاتا ہے۔

رئیس صاحب نے اپنے اشعار کے ذریعے زندگی کے ہر گوشے پر حکیمانہ نظر ڈالی ہے، ان میں ناصحانہ، حکیمانہ، فلسفیانہ اور خصوصاً نفسیاتی اندازِ فکر بھی نہایت واضح طور پر موجود ہے مثلاً جب وہ پرچھائیاں، دائرے، رنگ، اندھیرا، تاریکی اور آسیب کی بات کرتے ہیں تو نفسیاتی مسائل ان کی شاعری میں ایک اہم عنصر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

بلائیں ناچ رہی ہیں اب ان مکانوں میں
اندھیری رات بھیانک کھنڈر مہیب فضا

اک حور سے ہوتی ہے ملاقات سرِ شام
اک روح ڈراتی ہے مجھے آخرِ شب

دیوار پہ دائرے ہیں کیسے
یہ کون ہے کس سے ڈر رہا ہوں

رئیس صاحب کی اتنی بڑی شاعری پر بہت بڑے مضمون بلکہ ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ لہٰذا نہایت اختصار سے کام لیتے ہوئے ان کی کچھ نظموں کے بارے میں توجہ چاہتا ہوں۔

"عہدِ نو کے سوال" نامی نظم میں نئے عہد کے قلمکاروں کی نظر میں اس عہد کے تقاضوں کی جانب منعطف کرانے کے لیے نئے نئے سوالات اٹھاتے ہیں اور جب وہ طبقاتی شعور کو بیدار کرنے کی جانب آتے ہیں تو یوں فرماتے ہیں

کیوں یہ تہذیب کا نشیب و فراز
کیوں یہ آخر معاشرے میں فساد
کیوں یہ تخلیقِ فکر و فن ہر آن
فلسفہ، شعر، تجربہ، وجدان
کیوں ثقافت کے تہہ بہ تہہ طبقات

اے نئی زندگی کے معمارو
اے نئے عہد کے قلمکارو

اس کے علاوہ ان کی بے شمار قابلِ ذکر نظمیں ہیں جن میں "زخم کاری"، "مکتوبِ تمنا"، "آفرینش نامہ"، "عالمِ ناآفریدہ"، "عفریت اور دیوتا"، "آس کے پھول"، "عہدِ تو تم اور ہم"، "طلوعِ بہار" وغیرہ توجہ کی طالب ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ آخر میں ان کا ایک نمائندہ شعر ملاحظہ ہو

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

O

ڈاکٹر خیال امروہوی

رئیس امروہوی کا فارسی کلام

غالباً بہت کم افراد یہ جانتے ہیں کہ جناب سید محمد مہدی ۔ رئیس امروہوی میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں ۔ گویا پاکستان میں میرے والد مرحوم کے بعد اگر کوئی قریبی رشتہ ہو سکتا ہے تو وہ رئیس صاحب ہی کا ہے ہر چند کہ اقتصادی فاصلوں نے اس قدر مجبور کر دیا کہ ملاقات تو ملاقات ، مراسلت کے ذریعے نصف الملاقات بھی ممکن نہ رہی کیوں کہ وہ روزنامہ "جنگ" سے وابستہ اور کراچی کی ادبی اور علمی فضا میں گم اور راقم پنجاب میں اپنی علمی و ادبی دنیا میں غرق ۔ لہذا ارتباط ندارد ۔ یہاں تک تو ذاتی روابط کی بات تھی ۔ اب رہے حضرت رئیس امروہوی بحیثیت شاعر ، ادیب ، صحافی ، ماہر نفسیات روحیات و عملیات ۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب رئیس نے جن دنوں اشہب فکر کو مہمیز دیا تھا اس وقت میں عدم میں بھی کالعدم کے مصداق تھا ۔

۱۹۳۰ء میں میں نے اس عالم ناسوت میں ہبوط کیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے رئیس صاحب ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ امروہہ سے ضلع بیڑ حیدرآباد دکن میں میرے والد کے ہاں تشریف لائے ۔ ان دنوں میں نے ان سے "گلستان" اور "بوستان" پڑھی تھی ۔ اور وہ قصائد عرفی کا مطالعہ کیا کرتے تھے ۔ اس دوران بھی ہندوستان بھر میں رئیس امروہوی کے نام سے مشہور تھے ۔ گویا ۱۹۴۷ء تک رئیس صاحب نے لاکھوں شعر کہے ،

اور بلا مبالغہ ہزارہا مضامین لکھے ہیں اور لاتعداد موضوعات پر عالمانہ اظہار کیا ہے۔ قطعات، غزلیں، نظمیں، رباعی، مثنوی، قصائد، غرض یہ کہ تمام اصناف پر انھیں مکمل عبور حاصل ہے۔

جناب رئیس امروہوی کے تین اردو مجموعے نظر سے گزرے۔

"الف" "پس غبار" اور "حکایت نے"

جو ہر اعتبار سے اردو ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں جن دنوں راقم تہران یونیورسٹی (تہران) میں زیر تعلیم تھا، رئیس صاحب سے مراسلت رہی جس سے ان کی موضوعیت، سیاسی اور سماجی حالات سے آگاہی ہوئی اور انشاپردازانہ صلاحیتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ پاکستان واپسی پر رئیس صاحب نے اپنے فارسی کلام کے سلسلے میں ایک مکتوب تحریر فرمایا اور فارسی غزلیات بھی ارسال کیں تاکہ ان پر اظہار خیال کر سکوں۔ خط کا متن درج ذیل ہے۔

۱۲۹۔ مانک جی اسٹریٹ گارڈن ایسٹ کراچی۔۱

۲۷ فروری ۱۹۷۶ء

برادرم! اس رقعہ کے ساتھ فارسی کلام کے چند صفحے بھیج رہا ہوں۔ یہ کلام آج سے ۲۷۔۳۸ سال قبل کا ہے، ایک ایرانی دوست "آقائے امید" نے اسے دیکھا مگر مجھے ان کے ذوق سلیم پر بالکل بھروسہ نہیں۔ یہ کلام "سبک ہندی" میں ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں رائج تھا اور ہے (کم سے کم اب تک) میں عدم مزاولت کے سبب فارسی شعر سے بیگانہ محض ہو چکا ہوں۔ جدید فارسی تقریباً سمجھ میں نہیں آتی۔ تم ان چند صفحات پر ایک نظر ڈالو یہ سمجھ کر یہ سبک ہندی ہے اور سبک ہندی ہی رہنا چاہیے (میں اسے جدید فارسی شعر کے قالب میں ڈھالنا نہیں چاہتا۔ ایرانیوں کو یہ

> کلام پسند نہ آئے گا وہ تو غالب اور بیدل تک کے قائل نہیں تا بہ رئیس چہ رسد؛ تم جہاں سبک ہندی کے پیش نظر) ان ابیات میں تبدیلی یا تنسیخ کی ضرورت محسوس کرو وہاں خط تنسیخ کھینچ کر تنسیخ بھی لکھ دو۔ کیا یہ کلام ایرانیوں کے لیے ناقابل فہم ہے؛ بہرحال اس سلسلے میں تمہاری رائے قابل وقعت ہے کیوں کہ تم ایران میں کئی سال رہے ہو۔"
>
> (رئیس امروہوی)

میں نے رئیس صاحب کے فارسی کلام کا مطالعہ کیا۔ ان کا کلام ہر چند کہ فارسی قدیم کا نمونہ ہے لیکن ان کے یہاں فلسفیانہ رنگ بھی موجود ہے۔ وہی رنگ جو قدیم فارسی اساتذہ کے یہاں پایا جاتا تھا۔ تاہم ان کے یہاں انفرادیت اس حیثیت سے موجود ہے کہ وہ روایت سے ہٹ کر نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر رئیس صاحب اپنی فارسی گوئی کو جاری رکھ سکتے تو پاک و ہند کے موجودہ فارسی گو شعراء سے مختلف ہو سکتے تھے۔

رئیس صاحب کا یہ شبہ درست نہیں کہ "سبک ہندی" بیکار اسلوب نگارش ہے۔ ایسی صورت میں تو اقبال کا تمام کلام فارسی "سبک ہندی" میں ہی ہے جسے ایرانی بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ اقبال کو اہل زبان تسلیم نہیں کرتے لیکن ان کی فارسی کو سمجھنے میں دقت بھی نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے رئیس صاحب کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ایران میں سبک عراقی ہو یا سبک ہندی اس لیے متروک ہو گیا ہے کہ ایران کی روزمرہ کی زبان یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ ایران میں ربع صدی سے یہ مہم جاری ہے کہ فارسی کو عربی سے نجات دلائی جائے اور جہاں تک ممکن ہو خالص فارسی الفاظ زبان کی حیثیت اختیار کر جائیں۔ یہ مہم خاصی دقت طلب رہی کیوں کہ صدہا عربی الفاظ ایسے ہیں جو انقلاب صفویہ ایران سے قبل ایرانی ادب کا حصہ رہے۔ لہٰذا صدیوں کے عربی اثرات کو

زائل کرنے اور اس کے بجائے خود ساختہ فارسی الفاظ واصطلاحات کو بروئے کار لانے میں بڑی مشینری کو حرکت میں لانا پڑا۔ اس انقلاب سے زبان تو وضع ہوگئی لیکن سعدی، حافظ، خیام، قاآنی، خاقانی، عنصری، عجدی، فردوسی اور منوچہری کی شیریں زبانی، فصاحت اور مضمون آفرینی ختم ہوگئی۔ جدید لوازم زندگی میکانکی مصنوعات کی فراوانی نے ایک نئی زبان کو جنم دیا۔ چنانچہ نئی نسل اس کی عادی ہوگئی اور قدیم عربی آمیز فارسی کو خیرباد کہہ چکی ہے۔

مثلاً پاکستانی شاعر چاہے کہ اس کا فارسی کلام جدید ایران میں بھی مقبول ہو یا سمجھا جائے تو اسے مروج فارسی اصطلاحات کے معنی اور مفاہیم سمجھنے اور ان کے مروجہ استعمال کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ذیل میں چند ادبی الفاظ واصطلاحات کے نئے معنی اور مفہوم دیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوسکے گا کہ ہمارے ہاں مروج فارسی الفاظ کا ایران میں کیا مفہوم ہے یا انھیں کہاں کہاں اور کس انداز سے استعمال کیا جاتا ہے۔

مجلس۔ ایران میں صرف پارلیمنٹ کے معنوں میں ہی سمجھا جائے گا۔

عضو۔ ممبر یا رکن اسمبلی

نہضت۔ سیاسی تحریک (MOVEMENT)

قیام۔ ٹھہرنے کے معنوں میں نہیں بلکہ بغاوت کے لیے آمادہ ہونا سمجھا جاتا ہے۔

شراب۔ مشروب۔ شراب صرف انگور کی کشید کے معنوں میں ہے۔ الکحل کو مشروب ہی کہیں گے۔

دلچسپ۔ خوشگوار کے معنوں میں ہے مثلاً کوکا دلچسپ است۔ ہم خوشگوار کے معنوں میں استعمال نہیں کرتے۔

تصویر۔ عکس

پرندہ۔ مرغ

عشق۔ دوستی کے معنوں میں ہے۔ عشق ورزیدن (محبوب ہے)

چراغ ۔ بلب کو چراغ کہیں گے۔

بلب ۔ لامپ

برق ۔ صرف الیکٹریسٹی کے معنوں میں ہے۔ چشمک برق ہرگز نہیں سمجھا جائے گا۔

آبلہ ۔ چیچک کے معنوں میں ہے۔ چھالوں کے معنوں میں نہیں۔ آبلہ کوبی سے مراد، چیچک کا ٹیکہ لگانا۔

چشم ۔ (زبر سے) خوب یا درست! جی بہتر۔ (YES)

چشم ۔ (زیر کے ساتھ) آنکھ۔

خانہ ۔ منزل۔ منزل سے مراد مقصد یا مراد نہیں ہے۔

پروانہ ۔ تتلی۔

روشن ۔ واضح۔ روشن نیست سے مراد ہے مطلب واضح نہیں۔

روشنی ۔ نور۔

صدا ۔ طنین (مثلاً اگر کہیں کہ یہ ریکارڈ آواز نہیں دیتا تو کہیں گے۔ ایں صفحہ طنین ندارد۔

پاپوش ۔ کفش۔

قفسہ ۔ الماری۔

پنجرہ ۔ دریچہ یا کھڑکی۔

حقوق ۔ قانون۔ (LAW)

تخت ۔ چارپائی۔ تخت شاہی کا مفہوم ایران میں نہیں ہے جو ہمارے یہاں مروّج ہے۔ چارپائی کو تخت خواب کہتے ہیں۔

بلند ۔ نیچے کے معنوں میں مثلاً شلوار شما خیلے بلند است۔

صافی ۔ گندے برتن صاف کرنے کا کپڑا۔

اگر صوفیٔ صافی ایران میں کہا جائے تو دیکھیے مفہوم کس قدر مضحکہ انگیز ہو جائے گا۔

پستی ۔ پائین

مزدوری۔ دست مزد (اجرت نہیں کہتے)
مسالحہ۔ صرف سیمنٹ چونا وغیرہ کے لیے۔
عمارت۔ ساختمان۔ مسالحہ۔ ساختمانی سے مراد عمارت بنانے کا سامان۔
زیب۔ زیبائش۔ قشنگ۔ قشنگی۔
تمدن۔ فرہنگ
خوبرو یا خوب صورت ——— خوش گل۔ ایرانی یہ نہیں کہتے کہ شما خوبرو یا خوب صورت ہستید۔

اسی طرح فارسی دری کے تمام الفاظ متروک ہیں۔ جیسے اکرام۔ انعام۔ تلطف۔ رشحہ۔ تبسمات۔ سحاب۔ سپہر۔ الطاف و کرامات۔ عنایات وغیرہ۔

تخم صرف انڈوں کے معنوں میں ہے جیسے تخم مرغ
بیج کو "بزر" کہتے ہیں۔ لہٰذا تخم کاری کے بجائے "بزرکاری" کہا جائے گا۔

اسی طرح روضہ۔ ریاض۔ ضمیر۔ معمار۔ معیار۔ مقنن۔ مرعوب۔ مرغوب۔ مقہور۔ استراحت۔ قباحت۔ فراغت۔ راغب۔ رغبت وغیرہ اہل ایران غزل کی زبان میں استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

"خاکروب" کو "منقی" اور "اشتغالی" کہا جائے گا۔

چنانچہ زبان کی اس عظیم تبدیلی نے فارسی ادبیات پر بھی اثر ڈالا اور جدید ایرانی شعرا نے کلام منظوم کا ڈھانچہ بدل دیا ہے۔ ایسی صورت میں پاک و ہند کے فارسی شعراء کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ "سبک ہندی" میں انھیں الفاظ و اصطلاحات کو ملحوظ رکھیں جو مروج ہیں۔ جدید فارسی میں شعر کا ابلاغ اس وقت تک دشوار ہے جب تک ایرانیوں کے ساتھ شیر و شکر ہو کر انھیں کے ذہن کے ساتھ نہ سوچا جائے۔ اگر یہاں کے فارسی شعراء "اردو" یا فارسی دری کے ذہن سے سوچیں گے تو الفاظ کا ابلاغ جدید ایرانی ذہن سے کوسوں دور رہے گا۔

نظم سے قطع نظر نثر کا بھی یہی حشر ہے۔ مثلاً درج ذیل فارسی نثر کی سطور میں

جتنے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان کا مفہوم ہماری اردو اور فارسی دری میں آج سے کتنا مختلف ہوگا۔

"تقاضا می شود کہ در اسرع اوقات لوازم" ویزا "
و تسہیلاتی دربارہ گزرنامہ و مقررات مثبت نام
خانوادہ تدارک شود ۔ تا سایل آمادگی مسافرت
پایاں برسد"۔

سطور بالا میں دس خط کشیدہ الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم ہمارے ہاں قطعاً مختلف ہے مثلاً

تقاضا - ہم اصرار یا بار بار کسی چیز کے مانگنے کو کہتے ہیں لیکن جدید فارسی میں براہ راست دفتری اصطلاح میں درخواست (REQUEST) کو کہتے ہیں۔

اسرع - سریع - سرعت "عربی ہیں" لیکن ایران میں (EARLY CONVENIENCE) کے معنوں میں ہے یعنی پہلی فرصت۔

لوازم - (جمع لازمہ) ہم کہتے ہیں لوازم طاعت و عبادت یا لوازم طعام لیکن ایران میں (PARTICULERS) کے معنوں میں ہے۔

تسہیلات - (سہل سے) آسانیاں - تاہم جدید فارسی میں (FACILITIES) (سہولتوں) کے معنوں میں ہے۔

گذرنامہ - صرف پاسپورٹ کے لیے - غالباً ہم پروانہ راہداری کہیں گے لیکن وہاں مستعمل نہیں ہے۔

مقررات - BYLAWS

مثبت نامہ - REGISTRATION

حالانکہ خود ایرانی شاعر حافظ نے کہا

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

"حافظ جی" نے رجسٹریشن کے معنوں میں "ثبت" نہیں کہا۔

خانوادہ۔ بہم "خاندان" کو کہتے ہیں۔

تدارک۔ علاج ایران میں RAMIDY کے معنوں میں ہے۔

اس بحث کے بعد نہ صرف رئیس صاحب بلکہ تمام فارسی گو شعرا کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ جدید شاعری کو سبقاً سبقاً پڑھیں اور کسی ایرانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کریں بصورت دیگر فارسی دری میں شعر گوئی لاحاصل ہے۔

رئیس صاحب نے فارسی دری کے اشعار میں!! ایرانیوں کے مقابل نہیں بلکہ اپنی ذات میں انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ بجا طور پر پاکستان کے ایک کلاسیکی لیکن جدید دور کے بہترین فارسی شاعر ہیں۔

ذیل میں رئیس صاحب کے فارسی کلام سے منتخب اشعار پیش کرتا ہوں جو خاکسار کو بے حد پسند آئے:-

به یک جرعه، جهانم داد ساقی!
چه یارائے کرم دہقان طلے را (قائم)
دے باساقی و مطرب بسر کن
که فردا را بقا باشد نه دے را

چشم می داری به موردانه کش
کیں پیے روزی چه رنجے می بری
خیز و برخیز و میا رام و بہرم
آں که رنجے برد گنجے می بدی

از مودی هم تنگ و تا زمگس
ریزه ہا از گوشه ہا دست آورد
دل نه بردارد ز سعیٔ و جستجو
گه ز بالا گاه از پست آورد

اے برادر! در معارفِ زندگی
سر بباز و جاں بباز و دل بباز
گاہ مالِ بیش از قسمت مجو
گاہ بر سرمایۂ حاصل مناز

بر لبم از عالمِ بالا سروش آوردہ است
زیں سروش اربابِ محفل را بجوش آوردہ است
طائرانِ صبح را آوردہ ام اندر نوا
مرغکِ تصویر را در خروش آوردہ است

للہ الحمد کہ با اہلِ جنوں کارم نیست
رہروی، بر اثرِ ناقۂ لیلےٰ دارم
ہمہ معمورۂ آفاق پر از خونِ وفاست
وادریغا کہ دل و دیدۂ بینا دارم

مذکورہ اشعار میں رئیس صاحب نے کئی موضوعات کو نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور عصری تقاضوں کا احاطہ کیا ہے۔

درج ذیل قطعے میں "اسیری" کو کس خوب صورت انداز میں پیش کیا۔

عہدِ گل است و گل نمی چینم
دامِ غم است و بے پر و بالم
اوج بشر را از دست داری
ہم چو مگس با دست بمالم

"اضدادیت" کو بیان کرتے ہوئے کیا اچھا شعر کہا ہے ؎

چشم ہمہ آب و دل ہمہ آتش
کشتۂ رست خیز اضدادم

سادات امروہہ "حضرت شرف الدین شاہ ولایت" کی اولاد سے ہیں۔ اسی رعایت سے جناب رئیس نے تاریخ بیان کرتے ہوئے اسی شجرۂ نسب کی طرف اشارا کیا ہے ؎

ارم۔ حور و قصور خویشتن را دوست می دارد
سر یدعرش اعلیٰ۔ ہم بہ عز و جاہ می نازد
عجم ایوان کسریٰ را متاع فخر می داند
عرب بے چارہ بر بیت خلیل اللہ می نازد
رئیس امروہوی نازم بخاکِ پاک امروہہ
کہ ایں بر روضہ حضرت ولایت شاہ می نازد

رئیس صاحب اردو کے نہایت پُرگو، زود گو اور عظیم سماجی شاعر ہیں۔ چونکہ ان کا ادیبانہ، شاعرانہ، صحافیانہ اور ناقدانہ رنگ اسی سماج کی پیداوار اور اسی ماحول کی تخلیق ہے۔ لہٰذا فارسی گوئی میں بھی یہی انداز غالب ہے۔ چنانچہ درج ذیل قطعہ ان کی اسی ناقدانہ روش کا ترجمان کہا جا سکتا ہے۔

مقام شکوہ نہ جائے فغان و فریاد است
کہ ارضِ شرق چو دوزخ مصیبت آباد است
فرشتۂ کہ وکیل است بر خزائنِ رزق
حقوقِ خویش بدستِ فرنگیاں داد است

آخر میں ایک فارسی غزل ملاحظہ فرمائیے ؎

مرا گر بال و پرِ جبرئیل بخشیدی
چرا نہ سدرہ و یا طوبیٰ نشیمنم کردی
زگوہر گہرِ لعلم سفرہ ہا بہا رائی
کشادہ دست و لے تنگ دامنم کردی
ازیں فروغ ندانم کجا شوم فارغ
چو شعلۂ کشتی و چوں شمع روشنم کردی
قبائے گر ز حوادث کہ جامۂ رنداست
برہنہ کردی و ایں جامہ برتنم کردی

مارا ز چاک جیب و گریباں تواں شناخت
شورے کہ در سراست ز ساماں تواں شناخت
اے راہ ناشناس! پئے راہ بر مگرد
منزل ز مشت ریگِ بیاباں تواں شناخت
برتر ز فہم عشق فریب نگاہ و درست
قدرے ز تارِ جنبشِ مژگاں تواں شناخت
رازے کہ در ضمیرِ مشیت گزر کند
آں را بیک اشارۂ جاناں تواں شناخت
مرغ بریدہ ہوش چہ داند کہ در قفس
رفتارِ نبضِ گل ز رگِ جاں تواں شناخت
گاہے بہ طاقِ کعبہ و گاہے بہ سنگِ در
آخر رئیس را بچہ عنواں تواں شناخت

O

اقبال عثمان

رئیس امروہوی کی روحانی قوتیں

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کر کے اسے اشرف المخلوقات قرار دیا تو فرشتوں نے معصومیت، دوسری مخلوقات نے لاعلمی اور شیطان نے اپنی سرکشی کی وجہ سے انسان کو کم تر درجے کی مخلوق بلکہ زمین پر فتنہ قرار دیا۔ لیکن یہ بات صرف اللہ العلیم الخبیر ہی جانتے تھے کہ آدم کو اسمائے الحسنیٰ سکھائے گئے ہیں۔ جن کی واقفیت کی وجہ سے انسان ترقی کی معراج تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا کی دوسری تمام مخلوقات کسی ایک علم میں کمال حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن یہ انسان کی ذات ہی ہے کہ وہ جب علم حاصل کرنے پر آتا ہے تو اتنے زیادہ علوم پر تفکر و تجسس اور پھر تسخیر و کی منازل کمال طے کرتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اسے حیرانی سے دیکھتا ہے۔

ذاتِ مکمل تو صرف اللہ کی ذات ہے اور تکمیل کے مراحل بھی صرف وہی ذاتیں طے کرتی ہیں۔ جن پر اللہ کا فضل ہو۔ مختلف علوم کے کسب کی کوشش اور اس میں کامیابی بھی خداوند کریم کی نعمت ہے اور اس نعمت سے اللہ تعالیٰ نے جناب رئیس امروہوی کو بے حد نوازا تھا۔ ایک طرف وہ شاعر تھے۔ تو روزانہ چار مصرعوں میں حالاتِ حاضرہ کو سمیٹ لیتے تھے۔ غزل کہتے تو ہر شعر سے وجدان کی بارش ہوتی۔ نثر نگاری کرتے تو ہر جملہ مفکرین کے لیے فکر و ادب کی لاکھوں گتھیاں سلجھا اور الجھا دیتا۔

جب بولنے پر آتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے فکر و آگہی کا ایک چشمہ سا پھوٹ رہا ہو۔ اب یہ تو علم کی پیاس بجھانے کے متمنی طلبا پر منحصر تھا کہ ان کے جام میں کتنی وسعت ہے۔ اس کے علاوہ بھی جناب رئیس امروہوی کی شخصیت کے نہ جانے کتنے پہلو تھے، جن میں کھلے ہوئے جوہر یا بند آبگینے تھے۔ لیکن رئیس صاحب کے اعلیٰ اور عظیم علم کا ایک پہلو مابعد النفسیات (پیرا سائیکولوجی) میں ان کی تعلیم اور پھر ان کی تحقیق تھی۔ میں نے رئیس صاحب کو بہت سے موقعوں پر دیکھا ہے۔ ان کو سنا ہے لیکن اکثر انھیں بولتا یا خاموش بیٹھا دوسرے کی بات سنتا دیکھتا تو اکثر میری نظریں ان کے چہرے پر ٹکی رہتیں۔ میں سوچتا کہ ان سیدھے سادے انسان میں اللہ تعالیٰ نے کتنی روحانی قوت رکھی ہے۔ رئیس صاحب کے جنگ میں چھپے ہوئے مضامین پڑھ کر کروڑوں بے چین دلوں کی ڈھارس بندھتی تھی۔ بے شمار مایوس لوگ اپنی کھوئی ہوئی توانائی کو دوبارہ مجتمع کر کے حالات سے مقابلہ کرتے اور نامساعد حالات پر قابو پاتے۔ اپنے مسائل حل کرتے۔ اپنی مشکلات پر قابو حاصل کرتے اور یہ سب رئیس صاحب کی تحریر پڑھ کر ہوتا۔ اس چشمۂ خیر سے فیضیاب ہونے والوں کے بارے میں خود رئیس صاحب کو بھی خبر نہ ہوتی وہ اسے صرف ایک مصنف اور قاری کا تعلق سمجھتے، لیکن دراصل یہ ایک جاں بلب مریض اور مسیحا کا تعلق تھا۔ جس پر مریض تو دوبارہ زندگی پانے پر مشکور ہوتا۔ لیکن مسیحا کو اس کی خبر نہ ہوتی۔ کیوں کہ مسیحا بے نیاز اور بے غرض تھا۔

تجارت کے سلسلے میں مجھے کئی بیرونی ممالک اکثر جانے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ میں نے بہت سے ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا ہے۔ جو رئیس امروہوی کو اپنا ان دیکھا مسیحا مانتے ہیں۔ جنھوں نے رئیس صاحب کی تحریر دل سے فائدہ اٹھا کر اپنی جسمانی بیماریوں کو دور کیا۔ اپنی روحانی لاغری کا علاج کیا۔ اپنی نفسیاتی الجھنیں دور کیں اور ان سب کے بدلے میں رئیس امروہوی نے ان سے کچھ نہیں لیا۔ ان لوگوں نے اس وقت بھی رئیس صاحب کے حق میں دعا کی تھی اور آج بھی وہ ان کے لیے دعا ہی کر رہے ہیں۔

رئیس امروہوی صاحب کا ایک کمال یہ تھا کہ ان کو اس بات کا اچھی طرح سے علم تھا کہ ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح بہت کم ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مختلف وجوہات کی بنا پر ہمارے ہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی اسناد کے باوجود شعور کے ان درجات پر نہیں پہنچ سکا جو ان اسناد کے متقاضی ہیں۔ اس کے باوجود وہ پیراسائیکولوجی کے مشکل اور پیچیدہ موضوعات پر اتنی آسان اور سلیس زبان میں لکھتے کہ معمولی اردو لکھنے پڑھنے والا بھی ان حیرت ناک علوم کی باریکیوں پر غور کرنے لگتا۔

میں امریکن سوسائٹی فار پیراسائیکولوجی کا ممبر ہوں۔ اس سلسلے میں امریکہ اور دوسرے ممالک میں تعلیمی اور تحقیقی سرگرمیوں میں بطور راہنما بی معروف رہنا پڑتا ہے۔ آج کی دنیا نے ان تمام علوم کو بے نقاب کر دیا ہے۔ جنھیں ہم پہلے مخفی علم سمجھتے تھے۔ امریکہ میں ہپناٹزم ٹیلی پیتھی کے علاوہ دوسرے علوم پر اتنی زیادہ تحقیق کی ہے کہ اب یہ علوم عام زندگی کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ خاص طور پر ای ایس پی اور مراقبے میں جو کمال دورِ حاضر نے تحقیقی طور پر حاصل کیا ہے وہ آج سے چند دہائیوں سے قبل کے انسان کو حیرت کے مارے گنگ کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اصل حیرت تو مجھے تب ہوتی تھی جب امریکہ جیسے ترقی اور تمدن کی عروج پر پہنچے والے ملک سے میں کوئی علم کی جدید تحقیق پر عبور حاصل کرتا تو مجھے معلوم ہوتا کہ جناب رئیس امروہوی صاحب نے اس بارے میں تفصیل سے لکھا ہوا ہے۔ گویا ہم لوگ جو کچھ حاصل کرتے تھے وہ رئیس صاحب کے اندر پہلے سے ہوتا تھا، اور کسی بھی شخص کے فہم و ادراک کی یہ معراج ہے۔

رئیس امروہوی کی شخصیت میں قدرتی مقناطیسیت تھی کوئی شخص بے شمار موضوعات پر ان سے گفتگو کر سکتا تھا اور جب وہ اپنے استفسارات کی تفصیل بیان کر چکتا اور رئیس صاحب اس کا جواب دینے کے لیے لب کشا ہوتے تو وہ پورے ماحول کو اپنی شخصیت کے مقناطیس میں جکڑ لیتے۔ کوئی شخص اپنی جگہ سے ہلنا تو درکنار پلک جھپکنا بھی بھول جاتا۔ رئیس صاحب سننے والے کے شعوری اور غیر شعوری معیار پر آ کر گفتگو کرتے تاکہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ سامنے والے کی سمجھ میں اچھی طرح آ سکے۔

اس کے علاوہ اگر ہم رئیس امروہوی صاحب کا پیراسائیکولوجی کی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیں تو ان کی شخصیت سے مسحور کن لہریں نکلتی تھیں۔ جو ان کے سامنے موجود انسان کے جسم اور روح میں غیر محسوس طریقے پر اثر انداز ہوتی تھیں۔

رئیس امروہوی صاحب کی بے وقت موت نے ان کے اہل خاندان اور ان کے پرانے رفقائے کار روزنامہ "جنگ" کے مالکان و کارکنان کو بے حد غمگین کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ جناب رئیس امروہوی نے مجھ جیسے لاکھوں سوگوار عقیدت مندوں کو چھوڑا ہے۔ جن کو ان کی شخصیت کی روحانی قوتوں سے کچھ نہ کچھ فیض پہنچا ہے۔ رئیس صاحب کی شخصیت کے دوسرے تمام پہلوؤں پر نہ صرف گفتگو ہو رہی ہے بلکہ ان کے بارے میں بہت سی باتیں تحریر ہو رہی ہیں۔ لیکن رئیس صاحب کے پیراسائیکولوجی پر کیے گئے تحقیقی کارناموں پر ابھی تک شاید کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔ اس کی ایک سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ پیراسائیکولوجی جدید علوم کا وہ منبع ہے جس کے بارے میں سوچنے والا اس کے ارد گرد چکرا کر رہ جاتا ہے۔ یہ ایک تکنیکی موضوع ہے جس پر سوچنے کے لیے معلومات کا خزانہ چاہیے۔

لیکن ہم جو رئیس امروہوی صاحب کے معتقدین ہیں یہ تو کر سکتے ہیں کہ رئیس صاحب کی تحریروں، ان کے مشوروں اور ان کے مقالوں کی روشنی میں ہمارے سماجی مسائل حل ہوئے ہوں۔ احساس کمتری کا علاج ہوا ہو۔ کوئی خفیہ اندرونی قوت مثلاً ای ایس پی بیدار ہوئی ہو یا دوسری دنیا کی مخلوقات سے ملاقات ہوئی ہو۔ شادی میں رکاوٹ دور ہوئی ہو۔ قوتِ ارادی کی وجہ سے اولاد کی نعمت ملی ہو تو ہم ان واقعات کا ذکر کر کے ان عجیب و غریب واقعات اور کیفیات پر مزید تحقیق کر سکتے ہیں تاکہ رئیس امروہوی صاحب کے جلائے ہوئے علم و تحقیق کے ان چراغوں کی روشنی مدھم نہ ہونے پائے۔

میرے خیال میں پیراسائیکولوجی کے حیرت انگیز موضوع کے اس عظیم محقق اور رہنما کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا یہ ایک آسان طریقہ ہے۔

○

کچھ لوگ باشعور ہیں، کچھ لوگ بے وقوف
کچھ لوگ غم پسند ہیں، کچھ لوگ غم پروف
سب لکھ رہے ہیں اپنے مقدر کی سرگزشت
اربابِ اقتدار سے تا راقم الحروف

• خود نوشت

• انٹرویو

maablib.org

سید محمد حسین رضوی

رئیس کا زائچہ

مارچ ۱۹۷۵ء میں جناب رئیس امروہوی مرحوم نے اپنی تاریخ ولادت جناب سید محمد حسین رضوی کو لکھ کر دی تھی تاکہ وہ ان کا زائچہ بنا سکیں، وہ اس زمانے میں اسلام آباد میں رہتے تھے؛ لیکن عارضی طور پر کراچی آئے ہوئے تھے۔ رئیس صاحب نے اپنی ولادت کا وقت طلوع آفتاب کے قریب بتایا تھا، لیکن اس وقت ولادت سے جو زائچہ بنایا گیا تھا وہ ان کے حالاتِ زندگی سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے محمد صاحب نے اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنے ماضی کے کچھ اہم واقعات انھیں لکھ بھیجیں تاکہ وہ ان واقعات کی مدد سے ان کی ولادت کے صحیح وقت کا تعین کر سکیں۔ لہٰذا انھوں نے ۲۹ جولائی ۱۹۷۵ء کو اپنی زندگی کے اہم واقعات لکھ کر کراچی سے اسلام آباد بھیجے، جن کی مدد سے انھوں نے ان کی ولادت کے وقت کا تعین ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کی صبح کو بہ مقام امروہہ ساڑھے نو بجے (انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم) کیا۔ اس وقتِ ولادت کو صحیح مان کر صاحب نے از سرِ نو زائچہ بنایا اور اس زائچے کے مطابق جناب رئیس امروہوی

رئیس ۔ فن و شخصیت

مرحوم کے بارہ سوالوں کے مختصر جوابات لکھ کر ۱۴ راگست ۱۹۷۵ء کو اسلام آباد سے کراچی روانہ کر دیے جو بعد میں کافی حد تک صحیح ثابت ہوئے ۔ ذیل میں اس کی تفصیلات ملاحظہ کیجیے ۔

—— صہبا

۲۹ جولائی ۱۹۷۵ء

برادرم سلام مسنون ۔ اپنے ماضی کا ایک خاکہ حسب ہدایت ارسال ہے ،
اور زائچہ بھی —— میں بے چینی سے آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا ۔ میں نے چند سوالات بھی کیے ہیں ۔ ازراہ کرم اپنے علم خداداد کی روشنی میں ان سوالات کے جوابات عطا فرما کر شکر گزار فرمائیں ۔ بے چینی سے منتظر ہوں ۔

میرے لائق کوئی خدمت ؟

مخلص

رئیس

(دستخط رئیس امروہوی)

یہ پرچہ جناب رئیس امروہوی صاحب نے مارچ ۱۹۷۵ء میں کراچی میں سید محمد حسین رضوی کو اپنا زائچہ بنوانے کے لیے دیا تھا ۔

نام سید محمد مہدی
تخلص رئیس امروہوی
مقام ولادت ۔ امروہہ (دہلی سے جانب مشرق)
تاریخ پیدائش ۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء
وقت ۔ طلوع آفتاب کے قبل یا بعد
کہا جاتا ہے کہ ستارہ عطارد اور برج سنبلہ ہے
کیا احکام ہیں

سنیچر
۲۱ شوال ۱۳۳۲ھ

برادرم صمد رضوی صاحب! السلام مسنون۔ آپ نے زائچہ بنانے کے بعد مجھ سے فرمائش کی تھی کہ اپنی زندگی کے خاص خاص حالات سے آپ کو مطلع کروں تاکہ آپ ان حالات کی روشنی میں زائچے کے نکات کی اور زائچے کے پیشِ نظر حالاتِ زندگی کی وضاحت کرسکیں۔ بظاہر میری زندگی، عجائبات اور ہیجان انگیز حوادث سے تہی دامن ہے۔ بچپن ہی سے شدید الاحساس واقع ہوا تھا اور ایک انجانے خوف میں مبتلا رہا کرتا تھا۔ والدین (سید شفیق حسن مرحوم اور نرجس خاتون مرحومہ) کے بجائے میری پرورش میرے تایا (اور خالو) سید نفیس حسن اور تائی سیدہ ناطقہ خاتون (عرف سیٹھی) نے کی، اور بڑے ناز سے کی۔ میری والدہ نرجس خاتون اور تائی (زوجہ سید نفیس حسن) بہنیں بہنیں تھیں۔ ۱۸/۱۹ سال کی عمر میں شادی ہوگئی۔ یہ شادی، ماموں زاد۔ پھوپی زاد بہن سے ہوئی۔ کسی پہلو سے بھی اس شادی کو کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ میری شادی ۳۰ جون ۱۹۳۲ء کو ہوئی تھی۔ گویا اس شادی کو ۴۱ سال ہوگئے ہیں، مگر وہ سکھ حاصل نہیں ہوا جو ازدواجی زندگی کا ثمرہ ہوا کرتا ہے۔ بچپن ہی سے ذہن روشن اور فکر وسیع تھی۔ شعر و ادب کا ذوق قدرتی تھا اور اوائلِ جوانی میں بھی اپنے لیے عالم گیر شہرت و عظمت کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ میرے آئیڈیل مشاہیر شعرا تھے۔ بچپن سے اب تک کسی خاص جسمانی حادثے سے دوچار نہیں ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ کوئی اجنبی نادیدہ طاقت میری حفاظت کررہی ہے۔ نہ جانے کتنے خطرات ارد گرد منڈلاتے رہے ہیں، منڈلاتے رہتے ہیں، لیکن کبھی عملاً کوئی خطرہ پیش نہیں آیا۔ اندازہ یہ ہے کہ کوئی معجز نما قوت مجھے بچاتی رہتی ہے۔ واللہ اعلم۔ ۱۹۴۷ء (تقسیم ہند) کے فسادات میں دہلی کے اندر محصور رہا تھا۔ مگر بال بیکا تک نہ ہوا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی سے کراچی آیا اور ادب و صحافت کے مشاغل میں بدستور منہمک ہوگیا۔ میں نے ہمیشہ قلم سے روزی کمائی ہے۔ تقریباً چالیس سال سے ذریعہ معاش صحافت ہے۔ اب میری عمر ۶۱ سال ہے۔ صرف حسب ضرورت پیسہ ملتا رہا۔ اللّے تللّے کی زندگی کبھی بسر نہیں کی۔ ہاں، کوئی معاشی تکلیف بھی نہیں اٹھائی۔

اگر ثروت سے بہرہ مند نہیں ہوا تو افلاس سے بھی درد مند نہیں رہا۔ البتہ ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش رہی کہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کما کر عیاشانہ اور شاہانہ زندگی بسر کروں ـــــ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! ـــــ البتہ اپنے حلقۂ احباب اور معاشرے میں ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہا اور بحمد اللہ اب بھی ہوں۔ طبیعت میں بلا کی جولانی ہے۔ کوئی معذور کر دینے والی بیماری کبھی نہیں ہوئی۔ ارباب اقتدار کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتا رہا۔ اگرچہ روپے کمانے کی دھن ہمیشہ سوار رہی۔ مگر عملی منصوبہ بندی اور کسی منصوبے پر شدت، پامردی اور سختی سے عمل کرنے کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے۔ دوستوں پر بلا تکلف بھروسا کر لیتا ہوں اور اس سبب سے اپنے کو خواہ مخواہ کے خطرات میں مبتلا کر لیتا ہوں۔ شعر و ادب کے ساتھ۔ خارق العادات بظاہر اسپرنارمل) کی طرف بیحد میلان ہے۔ لیکن اوہام سے منکر رہا ہوں۔ مذہب سے کوئی خاص رغبت نہیں اور نہ مذہبی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ کبھی کبھی چھٹی حس بروئے کار آتی ہے اور مستقبل کے بعض امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ وجدان (ان ٹیوشن) قوی ہے۔ نہ کبھی سو فی صدی صحت مند رہا نہ سو فی صدی بیمار۔ الحمد للہ امراض سے مغلوب ہو کر معذور بھی نہیں ہوا۔ اس وقت میں اپنی عملی زندگی کے نازک ترین موڑ پر ہوں۔ چند اہم ـــــ عملی منصوبوں میں ملوث ہوں (۱) ایک دوست کی ترغیب سے بہت سی زمینیں آبادکاری کے لیے حاصل کی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ منصوبہ (جس میں بے شمار دشواریاں نظر آتی ہیں) کامیاب ہو گا یا نہیں۔ دن رات اسی الجھن میں مبتلا ہوں۔ اور ذہن کوئی تشفی بخش جواب (اس سوال کا) دینے سے قاصر ہے (۲) سوال یہ ہے کہ آبادکاری کے منصوبے کامیاب ہوں گے ـــــ یا نہیں؟ (۳) اگر یہ منصوبے ناکام ہوئے تو اس ناکامی کا اثر میری زندگی پر کیا پڑے گا۔ کیا نیک نامی اور کامیابی کے بجائے رسوائی اور ذلت نصیب ہو گی (۴) آبادکاری کے مقصد سے ـــــ میرے دوستوں نے ـــــ "رئیس امروہوی فاؤنڈیشن" کے نام سے جو ادارہ قائم کیا ہے۔ اس کا حشر کیا ہو گا؟ (۵) یکم جولائی ۱۹۷۵ء کو بعض احباب کے اصرار سے میں نے ایک جنگ

دیاک عربین کو آپریٹو بنک) کی چیرمین شپ قبول کرلی ہے ۔ اس بنک کا حشر کیا ہوتا ہے ۔ کیا یہ بنک مجھے راس آئے گا ۔ کیا میری چیرمین شپ بنک کے لیے مفید ثابت ہوگی ۔ یہ سوال بھی جواب طلب ہے (۶) میں نے اپنی کتابوں کی اشاعت اور تصنیف و تالیف کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک ادارہ —— رئیس اکاڈیمی —— قائم کیا ہے ۔ اس اکاڈیمی کا مستقبل کیا ہوگا ؟ (۷) کیا آگے چل کر میں کسی سیاسی تحریک میں ملوث ہو جاؤں گا (۸) عام طور پر میری صحت کیسی رہے گی (۹) زائچے کے قرائن کو سامنے رکھ کر عمر کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کیجیے (۱۰) کیا میں اپنی زندگی میں ان منصوبوں کو مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا ۔ جن پر فی الحال کام کر رہا ہوں (۱۱) زائچے کے نقطۂ نظر سے میرے کردار کی کمزوریاں اور خامیاں کیا کیا ہیں ؟ (۱۲) نجوم کے نقطۂ نظر سے میرے اندر کس کس قسم کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں (۱۳) اب تک ارباب اقتدار سے میرے تعلقات کشیدہ رہے ہیں ۔ آئندہ اس سلسلے میں کیا کیا امکانات ہیں ؟

(سید محمد مہدی) رئیس امروہوی

۲۹ جولائی ۱۹۷۵ء

جناب رئیس امروہوی صاحب سلام علیکم

پچھلی دفعہ جب آپ سے کراچی میں ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے اپنی ولادت کا وقت " طلوع آفتاب کے قبل یا بعد " لکھ کر مجھے دیا تھا ۔ لہٰذا طلوع آفتاب کے وقت کا جو زائچہ میں نے بنایا تھا وہ آپ کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا ۔ اسی لیے میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ اپنے ماضی کے حالات ذرا تفصیل کے ساتھ مجھے لکھ کر بھیجیں ۔ اب آپ کی تحریر کردہ تفصیلات کے مطابق آپ کی ولادت کا وقت میرے حسابات کے لحاظ سے صبح ساڑھے نو بجے (انڈین اسٹنڈرڈ ٹائم) صحیح بیٹھتا ہے ۔ اس لیے اب میں نے اسی وقت کو صحیح مان کر آپ کا زائچہ از سر نو بنایا ہے ۔ اس

زائچے کے مطابق آپ کے سوالات کے مختصر جوابات حسب ذیل ہیں۔ جب ملاقات ہو گی تو اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو ہو گی۔

۱۔ زمینوں کا یہ منصوبہ آگے چل کر ابتلا اور التوا میں پڑ جائے گا۔

۲۔ آپ کی نیک نامی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔

۳۔ یہ فاؤنڈیشن قائم رہے گا لیکن آگے چل کر اس کے اغراض و مقاصد میں کچھ تبدیلی پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔

۴۔ پاک عربین کو آپریٹو بنک کا حشر اچھا نہیں ہو گا لیکن آپ بددل نہ ہوں۔

۵۔ رئیس اکاڈیمی کا مستقبل اچھا ہے۔ آگے چل کر یہ اکاڈیمی کئی اہم کام سرانجام دے گی۔

۶۔ آپ کبھی کسی سیاسی تحریک میں ملوث نہیں ہوں گے البتہ آپ کی ہمدردیاں بعض لوگوں کے ساتھ رہیں گی۔

۷۔ آپ کی صحت انشاء اللہ صحیح رہے گی۔ کسی مہلک بیماری کا امکان نہیں ہے۔

۸۔ ابھی بارہ تیرہ سال تک آپ اپنی عمر کی بالکل فکر نہ کریں۔ بعد میں کچھ حادثات رونما ہونے کا امکان ہے۔

۹۔ آپ اپنے بہت سے منصوبوں میں کامیاب ہوں گے اور آپ کی شہرت بہت پھیلے گی۔

۱۰۔ آپ کی کمزوری آپ کی متلون المزاجی ہے۔

۱۱۔ آپ کی صلاحیت فن شعر گوئی ہے۔

۱۲۔ ارباب اقتدار سے آپ حقیقی فلاح کی امید نہ رکھیں۔

سید محمد حسین رضوی

○

maablib.org

جناب رئیس امروہوی کا
زائچہ ولادت

786
110

تیار کردہ سید محمد حسن رضوی

HOROSCOPE
(INDIAN SYSTEM)

1. Name Syed Muhammad Mehdi (Raees Amrohavi)
2. Father's name Syed Shafiq Hasan
3. Day and date of birth Saturday, 12.9.1914
4. Time of birth 0930 HRS IST. (+5½ zone)
5. Place of birth Amroha (UP) INDIA (Ayanamsha = 22°-40')

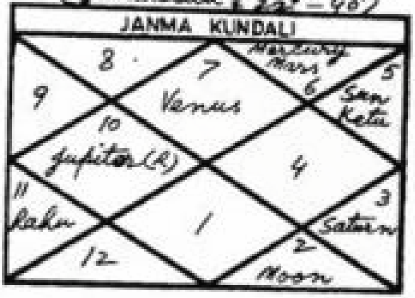

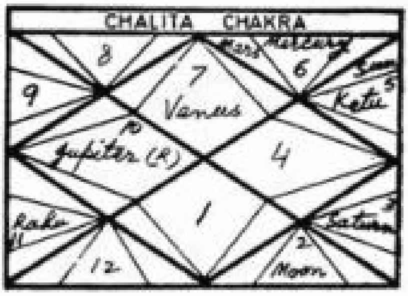

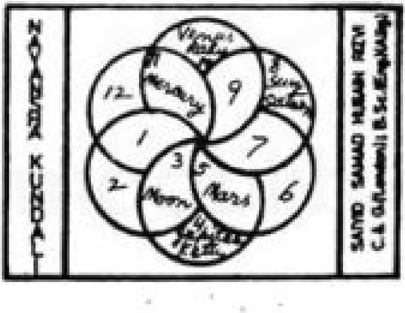

رئیس امروہوی

بقلم خود

اس صدی کی چھٹی دہائی میں راقم الحروف نے پاک و ہند کے مشاہیر کو ایک سوالنامہ بھیج کر ان کے ادبی سفر کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل کی تھیں۔ حضرت رئیس کے یہ حالات اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔

(صہبا)

۳۱ دسمبر ۱۹۶۰ء ۔ کراچی

بھیا ۔ خدا کرے کہ بخیر ہو ۔ زندگی مشین بن گئی ہے ۔ اُدھر آپ مشین ادھر میں مشین ۔ برادرم جون سے آپ کی تازہ ترین خیریت معلوم ہوئی —— تمہیں اگر سوالات کا جواب نہ دوں گا تو کسے دوں گا ۔ برادرانہ محبت اور بے تکلفی جو ٹھہری ۔

س : شاعری کا آغاز کب ہوا ؟

ج : میں ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوا تھا اور چونکہ بزرگوں کا پیشہ شاعری تھا یا زمینداری ۔ لہٰذا انھیں دونوں پیشوں میں مجھے اپنے لیے کوئی کام منتخب کرنا تھا ۔ سو ہوا اتفاق یہ کہ قرعۂ فال شاعری کے نام پڑا ۔ اور میں دس سال کی عمر سے "تُک بندی" کرنے لگا ۔ گویا اب میری شاعری یا تُک بندی کی عمر ماشاءاللہ چشم بددور ۳۶ سال ہے ۔ (اب ماشاءاللہ چونسٹھواں سال ہے ۔ صہبا) "اللہ کرے عمرِ سخن اور زیادہ"

۱۹۳۱ء سے میرا کلام روزنامہ اسد، روزنامہ سرفراز، لکھنؤ۔ ہفت روزہ حمایت اسلام لاہور وغیرہ میں چھپنے لگا تھا۔ اس زمانے میں میرے ایک ہم وطن حیات امروہوی نے حیات کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، اور میں نے اس رسالے میں لکھ لکھ کر خوب خوب ہاتھ کی صفائی کے مواقع فراہم کیے۔ ۱۹۳۴ء میں امروہہ سے مولانا منصور حسین نجم نے رسالہ "ادراک" نکالا تو اس کے صفحات طبع آزمائی کے لیے ہاتھ آ گئے۔

۳۷۔۳۸۔۳۹ء کانگریس کیمپ میں گزرے اور روزانہ اخبارات میں بکثرت سیاسی رنگ کا کلام شائع ہونے لگا۔ رہی نثر؛ تو غالباً میرا سب سے پہلا افسانہ "حیات" میں چھپا تھا اور میں ۱۹۳۶ء میں امروہہ کے دو مقامی اخباروں "قرطاس" اور "مخبر عالم" کا اک طرح سے مدیر بن گیا تھا۔ مجھے شعر و ادب کی صورت میں جو کچھ ملا ہے وہ میرے والد مرحوم علامہ سید شفیق حسن اختر کا عطیہ ہے۔ میری، میرے چچا زاد بھائی کمال امروہوی اور چھوٹے بھائی سید محمد تقی کی ادبی، علمی اور فنی تربیت انھیں مرحوم کے سایۂ شفقت میں ہوئی۔

س : ابتدائی اور آخری تعلیم

ج : تعلیم کی ابتدا، پانچ سال کی عمر سے "خلیفہ جی" کے حضور میں ہوئی۔ کمال امروہوی اور میں دونوں ۱۹۳۰ء تک اپنے ہی گھر پر مختلف استادوں سے اردو، فارسی اور عربی پڑھتے رہے۔ انگریزی بطور خود پڑھی (اور اسی پڑھائی نے صحافتی زندگی میں کام دیا)، لیکن تحصیل کہیں اور کسی علم میں نہ ہو سکی کم سے کم میری۔

میں پچھلے تیس سال سے تقریباً مسلسل لکھ رہا ہوں۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک شوقیہ اور ۱۹۴۰ء سے اب تک بطور پیشہ۔ میری چند کتابیں ضرور شائع ہوئی ہیں مثلاً اقبال پر اک کتاب، قطعات کا مجموعہ، مثنوی لالۂ صحرا، حسین اور حسینیت۔ شعری مجموعے (الف اور پس غبار بھی چھپ چکے ہیں)، لیکن نثر و نظم کی شکل میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا نوے فی صد حصہ محتاج اشاعت ہے اور

جون اس کی اشاعت کا سامان کر رہے ہیں۔ خدا کرے کامیاب ہوں۔

س : زیر ترتیب کتابیں۔

ج : اپنا دیوانِ غزلیات، نظموں کا مجموعہ، ادبی مقالات کا مجموعہ اور دیگر طنزیہ مضامین، فیچر وغیرہ وغیرہ۔ حال میں "انقلابِ فرانس" پر میں نے ایک کتاب لکھی ہے جسے کل ختم کیا ہے۔ یہ دو سو صفحات کی کتاب ہوگی۔ اس کتاب کا مواد ایسی تاریخی کتابوں سے لیا گیا ہے جو بالعموم مطالعے میں نہیں رہتیں۔

س : ادبی نقطۂ نظر۔

ج : کسی منظم مکتبۂ فکر سے غیر متعلق رہنے کے باوصف میرا ہمیشہ سے ایک ہی تخلیقی نقطۂ نظر رہا ہے اور وہ یہ کہ شعر نہ تو کوئی غیر مادّی نتیجۂ فیضان ہے اور نہ محض تقلیدی اسلوبِ بیان۔ اگر شاعر یا فن کار محض اپنے "داخل" اور "اندرون" میں گم ہو کر رہ جائے اور سماجی تضادات، معاشی طبقوں کی کش مکش، سیاسی نظریوں کی آویزش اور جدید تاریخی تحریکوں، سائنسی انکشافات اور فلسفی مکاتبِ فکر کو نظر انداز کر کے حُسن اور عشق (اور وہ بھی آسمانی و جاودانی قسم کا حُسن و عشق) اور محض حُسن و عشق کو اپنا نظریۂ فن قرار دے لے تو کم سے کم میں اسے ایسا شاعر یعنی چوتھائی فن کار سے زیادہ ماننے پر تیار نہ ہوں گا۔ ہر تخلیقی فن کار کو تاریخ کا آلۂ کار بلکہ صحیح لفظوں میں موسم پیما ہونا چاہیے اور اپنی شاعری کی بنیاد گرد و پیش کی زندگی کی سطح پر رکھنی چاہیے ورنہ وہ شاعر نہیں۔ روایتی بھانڈ اور فنی میراثی ہے۔ "غزل" میری محبوب ترین صنفِ سخن ہے نظم کی طرح، لیکن گل و بلبل، شمع و پروانہ اور قفس و زنداں کی غزلوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ محض فنی روایات کی جگالی، محض اساتذہ کے مضامین کی چوری۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ کوئی شاعری ہے۔ (یہ عہد سخت سماجی کش مکش کا عہد ہے۔ جو شاعر اس سماجی کش مکش کی روح سے واقف نہیں۔ اسے ہضم نہیں کر سکا، نہ وہ شاعر ہے نہ انسان) جی چاہتا تھا کہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھوں۔ مگر

میرے خیال میں ایک کتاب سے کم پر ذہن سمجھوتہ نہ کرے گا۔ لہذا اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

مزید ادبی و علمی تفصیلات ؛ یہی سوال ہے نا۔ تفصیلات کیا عرض کروں ۔ میں بیس سال سے صحافت، خصوصیت کے ساتھ روزناموں کی دنیا میں ہوں - نیوز سے لے کر ریویوز اور خبر سے لے کر نقد و نظر تک، صحافت کے ہر میدان میں دوڑتا رہا ہوں ادبی سرگرمیوں کے لیے وقت کہاں ؛ بایں ہمہ - اردو و فارسی کی ہر صنف سخن میں لکھا ہے ۔ نثر میں فلمی اور ریڈیائی ڈراموں سے لے کر تاریخی اور مذہبی شالوں تک (سیاسی شذرہ نویسی تو پیشہ ہی ٹھہری) اور نظم میں ناٹک کے گیتوں سے شروع کر کے غزل، قصیدہ، مثنوی، ساقی نامے، مسدس، مخمس وغیرہ وغیرہ سے گزر کر سہرے اور سہاگ تک اس مقدار و تعداد میں لکھے ہیں کہ مجھ پر نفرین اور میری محنت پر آفرین۔

تمہیں میری جان کی قسم افکار سے محروم مت رکھو۔ ایک پرچہ ضائع ہی سہی۔ لیکن ایک دیرینہ مخلص کی تشفی خاطر کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے دیرینہ مخلص کی سرگرمیوں سے باخبر رہے۔

اچھا میرے پیارے اب رخصت ۔ تم مجھے اپنا بھائی سمجھو سنہ ۱۹۴۰ء سے اب تک کے تعلقات، بیس سال کے مراسم بہت بڑی نعمت ہیں ۔ خدا شاہد ہے کہ ہمیشہ تمہاری ادبی خدمات، قلمی جہاد اور صحافتی تگ و تاز کا مداح رہا ہوں اور رہوں گا ---- کوئی خدمت۔

رئیس امروہوی

رئیس کی کہانی — رئیس کی زبانی

رئیس امروہوی نے ۲۶ مارچ ۱۹۷۶ء کو اپنی سوانح اور زندگی کے چند خاص واقعات اور اپنے پسندیدہ اشعار ریکارڈ کرائے تھے اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ یہ ٹیپ ان کی وفات کے بعد نشر کیا جائے۔

رئیس صاحب کے ایک نیازمند محمد یوسف القادری نے ہمیں اس ٹیپ سے رئیس صاحب کی گفتگو قلمبند کر کے اشاعت کے لیے فراہم کی ہے جس کے لیے ہم یوسف صاحب کے شکر گزار ہیں۔ رئیس صاحب نے اس خود بیانیے میں اپنے بچپن سے متعلق کئی نئی باتیں بیان کی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

(صہبا)

میں نے ایک شعر کہا تھا ؎

کہاں ہم اختتامِ نغمہ کے بعد
اگر ہوں گے تو صرف آواز ہوں گے

جب آدمی فنا ہو جاتا ہے تو اس کی آواز باقی رہ جاتی ہے اور ہمارے متقدمین

ہم سے پہلے جو لوگ آئے تھے، ان کی آواز بھی اس فضا میں موجود ہے ۔ آج میں اپنی زندگی کے چند خاص واقعات اور چند اشعار آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ خدا جانے سننے والے کون ہوں گے ۔ بہر حال میں تو یہی کہوں گا ؎

اختتام نغمہ کے بعد اگر ہوں گے تو صرف آواز ہوں گے

میرا نام سید محمد مہدی عرف اچھن اور تخلص رئیس امروہوی ہے ۔ میرے والد کا نام علامہ سید شفیق حسن ایلیا مرحوم ہے ۔ والدہ کا نام نرجس خاتون ہے ۔ میری ولادت امروہہ میں ہوئی ۔ امروہہ شمالی ہند یوپی میں مراد آباد کے ضلع میں ایک تحصیل ہے ۔ دہلی سے اسّی میل مشرق کی طرف ۔ وہاں پر سادات کی ایک آبادی ہے جو سات آٹھ سو برس سے امروہہ میں آباد ہے ۔ اسی سلسلے سے میرا تعلق ہے ۔ میرے خاندان میں پہلے زمینداری ہوتی تھی، لیکن تین چار پشتوں سے شاعری کا ذوق نمایاں طور پر موجود ہے ۔ میرے والد بھی شعر کہتے تھے ۔ مجھ سے چھوٹے بھائی سید محمد تقی مشہور فلسفی ہیں ۔ ان سے چھوٹے سید محمد عباس ہیں جو عالمی ڈائجسٹ نکالتے ہیں (اب وہ ماہنامہ فانوس نکال رہے ہیں) ۔ ان سے چھوٹے جون ایلیا ہیں جو بہت عمدہ اور صاحب طرز شاعر ہیں ۔

اس سے پہلے کہ میں چند واقعات بیان کروں، چند شعر عرض کر دینا چاہتا ہوں ۔ چند شعر ہیں غزل کے ۔ میں ترنم سے نہیں پڑھتا ہوں، لیکن آج جی چاہتا ہے کہ میری آواز بھی ترنم میں ریکارڈ ہو جائے ۔ اگرچہ مشق نہیں ہے ؎

آیا وہ مستِ نازک خرامی
نذرانہ جس کا جانِ گرامی
مخمور آنکھیں، لبریز ساغر
سرشار نظریں کیفِ جوانی
ابرو کا مصرعِ غالب کا مطلع
روئے کتابی دیوانِ جامی

آیا وہ آیا اے دل وہ آیا
بادِ سحر تھی جس کی پیامی
لہرا رہا ہے دریائے بادہ
مجرا بجا لائے تشنہ کامی
ہم تیری ذاتِ والا پہ والا
ہم تیرے نامِ نامی سے نامی

میری ابتدائی تعلیم و تربیت میرے دادا سید نصیر حسن صاحب مرحوم کی نگرانی میں ہوئی۔ اس زمانے میں مکتبوں کا رواج تھا اور خود ہمارے گھر میں ایک مکتب ہمارے لیے کھولا گیا۔ جس میں میں اور میرے چچازاد بھائی کمال امروہوی جو ہندوستان کے مشہور فلم ساز و ہدایت کار ہیں۔ ان کی فلم پکار، محل، پاکیزہ وغیرہ جیسی فلمیں عالمگیر شہرت رکھتی ہیں۔ شریک ہوتے تھے۔ خلیفہ جعفر حسین صاحب ہمارے پڑھانے پر معمور کیے گئے غالباً جولائی ۱۹۱۹ء تھی شاید۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلافت تحریک بڑے زور و شور سے چل رہی تھی۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی برادران پورے ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے اور گاندھی جی بھی شوکت علی محمد علی برادران کے پیچھے پیچھے میدانِ سیاست میں آگے بڑھ رہے تھے۔ تو شروع ہی سے میرے مزاج نے سیاسی ہنگامے اور جلوس دیکھے اور یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ میں نے مولانا محمد علی مرحوم کو دیکھا۔ شوکت علی کو دیکھا، حسرت موہانی کو دیکھا، ظفر علی خاں کو دیکھا اور ان تمام لوگوں کو دیکھا کہ جو آج تاریخ ساز شخصیتیں کہلاتی ہیں۔ قائد اعظم گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے ساتھ کام بھی کیا۔ بہرحال وہ تمام چیزیں یاد آتی ہیں تو دل پر عجیب و غریب کیفیتیں گزر جاتی ہیں سہ

بتا کیا کیا تجھے اے شوقِ حیراں یاد آتا ہے
وہ جانِ آرزو، وہ راحتِ جاں یاد آتا ہے

وفورِ شوق سے خود ہاتھ اپنے چوم لیتا ہوں
وفورِ شوق میں جب ان کا داماں یاد آتا ہے
بہت کچھ یاد آتا ہے رئیس ان کی جدائی میں
مگر جیسے کوئی خوابِ پریشاں یاد آتا ہے

بچپن کی یادیں، آرزوؤں، اُمنگوں، حوصلوں، ناکامیوں، حسرتوں، کامرانیوں سے معمور ہوتی ہیں۔ بچپن ہی سے قدرت نے مجھے بڑا تیز ذہن دیا تھا، اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میری عمر چودہ سال کی تھی اس وقت میں نے طلسم ہوشربا کی طرز میں ایک کہانی شروع کی تھی اور وہ کہانی میں مہینوں، سالوں تک سناتا رہا تھا اور ہر روز تازہ دم ہو کر بیٹھتا تھا اور وہیں سے سلسلہ شروع کر دیتا تھا جہاں سے چھوڑتا تھا۔ اس کے اندر بادشاہوں کی جنگ، عمرو عیار کی جنگ، افراسیاب اور فلاں فلاں جیسیوں قسم کے ہنگامے شامل ہوتے تھے۔

فارسی کی طرف میرا رحجان بچپن ہی سے تھا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں فارسی میں شاعری جاری رکھتا اور اب تک کہتا ہوتا تو یقیناً برِ کوچک پاک و ہند کے اچھے شعراء میں میرا شمار ہوتا تھا جب میں سوچتا ہوں کہ کس عمر سے میری یادداشت شروع ہونی چاہیے تو سات آٹھ سال کی عمر سے میری یادداشت ہونی چاہیے۔ اب جب کہ میری عمر باسٹھ سال کی ہے تو یوں مجھے چھپن سال کے واقعات اگر میں سوچ لوں تو میرے ذہن میں آسکتے ہیں۔ ۲۱-۱۹۲۰ء کے کئی ایک واقعات کی جھلکیاں میرے سامنے کبھی کبھی آتی ہیں۔ بہرحال میں نے سب سے پہلا شعر کب کہا۔ اس کا ذکر میں نے اپنے دیوان میں بھی کیا ہے۔ غالباً ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۶ء کے درمیان کسی وقت میں میں نے پہلا شعر کہا تھا اور وہ پہلی غزل جو میں نے کہی تھی وہ اپنے دیوان میں چھاپ دی ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

جب طبیعت میری گھبراتی ہے
دل دہی کو تیری یاد آتی ہے

یا تو کچھ میں ہی غلط سمجھا ہوں
یا حقیقت میں بہار آتی ہے

بہرحال امروہہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ یعنی ہم ترقی کی نسبت سے کہہ سکتے ہیں لیکن قصبات کی نسبت سے بڑا سا تھا۔ اس لیے کہ اس کی آبادی تقریباً اسّی ہزار تھی، تو وہاں پر مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے زمانے میں ہوتا یہ تھا کہ یا تو شاعری کیا کرتے تھے یا شطرنج کھیلتے تھے یا زمینداری میں لگے رہتے تھے۔ ہمارے بزرگوں کا انحصار بھی زمینداری پر ہی تھا۔ میری طبیعت انقلابی واقع ہوئی تھی اور وہ زمینداریاں بھی ختم ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ مجھے بہت ہی بچپن میں تمنا تھی کہ میں انجن ڈرائیور بنوں۔ وہ مجھے ایک حیرت انگیز ڈرامیٹک معلوم ہوتا تھا کہ ایک آدمی گاڑی پر سوار ہے اور وہ انجن کو لیے جا رہا ہے۔ دیاسلائیوں کے خالی ڈبے جمع کر کے ریل بناتا تھا۔ دیواروں پر دوڑنے بھاگنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ درختوں پر لٹکنا بڑا محبوب مشغلہ تھا۔ اس زمانے میں میں بڑا ناز پروردہ تھا۔ میرے کان اب تک چھدے ہوئے ہیں۔ کان میں سونے کا بندہ پہنتا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہ لڑکا جس کے کان میں سونے کا بندہ ہے یہ بہت زیادہ ناز و نعم میں پلا ہے اور اپنے گھر والوں کو پیارا ہے۔ اب وہ بندہ تو جانے کہاں غائب ہو گیا ہے، لیکن کان میں سوراخ اب تک اپنے مقام پر قائم ہے۔ والدہ کا بڑا لاڈلا تھا لہٰذا ان کا بڑا محبوب تھا۔ دادا صاحب بھی محبت کرتے تھے۔ میرے تایا اور خالو یعنی میرے والد کے بڑے بھائی سید نفیس جس کے کوئی اولاد نہیں تھی اور ان کی بیوی میری والدہ کی بڑی بہن تھیں۔ انھوں نے مجھے پال لیا۔ لہٰذا دوہرے پیار کی بازی شروع ہوئی یعنی ایک والدین اور ایک تایا یا خالو یا خالہ تو عجیب و غریب زمانہ تھا وہ۔

امروہہ کے اندر ایک ڈرامیٹک سوسائٹی تھی جس کا نام تھا "بزم حق نما"۔ اس "بزم حق نما" میں ہم ڈرامہ بے انتہا شوق سے دیکھتے تھے۔ اس کی تقلید میں میں نے بھی ڈرامے لکھے۔ "کارنامۂ حق" شاید اس ڈرامے کا نام تھا جو میں نے لکھا تھا۔ سترہ اٹھارہ

برس کی عمر میں شاہزادہ ایران کا پارٹ ادا کیا تھا۔ "ساقی والے آگئے" "دیر و حرم سے جھوم جاؤ" "شراب ناب نہ ساغر پلا کے جھوم جاؤ" "جناب عالی ۔ حاضر ہے جناب پرتگالی" "ہاں شراب لاؤ" "شراب لا کر زمانہ خراب ہے ساقی" اس قسم کے مکالمے بولنے میں بڑا لطف آتا تھا ہمیں ۔ اس زمانے میں امروہہ وغیرہ میں فلم نہیں تھی بلکہ "عالم آرا" جو کہ ہندوستان کی پہلی 'ناطق' بولنے والی فلم تھی ۔ شاید ۱۹۳۲ء میں آئی ۔ البتہ تھیٹر کا رواج تھا اور امروہہ میں شاید کوئی تھیٹر باہر سے نہیں آیا تھا، بلکہ ہم ہی لوگوں نے ایک مصنوعی تھیٹر بنا دیا تھا ۔ ہم نے اپنے گھر میں تھیٹر کا سامان کیا یعنی یہ کر بانس کھڑے کرکے ان پر رضائیاں ڈالی گئیں ۔ ان پر پردے بنائے گئے ۔ ایک پیسہ ٹکٹ مقرر کیا ۔ سید محمد تقی ٹکٹ چیکر بنائے گئے اور تمام محلے کے اندر یہ مشہور کہ کریکٹر ایکٹر اچھن یعنی میں اور مشہور کریکٹر ایکٹر جدن یعنی کمال امروہوی اور فلاں فلاں ڈرامے میں حصہ لے رہے ہیں ۔ چھبن یعنی سید محمد تقی سے کچھ پیسے جمع کرنے میں کیا غلطی ہوئی یا کیا قصہ ہوا کہ میں نے انھیں پیٹ دیا ۔ خیر وہ ڈراما بہت کامیاب ہوا جس کے اندر کوئی بچیس تیس چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے تھے ان کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تالیاں بجا کر داد دینی چاہیے ۔

دورِ جوانی کے تین چار چہرے مجھے یاد آتے ہیں ؎

بتا کیا کیا تجھے اے شوقِ حیراں یاد آتا ہے
وہ جانِ آرزو، وہ راحتِ جاں یاد آتا ہے
اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں تو رہ رہ کر
ڈوبتے ستاروں کا چراغاں یاد آتا ہے

وہ عمر ہی ایسی تھی ۔ اب وہ میرے لیے مر چکے ہیں ۔ وہ نسوانی چہرے انھوں نے مجھے اپنی طرف کھینچا، لیکن خدا شاہد ہے مجھے کبھی اظہارِ محبت کی جرأت نہیں ہوئی اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میں شادی سے قبل تک میں عورت کے حسن سے متاثر تو تھا، لیکن واقف نہیں تھا کہ مرد و عورت کے تعلقات کیا ہوتے ہیں ؟ اس زمانے

کے ماحول کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ جب ہم باہر جاتے ملازم ساتھ ہوتا تھا۔ جب میں میرا چہرہ گلنار ہو رہا تھا تو میرے سر کے بال بھی کاٹ دیے گئے تھے تاکہ اس حُسنِ گراں پوشش میں کمی ہو گی جو لوگوں میں محسوس ہوتا تھا۔ بابا مرحوم، بڑے ابا مرحوم اس بات کی بڑی احتیاط اور دیکھ بھال رکھا کرتے تھے کہ کہیں لڑکے بدذات نہ ہو جائیں۔ بچّے کو ڈرایا جاتا تھا۔ دیکھنا خبردار غلط راہ پر نہ جانا، نہیں تو آسمان پھٹ پڑے گا اور تمام فرشتے لعنت بھیجیں گے۔ اللہ کا چہرہ غصّے سے لال ہو جائے گا اور طرح طرح کے اشاروں، کنایوں سے ڈرا دیے جاتے تھے، تاہم میں ایک چیز عرض کر دوں کہ اس زمانے کے باشعور نوجوانوں میں جنسی جذبے کا رُخ انقلابی تحریک نے موڑ دیا تھا۔ نہ ریڈیو نہ ٹی۔وی۔ قوالی ہو گئی، مجرا ہو گیا یا عورتوں نے گیت گا لیے۔ اب تو چوبیس گھنٹے جہاں آپ جائیں گے لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں، گانے ہو رہے ہیں، انگلش رقص ہیں۔ اس وقت سادہ زندگی تھی بجلی نہیں آئی تھی،—— لالٹینیں جلتی تھیں، ہنڈے جلتے تھے، غریب گھروں میں دیے جلتے تھے۔ میری زندگی کی خصوصیت یہ ہے کہ میں کبھی مذہبی نہیں ہوا، لیکن میں کبھی بد اخلاق نہیں رہا یعنی مذہبی نہ ہونے کے یہ معنی نہیں تھے کہ میں کسی گناہ پر جسے مذہب یا اخلاق یا سماج یا معاشرہ گناہ کہتا ہے راغب ہوا، لیکن مجھے یہ تعصب اور تنگ نظری بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ بھئی لوگوں میں یہ مخالفت کیوں ہے؟

لڑ مرتے ہیں اختلافِ عقائد پہ لوگ کیوں؟

آج تک بحمد اللہ میرے ذہن میں کسی فرقے، کسی مذہب، کسی قوم، کسی نسل، کسی شخص کے خلاف نفرت و تعصب پیدا نہیں ہوا۔ جذبہ ہے تو بس یہی ہے کہ میں لوگوں کے کام آؤں۔

میری شادی جون ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں چند مہینے کے لیے حیدر آباد (دکن) چلا گیا۔ وہاں سے آیا تو دیکھا کہ ہندوستان انقلاب کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ ایک طرف اُبھرتی ہوئی مسلم لیگ، ایک طرف کانگریس۔ چنانچہ ہماری انقلابی

طبیعت ہم کو کانگریس کی طرف لے گئی ۔ یہ عرض کردوں کہ ہمارے دادا مرحوم سیّد نصیر حسن کے دو تین گاؤں تھے ان میں گاؤں کا دارالحکومت جعفر آباد تھا ۔ وہاں ہم زمیندار کی حیثیت سے تو گاؤں میں جاتے ہی تھے، لیکن اب جو ہم جانے لگے تو کانگریس کے ورکر کی حیثیت سے، لیکن رفتہ رفتہ ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہماری جگہ کانگریس میں نہیں مسلم لیگ میں ہے ۔ میں قدرتی طور پر شعروادب کے لیے پیدا ہوا تھا، لیکن میرے دماغ میں کئی خلیے ہیں اُن میں سیاست کا خانہ بھی تھا، سیاسی شعور بھی تھا، انقلابی جذبہ بھی، تو ہم مسلم لیگ میں آگئے ؎

یاد رکھنا، وقت کا فرمان ٹل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں

یہ شعر پورے ہندوستان میں گونج رہا تھا ۔ اوّل تو یہ بیان کردوں کہ میں ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں تو نہیں تھا مرادآباد میں تھا، لیکن کئی قافلے یوپی سے لاہور جارہے تھے ۔ جب ہم نے سنا کہ قرارداد پاکستان پیش کی جائے گی تو عجب قیامت ہندوستان میں مچ گئی ۔ تمام اخبارات میں شور ہوگیا ۔ اس زمانے میں ہم پوری طرح مسلم لیگ میں جذب ہوچکے تھے ۔ یوپی کے دو تین اخبار مسلم لیگ کے بھی تھے، جن میں "جدت" مرادآباد کا تھا اور میں "جدت" روزنامے کا ایڈیٹر تھا اور "مسافر" کا بھی۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں راوی کے کنارے یہ ریزولیشن پاس کیا گیا تھا کہ برِ کوچک کی تقسیم دو مملکتوں میں کی جائے، اسے قرارداد پاکستان کہتے ہیں ۔ سب سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ ان صوبوں کے مسلمانوں نے عمل کیا جو کہ اقلیت میں تھے یعنی یوپی، سی پی، بہار، اڑیسہ، میسور، مدراس، حیدرآباد، بھوپال، دہلی کا علاقہ، اجمیر، جودھپور وغیرہ اور یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کی یونینسٹ گورنمنٹ برسرِ اقتدار تھی ۔ سرحد کے اندر کانگریس کا اثر تھا ۔ سندھ کے اندر زمیندار پارٹی تھی جس میں خان بہادر اللہ بخش اور جی ایم سیّد وغیرہ شامل تھے اور بنگال میں کرشک سرامک پارٹی تھی جس کے فضل حق، پرشاد مکرجی رہنما تھے ۔ اس کے معنی

یہ تھے کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے اندر تو جوش تھا، لیکن جو اکثریتی صوبے مسلمانوں کے کہلاتے تھے جیسے پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد یا بنگال، یہاں پر غیر مسلم لیگی حکومتیں برسر اقتدار تھیں، غیر مسلم لیگی وزارتیں قائم تھیں۔ میں نے اپنے بچپن میں یہ دیکھا تھا جب جلوس نکلتے تھے، یوپی کے اندر مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی کی اماں کا یہ کہنا کہ "بولی یہ اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو" حالانکہ وہ خلافت ٹرکی میں قائم تھی۔ بلقان کی جنگ ہوئی، ہندوستان کے مسلمانوں میں آگ لگ گئی۔ یہ معلوم ہوا کہ ہم پر حملہ کر دیا۔ یہ ایک آئیڈیلزم ہے ہمارے اندر اور ہمیں اس آئیڈیلزم پر فخر بھی ہے۔

۱۹ راکتوبر ۱۹۴۷ء کو میں کراچی آیا۔ میری جیب میں پینتیس روپے تھے۔ ہماری کوئی خواہش نہیں رکی۔ زندگی بھر ہم نے ایسی کوئی خواہش ہی نہیں کی جو ہمارے امکان سے باہر ہو۔ مجھے بہت عمدہ کھانے، بہت عمدہ پہننے کی بھی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ایک متوسط طبقے کے آدمی کی خواہش ہی کیا۔ میں نے کبھی امر وہہ میں بیڑی نہیں پی۔ جب کہ ہماری تین چار پشت قبل کافی جائیداد تھی۔ یہ کہنا کہ ہمارے ہاں ہاتھی جھولتے تھے یا دودھ یا شہد کی نہریں بہتی تھیں جھوٹ ہے۔ جب میں یہاں (پاکستان) آیا ہوں ہاشم رضا صاحب جو میرے عزیز بھی ہیں ڈپٹی کمشنر تھے۔ کاظم رضا صاحب انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ ہاشم رضا صاحب کی ایک بہن میرے ایک عزیز سید تصور حسین نقوی کو جو رامپور میں ڈائرکٹر ایگریکلچر تھے، ان کو بیاہی ہوئی تھیں، لیکن میں نے ان سے کوئی الاٹمنٹ نہیں لیا۔ پہلے ہم مارٹن کوارٹرز میں آ گئے۔ وہاں کوارٹر بن رہے تھے۔ تقی جنگ کے ایڈیٹر تھے۔ میں غالب کا ایڈیٹر تھا۔ کراچی بھرا نہیں تھا۔ مہاجرین کے قافلے آ رہے تھے۔ سب کچھ تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ کی وجہ سے فلاں یہ ہو گیا۔ بہر حال ایک ساکھ ہے مزاج کی، بیروی نہیں کر سکتے کسی کام کی۔ ایکسپورٹ پرمٹ ہی لے لیتا یا میجر حسن سے اتنے تعلقات تھے چار پانچ کوارٹر ہی بک کروا لیتا پیر کالونی میں، ناظم آباد میں۔ سندھ میں زمینیں خالی

پڑی تھیں، بحالیاتی کمشنر سے کہہ کر کہ صاحب دو سو ایکڑ زمین ہمیں بھی دے دیجیے، خیال بھی نہیں پیدا ہوا ان چیزوں کی طرف، جب کہ میری سفارش سے بہت سے لوگ فائدے میں رہے ۔ نہ جانے کیوں طبیعت اس طرف نہ آئی ، اس کا مجھے آج تک کوئی رنج نہیں ۔ جب کلیم منظور ہوئے تو اس زمانے میں ہم کھارادر کے ایک معمولی فلیٹ میں رہتے تھے ۔ یہ کہنا کہ میں پچیس روپے لایا تھا اور تقی شاید پانچ سو روپے لائے ہوں ۔ آتے ہی یہ جنگ میں ہو گئے کیوں کہ یہ جنگ کے ایڈیٹر وہاں بھی تھے ۔ میں جن اخباروں کا ایڈیٹر تھا، وہ اخبار ہی یہاں نہیں آئے ۔ یہاں پر ہم نے آ کے غالب نکالا حکیم محمد تقی اس کے مالک تھے ۔ کیا کبھی میں نے کراچی میں فاقہ کیا؟ ایک فاقہ مجھے یاد ہے ۔ شکل یہ تھی کہ اب تک میریٹ روڈ پر بمبئی ہوٹل ہے ۔ وہاں ہم بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے ۔ ایک روز ایسا ہوا کہ وہ تھی گیارہویں شریف ۔ پیسے نہیں تھے ۔ دوپہر کا وقت مانگیں کس سے ، اس لیے کہ ہر شخص اپنی طرح غریب ہے، خستہ حال ۔ ہوٹل کے مالک نے بھائی کے انتقال پر مرثیہ لکھوایا تھا ۔ انھوں نے پیسے دینے چاہے جو نہیں لیے، جس کی وجہ سے اس ہوٹل میں چائے کے سلسلے میں رعایت ہو گئی کہ اب ہمارا حساب چل سکتا ہے ۔ ان سے لینے کو طبیعت نہ چاہی میری ۔ اب بج گیا ڈیڑھ ، اور وہ جو بھوک حقیقی کہتے ہیں جسے ۔ وہ زندگی میں پہلا موقع تھا ۔ خدا کرے کہ آئندہ اس قسم کا تجربہ نہ ہو ۔ آدمی خود کھانا چھوڑ دے تو چھوڑ دے ۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ خورشید اعجاز چلے آ رہے ہیں بھاگے بھاگے ، جو آج کل "مشرق" میں سرکولیشن منیجر ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ صاحب آج گیارہویں شریف ہے ، اور نیاز ہے چلیے ۔ تو رکشہ وکشہ تو اس زمانے میں تھی نہیں، ہم وکٹوریہ میں بیٹھ کے پہنچے ۔ تو ان کے ہاں جو پلاؤ کھایا ہے گیارہویں شریف کا دن کے تین بجے ، اس کا لطف و لذت اب تک یاد ہے ؎

بہت کچھ یاد آتا ہے رئیس ان کی جدائی میں
مگر جیسے کوئی خواب پریشاں یاد آتا ہے

میری یادداشت ۱۹۱۳ء سے شروع ہوتی ہے اور میں نے اسی زمانے میں مشاعروں

میں حصّہ لینا شروع کیا اور بہت قلیل عرصے میں، میں ایک بہت ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر کی حیثیت سے امروہہ میں متعارف ہوگیا۔ آپ نے حیات امروہوی کا نام سُنا ہوگا۔ وہ میرے ساتھ کے شاعر تھے۔ یہ غزل جو ہے کہ سے

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

بج رہا ہے اور بے آواز ہے

(رئیس صاحب نے انتہائی درد و کرب میں ڈوبے ترنّم سے پوری غزل سنائی)

مجھے مشاعروں میں جانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ رامپور میں جو خاص مشاعرے نمائش وغیرہ کے ہوتے تھے وہاں پر جاتا تھا۔ کوئی ذریعہ معاش شاعری کو نہیں بنایا۔ قلم کو بنایا، صحافت کو بنایا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اسی زمانے میں میں "مسافر" اور "جدّت" روزنامے کا ایڈیٹر تھا۔ "مخبر عالم" میں لکھتا تھا۔ "پبلک گزٹ" میں لکھتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری صحافتی زندگی ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی تھی جب امروہہ کے ماہنامہ "حیات" میں جس کے جوہر مرحوم ایڈیٹر تھے پہلا افسانہ چھپا تھا "سنگ تراش"

۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو میری قطعہ نگاری کا آغاز ہوا[ﻠﻪ]۔ وہ قطعات جنھیں آپ بڑی حیرت سے پڑھتے ہیں بینتیس سال تک کیسے قطعات کہے، اس کی ابتدا بڑی معمولی تھی۔ دلّی سے اطلاع آئی کہ گاندھی جی قتل کر دیے گئے۔ جنگ کا ضمیمہ شائع ہوا۔ انھوں نے کہا کہ صاحب دو تین مصرعے بھی کہہ دیں سے

جس نے اُمید زیست تھی باندھی

لے اُڑی اس کو موت کی آندھی

گولیاں کھا کے، گالیاں کھا کے

چل بسے اُف مہاتما گاندھی

○

ﻠﻪ روزنامہ جنگ کراچی میں اس قطعے سے قطعہ نویسی کی ابتدا ہوئی۔

رئیس امروہوی

بنظرِ خود و بقلمِ خود

مجھ سے کہا گیا ہے کہ اپنے بارے میں کچھ لکھو! ــــــ میں اپنے بارے میں کیا لکھوں؟ کوئی چیز ہے جو مجھے اندر سے روکتی ہے۔ سرزنش کرتی ہے، جھڑکتی ہے کہ اپنے بارے میں کچھ نہ لکھو۔ اپنے متعلق کچھ نہ کہو! شاید کوئی نفسیاتی گرہ ہے جو ذہن کو پابہ زنجیر کیے ہوئے ہے پھر خیال آتا ہے کہ دوستوں کی فرمائش ہے تو مجھے کچھ نہ کچھ اپنی شخصیت اور فن کے بارے میں ضرور لکھو جانا چاہیے کہ آزردن دل دوستاں جہل ہے و کفارۂ یمین سہل! شاید پھر یہ موقع ملے یا نہ ملے۔ امکان قوی یہی ہے کہ نہ ملے۔ البتہ ایک بات ہمت بڑھاتی ہے۔ یہ کہ

فرشتہ بماند سیہ بر سفید

نویسندہ را نیست فردا امید

شاید لکھنے والے کے بارے میں یہ تحریر باقی رہ جائے ــــــ میرا نام ہے محمد مہدی۔ والد مرحوم کا اسم گرامی تھا سیّد شفیق حسن۔ وہ ورد تخلص فرماتے تھے۔ اختر اور ایلیا (حضرت عیسیٰ کا مشہور فقرہ ہے جو انھوں نے صلیب پر ارشاد فرمایا تھا۔ ایلی ایلی لما سبقتنی (اے اللہ! تو نے مجھے کیوں اکیلا چھوڑ دیا) یہ ایلیا اسی ایلی سے ماخوذ ہے۔ دہلی سے ۸۰ میل مشرق میں اور لکھنؤ سے ڈھائی سو میل مغرب میں ایک بستی ہے (میرے خیال میں ایک بستی تھی) امروہہ۔ ہمارے آباؤ اجداد حجاز، عراق، ایران اور افغانستان کے بیابانوں اور شورہ زاروں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے خاندان تغلق کے عہد میں ملتان پہنچے۔ جدّاعلیٰ کا نام سیّد حسین شرف الدین

تھا۔ جنھیں شاہ ولایت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک خاندانی تذکرے میں لکھا ہے (ولایتش از گنگ تا سنگ بود) (ان کی ولایت کا دائرہ دریائے گنگا سے کوہ ہمالہ تک محیط تھا۔ حضرت کا مزار مبارک امروہے کے مغرب میں واقع ہے۔ احاطۂ مزار میں بچھو ڈنک نہیں مارتے۔ حضرت کی یہ کرامت مشہورِ عام ہے) درگاہ شریف کی حدود میں بچھو کا ڈنک نہ مارنا۔ گویا اپنی فطرت سے بغاوت کرنا ہے سہ

نیشِ عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

اس غیر طبعی مظہر کی کیا تاویل کی جائے گی؟ مجھے نہیں معلوم! آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال قبل (میرے بچپن میں) اجمیر شریف کی طرح امروہے کو امروہہ شریف کہتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یہاں سادات (نقوی، زیدی، رضوی، تقوی وغیرہ اور شرفا کے متعدد خاندان) آباد تھے۔ سادات میں غالب اکثریت امام علی نقی علیہ السلام کی اولاد یعنی نقوی برادری کی تھی۔ سادات میں باہم رشتہ داریاں بھی تھیں۔ ہماری برادری میں سنّی بھی شامل تھے شیعہ بھی۔ اور بحمداللہ اب تک یہی حال ہے۔ یہ سب دانے ایک ہی تسبیح فاطمہ میں پروئے ہوئے تھے۔ شاہانِ دہلی کے زمانے میں سادات و شرفا کا ذریعۂ معاش اور وسیلۂ اعزاز شاہی منصب داریاں تھیں۔ سادات بارہہ کی طرح سادات امروہہ "بادشاہ گر" کا تو اعزاز نہ پا سکے۔ البتہ منصب دارانِ شاہی کی فہرست میں ان کے نام نمایاں مقام پر درج تھے۔ بہت سے خاندانوں کو نسلاً بعد نسلاً جاگیریں (معافیاں) ملی ہوئی تھیں۔ معافی جائداد کی وہ قسم ہے یا قسم تھی جس پر غالباً مالگذاری اور محصول معاف ہوتا ہے اور یہ جائداد حینِ حیات تک نہیں، نسل در نسل کے لیے ہوتی ہے۔ ہمارے پردادا سیّد امیر حسین امیر مرحوم کی الماری میں کئی بوسیدہ شاہی فرامین کے علاوہ ایک خریطہ بھی تھا جس میں معافی کے غالباً "ستر اسّی" دیہات کے رقبے اور مقام درج تھے۔ یہ جائدادیں "بسلسلۂ حسنِ خدمات" بزرگوں کو ملی تھیں۔ یہ "ستر اسّی" گاؤں کہاں غارت ہوگئے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہمارے بزرگ اس قسم کے رنڈی باز اور عیاش بھی نہ تھے کہ اپنی جاگیر کسی کنچنی کی نذر کر دیتے۔ جب میں نے

ہوش سنبھالا ہے تو ہماری ملکیت میں صرف ایک گاؤں رہ گیا تھا۔ موضع جعفر آباد بست لسوے (یعنی سالم) جعفر آباد کو بھی دادا مرحوم سید نصیر حسن نصیر بیچ کر کھا گئے۔ قصہ کوتاہ گشت دانہ در بہ بسیار بود۔

ہماری برادری میں صاحبانِ سیف بھی تھے اور صاحبانِ قلم بھی۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ان کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں قلم رہتا تھا۔ امروہہ کبھی شعراء سے خالی نہیں رہا۔ اردو کے (غالباً) پہلے مثنوی نگار سید اسمٰعیل امروہے کے رہنے والے تھے۔ یہ عرض کرتا چلوں کہ میں اردو ادب کا محقق اور مورخ نہیں ہوں کہ وثوق سے اس سلسلے میں کوئی بات کہہ سکوں میر محمد تقی میرؔ نے اپنے تذکرے میں سید سعادت علی امروہوی کا ذکر کیا ہے۔ ان بزرگ نے میر صاحب کو ریختہ گوئی کی طرف متوجہ کیا تھا۔ ان بزرگ سے یہ شعر بھی منسوب ہے ؎

سعادت شب تماشے میں اگر تیری نئی جوتی
گئی تو جانے دے دردانہ کے پیروں کے صدقے

دردانہ کوئی طوائف تھی۔ میر صاحب (امروہے کے سید میر صاحب کہلاتے تھے۔) اس کے مجرے میں تشریف لے گئے اور وہاں اپنی نئی جوتی کھو آئے۔ یہ شعر اسی تقریب کے سلسلے میں نازل ہوا تھا۔ شیخ غلام ہمدانی، مصحفی تخلص بھی، اسی خاک نمناک سے اٹھے تھے۔ شیخ صاحب چونکہ احساسِ کمتری کے مارے ہوئے تھے۔ لہٰذا لکھنؤ پہنچ کر اپنے تئیں دلی والا قرار دے دیا۔ خیر یہ تو تفصیل طلب داستانیں ہیں (جن میں زیب داستان کا معقول عنصر شامل ہے)، ہم نے اپنے بزرگوں کی اولوالعزمی، شان و شکوہ۔ تجمل پسندی۔ تمکین آفرینی اور وضع داری (میں نے دینداری کا ذکر قطعی نہیں کیا۔) کے جو دیومالائی قصے سنے ہیں۔ انھوں نے میری تشکیل شخصیت میں اہم حصہ لیا ہے اور کیا غرض پڑی ہے کہ ہم اپنے خاندان کی طلسماتی دیومالا سے دست بردار ہو جائیں۔ میری یادداشت کا دھندلکا غالباً ۱۹۱۲ء سے چھٹنا شروع ہوتا ہے۔ وہیں سے اپنے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔

اے مدعی برو کہ مرا با تو کار نیست

احباب حاضرند بہ اعدا چہ حاجت است

والد مرحوم کی بیاض سے نقل ہے کہ:۔

"میری پہلی شادی مسماۃ فاطمہ (دختر حاجی سید کرار حسن مرحوم ساکن محلہ گھر ہٹہ امروہہ) سے ۲۱ ذیقعد ۱۳۲۳ھ کو ہوئی۔ اس کا انتقال ۲۹ صفر ۱۳۲۴ھ کو ہو گیا یعنی سال بھر کے بعد چل بسیں۔ پھر میرا عقد مسماۃ واحدہ خاتون بنت سید کاظم نذر سے شب برات چودھویں شعبان کو ہوا۔ اس کا انتقال یکم صفر ۱۳۲۵ھ کو ہو گیا بغیر رخصت (یعنی رخصتی کے بغیر) ۱۷ شعبان کو میرا عقد (ثالث) مسماۃ نرجس خاتون دختر حاجی سید کرار حسن سے ہوا' اور ۱۳ رجب کو شادی ہوئی۔ جن سے سید محمد مہدی (اچھن) سید محمد تقی (چھبن) سید محمد عباس (بچھن) اور سید حسین جون اصغر (جون ایلیا) متولد ہوئے اور دختر نجفیہ خاتون سلمہم اللہ!

والد بزرگوار نے اپنی جانب کے مولود مسعود/نامسعود کا تذکرہ ان لفظوں میں فرمایا ہے کہ:۔

بتاریخ ۲۱ ماہ شوال ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء بروز ہفتہ بوقت نو اور دس بجے دن کے خدا نے مجھے فرزند عطا فرمایا اس کا نام محمد مہدی رکھا گیا اور عرف اچھن قرار پایا۔

والد مرحوم مستند شاعر تھے۔ دادا سید نصیر حسن مرحوم حقیقی معنی میں شاعر تھے یا نہیں واللہ اعلم۔ البتہ اپنے کو نصیر تخلص سے سرفراز بلکہ مسلح رکھتے تھے کہ اس زمانے میں شعر گوئی لازمۂ شرافت بھی تھی۔ ہمارے معاشرے میں بے تخلص کا ادبی دم کٹا بھینسا کہا جاتا یا اسے ایسا گینڈا تصور کیا جاتا تھا جس کی تھوتھنی پر سینگ نہ اگے ہوں۔ امارت اور فارغ البالی کا دور کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ لیکن شاعری اور شطرنج کی محفلیں بدستور جمتی تھیں۔ اس معاشرے

میں میرا شاعر نہ ہونا اسی طرح خرق عادت تھا جس طرح جبشی کا سفید فام ہونا! بندہ موزوں طبع ابتدا ہی سے تھا۔ لفظوں کو جوڑ جاڑ کر مصرعے تیار اور تجویز کرنا کچھ ایسا مشکل کام نظر نہ آیا۔ عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں نثر لکھنے سے بہت جی گھبراتا تھا، لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصے قائم نہ رہی اور ذرا سی مشق کے بعد اجتناب و حجاب کی گتھی دور ہو گئی۔

شرم و حجاب نو عروساں در بر شوہر نمی ماند

ہمارے بزرگ باضابطہ تعلیم کی اہمیت سے یا واقف نہ تھے یا اس کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ کسی سرکاری اسکول میں داخل کرنے کے بجائے ہم بھائیوں سید امیر حیدر کمال امروہوی (مشہور فلم ساز) اور سید محمد تقی کے لیے الگ مکتب قائم کیا جائے۔ اس مکتب کے سربراہ منشی سید اختر حسین مرحوم قرار پائے۔ ہماری بسم اللہ خوانی کی تقریب خلیفہ جعفر حسین مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ نہ جانے یہ خیال کیوں ہے کہ ہماری رسم تسمیہ خوانی ۱۹ جولائی ۱۹۱۹ء کو ادا ہوئی تھی۔ امروہے میں آئمہ اہل بیت کی ولادت و وفات کی تقاریب میں جو محفلیں اور مجلسیں بڑے ذوق و شوق سے منعقد ہوتی تھیں۔ میں ان میں والد مرحوم کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ یہیں سے میری منبر خوانی کا آغاز ہوا۔ بڑے تایا سید نفیس حسن نفیس مرحوم نے حدیث خوانی بھی سکھا دی (یعنی مجلس عزا میں منبر پر بیٹھ کر کسی کتاب سے مناقب و مصائب اہل بیت پڑھنا) یہ بہت کم عمری کی بات ہے۔ بہر حال اس طرح مجھے مستقبل کی ادبی خدمات کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ لیکن آج تک میرا اندازہ اور ادراک نہ ہو سکا کہ باپ دادا کی نظر میں ہمارا مستقبل کیا تھا اور وہ ہمیں کیا بنانا چاہتے تھے۔

نقاش نقش ہے مدہوش تصور اب تک

بن رہا ہے ابھی افلاک پراگندہ مرا

حالانکہ ہماری برادری کے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے رہے تھے۔ علی گڑھ کالج میں مصروف تعلیم تھے۔ لیکن ہماری قسمت میں مکتب لکھی تھی۔ نہ جانے اس موقع پر یہ شعر کیوں یاد آیا کہ

بہ مکتب می رود طفل پری زاد

مبارک باد مرگ تو بہ استاد

اور اس میں شبہ نہیں کہ میں بچپن میں طفل پری زاد تھا۔ ہمارے گرد و پیش انگریزی تعلیم کا چرچا تھا اور ہم معصوم سید زادے نہایت خوش رفتاری اور سبک خرامی کے ساتھ فارسی عربی کی کلاسیکی ادبیات کی طرف رواں بلکہ دواں تھے۔ دس بارہ سال کی عمر تھی کہ شاعری کا جوالا مکھی میرے اندر پھٹ پڑا۔ ابتدا منبر پر بابا مرحوم کی کہی ہوئی نعتیں اور منقبتیں پڑھا کرتا تھا۔ پھر خود شعر کہنے اور پڑھنے لگا۔ بابا مرحوم میرے باپ بھی تھے اور استاد بھی! میرا جسم بھی انھیں کا عطیہ ہے اور روح بھی! سچی بات یہ ہے کہ والد مرحوم کے جو ممکنات شعر ان کے دوسرے علمی و تحقیقی مشاغل کے سبب بروئے کار نہ آسکے اور ان کی محتاط مگر پرجوش عقیدت نے تغزل و تخیل کے جس طوفان کو اپنے نفس کے اندر دبا دیا تھا۔ وہ سرمایہ سب کا سب کسی پُر اسرار قانونِ جذب و کشش کے تحت ان کے نفس سے میرے نفس کے اندر منتقل ہو گیا۔ یہ دعویٰ مجھے زیبا نہیں کہ تمتع زہر گوشہ یافتم۔ کیوں کہ میں نے ہر گوشے سے تمتع حاصل نہیں کیا۔ بلکہ شفقت پدری کا ایک ہی گوشہ تھا جو ہمیشہ میرے لیے فیضان کا سرچشمہ رہا اور ہے ؂

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود

سرِ من خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

مختصر یہ کہ چودہ پندرہ برس کی عمر ہی میں راقم الحروف کے دماغ میں یہ خناس سما گیا تھا کہ شعر کی حد تک میں بھی کچھ ہوں کہ نا زیر فلک و علم بر ستارہ کنم۔ ہمارے ہم ذوق ساتھیوں میں سید محمد جعفر حیات امروہوی۔ سید امیر حیدر کمال امروہوی۔ سید معشوق حسین نجم امروہوی۔ سید آل نبی وفا اور سید محمد مختار تاباں نقوی قابلِ ذکر ہیں۔ کمال امروہوی میرے سگے تایا زاد بھائی ہیں۔ میری اور ان کی پرورش ایک ساتھ ہوئی ہے۔ کمال شعر کہتے ہیں۔ خوب کہتے ہیں۔ لیکن ان کا قدرتی رجحان ڈرامے کی طرف ہے اور بلاشبہ اس فن کی دنیا میں ان کے فن کا سکہ پینتالیس سال سے رائج ہے۔ کمال امروہوی کی فلم "پکار" نے جب عالم گیر شہرت حاصل کی تو میں نے ایک شعر کہا تھا ؂

ایک ہی شاخ کے دو گل ہیں رئیس اور کمال
یہ تو ناقص ہی رہے اور وہ کامل ٹھہرے

حیات امروہوی کو ان کی یہ غزل ہمیشہ زندہ رکھے گی ؎

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے
کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے
ایک تیری اک مری آواز ہے
لے نہ ٹوٹے زندگی کے ساز کی
زندگی آواز ہی آواز ہے

حیات کی جواں مرگی نے ایک عجیب شیوا بیان، شعلہ گفتار اور شیوا طراز شاعر کو ہم سے چھین لیا۔ قہر یہ ہے کہ اس کا کلام بھی دستیاب نہیں۔ نجانے وہ ذخیرہ کہاں ضائع ہو گیا۔ بابا مرحوم کی بیاضوں کے ساتھ بھی یہی ماجرا گذرا۔ انھوں نے بہت کچھ کہا۔ بہت کچھ لکھا۔ مگر فی الحال ان کا صرف ایک مسدس ملتا ہے۔ جو "معراج نفس رسولؐ" کے نام سے ہم نے چھاپا۔ مرحوم کی غزلیں اور نظمیں کہاں گئیں؟ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ کس سے پوچھیں۔ کس سے شکوہ کریں۔ والد مرحوم کے جید اور مستند شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ شعر کو "دوں مرتبۂ علم و ادب" قرار دیتے تھے ان کا رجحان مطالعۂ مذاہب، ہیئت و نجوم اور فلسفہ و الٰہیات کی طرف تھا۔ میرے چھوٹے بھائیوں سید محمد تقی اور جون ایلیا نے ادبی ذوق کے ساتھ فلسفیانہ رجحان بھی انہی مرحوم سے حاصل کیا ہے۔ ابتداً میں اپنے کو فلسفے کے سلسلے میں تہی دامن سمجھتا تھا۔ ناگاہ اور یکایک میری روح پر بھی فلسفے کا عکس پڑا اور نفسیات سے (جسے پہلے فلسفے کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا) ایسا ذوق پیدا ہوا کہ روزنامہ جنگ کے لاکھوں قارئین سحر زدہ رہ گئے اور لوگ، نفسیات اور مابعد النفسیات (یہ اصطلاح بھی ایجاد بندہ ہے) اور نام نہاد روحانیت کے طلسم میں ایسے گرفتار ہوئے کہ اب تک آزاد نہ ہو سکے۔

میرے آغازِ جوانی میں امروہے سے چند ہفت روزے (جو اپنے نام کے برعکس پندرہ روز میں ایک بار شائع ہوتے تھے) نکلتے تھے۔ قرطاس۔ اتحاد۔ انصاف۔ پبلک گزٹ اور ایک ماہ نامہ حیات! اخبار بینی سے شوق ابتدا سے تھا اور اس وقت کی ہیجان انگیز صورتِ حال نے صحافت کی آتشِ شوق کو تیز تر کردیا تھا۔ چنانچہ اخبار بینی کا شوق اخبار نویسی کے ذوق میں تبدیل ہوگیا اور میں بجانب، مقامی اخبارات میں سیاسی اور ادبی موضوعات پر مسلسل لکھنے لگے۔ امروہے کی بھولی بھالی صحافت جس کی اشاعت کا واحد جواز، عدالت ہائے منصفی و تحصیل کے نوٹسوں کی چھپائی کی اجرت تھی۔ تو پہلے ہی حملے میں سر ہوگئی۔ اب توسیعِ مملکات کی فکر ہوئی۔ کمال امروہوی اس زمانے میں لاہور کے ہفت روزہ حمایت الاسلام سے وابستہ تھے اور شاید لاہور کے ایک آدھ پرچے سے بھی ان کا تعلق تھا۔ کمال امروہوی کی وساطت سے میری چند نظمیں لاہور کے اخبارات میں بھی شائع ہوئیں۔ ان نظموں کا موضوع وہی گھسی پٹی قومی شاعری (ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا) تھی۔ جس پر نہایت نیک نیتی اور سادہ لوحی کے ساتھ ہم آج تک عامل ہیں۔ دلّی سے ابن الحسن فکرِ آئینہ نکالتے تھے (ان کا تعلق روزنامہ تیج سے تھا) لکھنؤ سے روزنامہ اسد اور روزنامہ سرفراز شائع ہوتے تھے۔ ان کے صفحات پر بھا بدولت مسلسل ترکتاز کرتے رہتے تھے۔

جوں جوں ہندوستان کے سیاسی شعور میں ترقی ہو رہی تھی۔ انقلاب کا مبہم نعرہ پُر معنی سے پُر معنی تر ہوتا چلا جاتا تھا۔ اب اگر اپنے بارے میں کچھ لکھنا ہے تو یہ بھی لکھ دینا چاہیے کہ راقم الحروف بیس سال کی عمر ہی میں روایتی عقائد کی حلقہ بگوشی سے آزاد ہو چکا تھا ؎

رموزِ ہستی ہیں سخت مبہم روایتوں کا یقیں نہ کرنا
کہ راویانِ رموزِ ہستی روایتوں کے غلام بھی ہیں

عقائد نے کبھی میرے اندر کوئی ڈرامائی ہلچل پیدا نہیں کی، اور نہ کبھی سینہ بہ سینہ اور دماغ بہ دماغ منتقل ہونے والی روایات نے میری روح کے کسی تخلیقی روزن کو کھولا۔

بلکہ آج تک میرے نفس کا سب سے زیادہ غیر متحرک حصّہ وہ ہے جہاں مذہبی ولولے اور دینی مجاہدوں کا غازیانہ کردار جنم لیا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں چند باتیں اور بھی عرض کرنی ہیں۔ میرا بچپن ایک ایسے ماحول میں گزرا۔ جہاں اوہام کے بطن سے خوبصورت مفروضے جنم لیا کرتے ہیں۔ اس قسم کا ماحول روایت پسند تعصبات میں پایا جاتا تھا۔ ان سطور کی تحریر کے وقت میں خود بھی سوچ رہا ہوں کہ وہ کون سے حیاتیاتی اور نفسیاتی عوامل تھے۔ جنھوں نے مجھے "میں"، (یعنی میں رئیس امروہوی ہوں) بنا دیا۔ بچّے کی حیاتیاتی ساخت شکمِ مادر میں ہوتی ہے۔ وہ ایامِ حمل کے نو مہینے میں ازل سے ابد تک کی مسافت طے کر لیتا ہے۔ ؎

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے ایک دن
یہ دن تڑپ تڑپ کے بسر کر رہے ہیں ہم

انسان پشتِ مادر میں ایک پُر شور قطرۂ خوں تھا (جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا) یہ لہو کی بوند شکمِ مادر میں منتقل ہونے کے بعد بتدریج فرد میں تبدیل ہوئی اور اک عالمِ اکبر (انسان) وجود میں آگیا۔ قطرۂ خون کی فرد میں تبدیلی کائنات کا ایک ایسا لامثال اور بے نظیر واقعہ ہے۔ جس کے رموز و اسرار اب تک کسی فلسفی کی سمجھ میں آئے نہ کوئی نفسیات داں اس عقدۂ دشوار کو حل کر سکا کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا۔ البتہ مذاہب تخلیقِ انسان اور سرگزشت آدم کے بارے میں ایک پُر پیچ، خیال انگیز، نہایت دلفریب اور خوشنما توجیہہ پیش کرتے ہیں، یا تو اس توجیہہ کو یکسر قبول کر لینا چاہیے یا بالکل مسترد۔ درمیانی راستہ کوئی نہیں۔

خیر میں اپنے پر نظرِ بازگشت ڈال رہا ہوں۔ اگر مجھ میں کوئی حقیقت پسندی ہے تو وہ میری والدہ مرحومہ کا عطیہ ہے اور اگر رقتِ قلب، قناعت، ایثار، اور رضا برضا کا کوئی شائبہ موجود ہے تو وہ والدِ مرحوم کا ورثہ ہے، یا شاید معاملہ اس کے برعکس ہو۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ والدہ مرحومہ پر ہسٹیریا کے دورے پڑا کرتے تھے اور ہم باور کرتے تھے کہ کوئی زبردست جن ان کے سر پر کھیلتا ہے۔ طرفہ تر ماجرا ہے۔ والد مرحوم سے بھی قومِ اجنہ کے تعلقات تھے۔ یہ عجوبے بلکہ عجوبہ (جیسے عجیب سے عجوبہ ویسے غریب سے غروبہ)۔ بچپن

میں مجھے کتنے پراسرار معلوم ہوتے تھے۔ جب اس قسم کے خارق العادات امکانات پر گھر میں بحث ہوتی تو میرا تخیل کرۂ ارض سے بلند ہو کر کرۂ جنات پر جا پہنچتا اور مجھے طرح طرح کے عفریت آتشیں پروں پر اڑتے نظر آتے اور بعید از قیاس پری زادوں کے انفاس مشکبو کی خوشبو سے میرا وجود مہک اٹھتا۔ فوق الطبعی مظاہر سے میری یہی گہری دلچسپی تھی جس کے سبب طلسم ہوش ربا، ایرج نامہ، تورج نامہ اور بوستان خیال کے کردار خداوند لقا، عمر عیار اور حیرت جادو وغیرہ مجھے اصلی انسانوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے۔ اسی افسوس ناک بلکہ افسوسناک ذہنی کیفیت کے پیش نظر میں التباس حواس کے مختلف واہموں سے گذرا ہوں۔ اور یہی واہمے انسانی شعور کے "مرکزی نقطے" پر اثر انداز ہو کر اس کے تخیل کو تیز، اس کے ذہن کی ڈرامائی کیفیت کو سریع التاثیر اور اس کی ذہانت کے لیے تخلیق کے محرکات پیدا کر دیتے ہیں۔ میری شخصیت، شاعری اور اعصابی نظام پر ان واہموں کا گہرا اثر پڑا ہے۔ میرے خیال میں تخلیق کاری بھی ایک حد تک عصبی مظہر ہے۔ یہ جو فن کاروں میں اک قسم کی دماغی بیماری، اور عصبی اضمحلال یا ایب نارمل پن پایا جاتا ہے۔ یہ بھی ان کی تخلیقی فطانت ہی کا ثمرہ ہے۔ مجھ پر خود بھی کبھی کبھی یہ "جناتی کیفیت" طاری ہو جاتی ہے اور اس کا اظہار شعر کے پیرائے میں بھی ہوتا ہے۔ چند شعر حاضر ہیں ؎

اہرمن ہے نہ خدا ہے مرا دل — حجرۂ ہفت بلا ہے مرا دل
مہبطِ روح ازل میرا دماغ — اور آسیب زدہ ہے مرا دل

اک حور سے ہوتی ہے ملاقات سرِ شام
اک روح ڈراتی ہے مجھے آخر شب میں

اس شعر میں ایک حد تک صداقت ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ کسی زمانے میں ہر روز سرِ شام کسی حور سے ملاقات ہوتی تھی اور لگتا ہے کہ ایک آوارہ گرد روح آخر شب میں آ کر ڈراتی تھی۔

وسیع خود شخصیت

کوئی اس حُسنِ خواب آلود کے اسرار کیا کھولے
ہوائے شب مٹے آکے جس کے خود بندِ قبا کھولے

رہزن ہیں جلو میں تو جیب و راست حوادث
اور لشکرِ ارواحِ خبیثہ ہے فضا میں

بھوت بن کر مجھے ڈراتی ہیں
میری نا آفریدہ تخلیقات
کون آیا مرے تعاقب میں
دہی فکر و خیال کے جنّات
کس نے پیچھے سے قہقہہ مارا
یہ اندھیرے میں کون ہے مرے ساتھ

اور یہ شعر بھی اسی طرزِ احساس سے تعلق رکھتے ہیں سہ

مرے شعور کا عرفاں کسے نصیب کہ میں
مرد کشِ روحِ ازل ہوں سما سے آیا ہوں
دمک رہی ہے زمان و مکاں کی پیشانی
ستارۂ ابدی ہوں خلا سے آیا ہوں
تمہارے غنچہ و گل سے غرض نہیں مجھ کو
ادھر اشارۂ بادِ صبا سے آیا ہوں

بیان کر چکا ہوں کہ میری ذہنی تربیت میں جن عناصر نے حصّہ لیا ہے ان میں کچھ تو موروثی ہیں سہ

لوگ میری وحشت پر اسے رئیس کہتے ہیں
کیا جوان اٹھا ہے قیس کے گھرانے سے

کچھ سماجی ہیں کچھ نفسیاتی ہیں کچھ سیاسی۔ شعر گوئی کے سلسلے میں والد مرحوم کی تشویش جو تشویش کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ خود میرا جنون خیز شاعرانہ رجحان! منبر خوانی (ذکر اہلِ بیت، محافل نعت و منقبت۔ قصبے کی عورتوں کی فرمائشیں (سہرے۔ رخصتی نظمیں گیت) بیت بازی میں احباب سے مقابلہ۔ امروہے کی بزم حق (ڈرامیٹک سوسائٹی) کے لیے ڈراما نویسی۔ امروہے کے اخباری چیتھڑوں میں مدیر یا کالم نویس کی حیثیت سے بسیار نویسی۔ چونکہ طبعاً عجائب پسند واقع ہوا ہوں۔ اس لیے طلسماتی کہانیاں اور داستانیں بہت پسند تھیں۔ بھائی سید معراج النبی عروج کی ترغیب و تجویز پر داستانِ عجائب۔ بوستانِ خیال اور طلسم ہوشربا کا مطالعہ اس قدر انہماک و استغراق کے ساتھ شروع کیا کہ خود کو یکے از ساحرانِ سیاہ امیر حمزہ سمجھنے لگا۔ ہر وقت دماغ میں ایرج نامے اور تورج نامے کے جادو گر اژدرہائے آتشیں پر سوار گرزِ آتش بار لیے سرگرم پرواز رہتے تھے۔ جب ادر سودا بڑھا تو از خود طلسم ہوشربا قسم کی ایک داستان بیان کرنی شروع کر دی۔ اس مجلس داستان سرائے میں سیّد امیر حیدر کمال امروہوی۔ سیّد محمد تقی۔ مولوی سیّد تصدق حسین وغیرہ بذوق و شوق شریک ہوا کرتے تھے۔ منشی یا منشی فاضل کے امتحان کے سلسلے میں لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ کمال اس زمانے میں لاہور میں مقیم تھے۔ میوہ منڈی میں ان کے ساتھ قیام ہوا۔ اختر شیرانی سے وہیں کسی لانڈری میں ملاقات ہوئی۔

اسی دورے میں یا اس سے اگلے دورۂ لاہور میں امروہے کے ایک دوست زبیری صاحب کے ساتھ حضرت علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ در درویش را درباں نباشد۔ خیال یہ ہے کہ حضرت اپنی کوٹھی کے برآمدے میں لنگی باندھے بنیان پہنے ایک مونڈھے پر جلوہ افروز حقّہ پی رہے تھے۔ اس وقت میری عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ زبیری صاحب مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ حضرت انھیں سے مخاطب رہے۔ یاد نہیں کیا گفتگو رہی۔ غالباً امتحان کے پرچوں کے بارے میں کچھ سوالات کیے تھے۔ بہر حال اقبال کی زیارت نصیب ہو گئی۔ جون ۱۹۳۴ء میں اِس جانب کو استمزاج اور استصواب کے بغیر عقد کے بند صنوں میں باندھ دیا گیا۔

مبارک ہو تمہیں اے دوستو! تکمیل بربادی
تمہاری کوششوں سے ہو گئی آخر مری شادی

لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ شادی ہر اعتبار سے مبارک و مسعود ثابت ہوئی اور احقر کو عقد ثانی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ گو زن فگن اے دوست در بر بہار کی تجاویز بار بار پیش کی گئیں۔ ۱۹۳۵ء میں بڑے ماموں سید حاجی حسن مرحوم کے اصرار پر بابا مرحوم کی نارضامندی کے باوصف بیڑ (حیدر آباد دکن) چلا گیا۔ کچھ دن بیڑ میں قیام کر کے منجھلے ماموں کے پاس نظام آباد گیا۔ وہاں بھی خاصے ہنگامے برپا کیے۔ ایک طالب علم کو ادیب فاضل کا امتحان دلوانے کے لیے لاہور آیا اور پھر دکن واپس جانے کو جی نہ چاہا۔ معاش کے لحاظ سے یہ زمانہ بہت تنگی ترشی کا زمانہ تھا۔ لیکن ہم انقلابی نعروں میں مست تھے اور اپنے اس افلاس کو اجتماعی انقلاب کا نقیب سمجھتے تھے۔ اس انقلابی دور میں متحدہ ہندوستان کے انقلابی رہنماؤں سے خوب خوب ملاقاتیں رہیں۔ سید سجاد ظہیر اور ڈاکٹر محمد اشرف سے قریبی تعلقات پیدا ہو گئے۔ کچھ دن پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ میں بھی گزرے۔ مولوی سید منصور حسین نجم امروہوی امروہے کے اس انقلابی لشکر کے رہنما تھے۔ حاصل داستان یہ کہ ہم دو (مطلب ہے میں اور سید محمد تقی) اپنے رفقاء کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بائیں بازو میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں حافظ محمد ابراہیم اور بشیر حبیبی کا الیکشن بڑا ہنگامہ خیز الیکشن تھا۔ مسلم لیگ ایک طرف تھی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی ایک طرف! ہم کیا اور ہماری حیثیت کیا؟ تاہم اس زمانے میں جب کہ ضلع مراد آباد (یوپی) کے زمیندار شاہی لوگ انگریز کی خیر خواہی کو اپنا ایمان اور کانگریس اور مسلم لیگ کو شیطان سمجھتے — امروہے کے چند سید زادوں کا کانگریس میں شمول ایک ایسا بھونچال تھا جس کی دھمک دس دس کوس تک محسوس ہوئی۔ ان سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ مشغلۂ شعر و سخن بھی جاری تھا۔ غرض وہ زمانہ بھی عجیب ہیجان انگیز زمانہ تھا۔

روزِ وصلِ دوست داراں یاد باد
یاد باد آں روزگاراں یاد باد

کہاں تک اس قصّے کو طول دوں۔ کاش گردشِ ایام پیچھے کی طرف دوڑ جاتی اور میں اسی زمانے میں (جس کا ذکر ہے) چھلانگ لگا کر جا پہنچتا ؂

گر بود عمر۔ بہ مے خانہ رسم بارِ دگر
بجز از خدمتِ رنداں نہ کنم کارِ دگر

کانگریس کا دور بھی گزر گیا۔ ہم کانگریسی وزارت کی چلائی ہوئی گرام سدھار تحریک کے سلسلے میں دور دور تک گھوم پھر بھی لیے اور پھر پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ خاکسار کی جسمانی ولادت جنگِ عظیم اوّل کے آغاز پر ہوئی (۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء) گویا بندۂ ناچیز نوعِ انسانی پر پہلی جنگِ عالم گیر بن کر نازل ہوا تھا۔ بندۂ درگاہ کی ذہنی پیدائش صحافی کی حیثیت سے ستمبر ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ جب دوسری جنگِ عظیم کا پہلا گولہ پھٹا۔ ان دونوں جنگوں کا درمیانی وقفہ میری ذہنی تشکیل کا زمانہ تھا ؂

نہ جانے کون سے سانچے میں ڈھالیں
ابھی تو صرف پگھلایا گیا ہوں

شعر بھی کہتا تھا۔ نثر بھی لکھتا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیتا تھا۔ پارسائی کا محفل نشیں بھی تھا اور رندوں کا صدرِ محفل بھی! اس زمانے کے بہت سے فسانے اور افسوں یاد ہیں۔ اب کیوں ان کہانیوں کو دہرایا جائے ؂

برو فسانہ مخواں و فسوں مدم حافظ
کزیں فسانہ و افسوں مرا بسے یاد است

ستمبر ۱۹۳۹ء میں کوکب مراد آبادی اور عادل ادیب مرحوم کے ساتھ یتیم خانہ مسافر خانہ اسلامیہ مراد آباد سے ماہنامہ "مسافر" کا از سرِ نو اجرا کیا۔ اس سے پہلے یہ پرچہ میر افق کاظمی کی زیرِ ادارت نکلتا تھا۔ قلیل عرصے میں ماہنامہ "مسافر" نے خاصا معقول حلقہ پیدا کر لیا۔ اسی کے ساتھ میں روزنامہ "جدت" کا مدیرِ اعلیٰ بھی تھا۔ جو یو پی مسلم لیگ کا

واحد روزنامہ تھا۔ بعد میں چودھری خلیق الزماں مرحوم کی ادارت میں لکھنؤ سے روزنامہ "تنویر" جاری ہوا۔ اسی کے ساتھ ہفت روزہ "مخبر عالم" اور قاضی عبدالغفار مرادآبادی کے روزنامہ "پیام" حیدرآباد دکن کے لیے بھی کبھی کبھی کالم لکھتا تھا۔ لکھائی سے بہ مشکل اتنی یافت ہوتی تھی کہ معمولی زندگی بسر کی جا سکے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ میں صرف جبرِ معاش سے لکھتا تھا یہ کوئی اندرونی جبر تھا جو مجھے ہر موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور کرتا تھا ـــــ لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں انگلیاں! اب بحمد اللہ انہترویں سال سے گذر کر سترویں سال میں داخل ہو گیا ہوں ؎

روز کاری شد کہ در سے خانہ خدمت می کنم

در لباس فقر کار اہل دولت می کنم

اب بھی یہ حال ہے کہ اگر اپنی بکواس کو قلم بند نہ کروں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ کچھ نہیں تو خطوط نویسی ہی سہی۔ بہت سی وجوہ کی بنا پر مجھے روزانہ تیس چالیس خط پڑھنے اور ان کے جوابات لکھنے پڑتے ہیں۔ کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں جو ہر قسم کے مسائل کے بارے میں ازراہ تحقیق، ازراہ تحسین اور ازراہ تفنن مجھے خط لکھتے ہیں۔ سیاسی مسئلے، سماجی معاملات، نفسیاتی الجھنیں، خاندانی جھگڑے، جنسی پیچیدگیاں، ادبی نکتے۔ شعر و سخن کے معاملے وغیرہ وغیرہ۔ میں نہ سیاسی قائد ہوں، نہ سماجی مصلح۔ نہ ناقد ادبیات ہوں نہ معالج نفسیات۔ مگر چونکہ ہر سوئی کے سوراخ میں گھس جانے پر روزِ ازل سے جھانکنے کی عادت ہے۔ بنا بریں بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ ہر خط کا جواب دیتا ہوں اور ہر جواب سے ایک مسئلہ گھڑ لیتا ہوں۔ خدا اور اس کا رسول گواہ ہے کہ مجھے از خود شاگرد بنانے اور انجمنیں وضع کرنے کا شوق نہیں لیکن بقول شخصے گرد ستانی یہ ستم می رسد۔ بلا شبہ ہندوستان اور پاکستان میں بہت سے لوگ فن شعر میں میرے شاگرد رہ چکے ہیں، ان میں متعدد صاحب دیوان بھی ہیں۔ لیکن میں نے نہ تو ان کی کوئی فہرست بنائی نہ کبھی برملا علم استادی بلند کیا۔ معاملے کا دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ میں نے اکثر و بیشتر مروتاً اور بعض حالات میں معاوضاً کئی شعراء کو مکمل دیوان (جو تمام اصناف سخن پر مشتمل تھے) لکھ کر

دیے۔ لیکن میں اس دریا دلی اور فضول خرچی پر قطعاً شرمندہ نہیں۔ میں نے جو کچھ دوسروں کو لکھ کر دیا یا لکھ کر دیتا ہوں اسے صرف الفاظ کے اسراف سے تعبیر کرنا چاہیے۔ ان میں میری روح کا شمول نہیں، وہ صرف سحر سامری سے تشکیل پائے ہوئے بچھڑے ہیں جو بزور طلسم کلام کرتے ہیں۔ اس وقت بھی چالیس پچاس شاعر اور شاعرات میری تحویل میں ہیں۔ بیچارے شریف نوجوان ہیں۔ کہنے کی امنگ ہے۔ میں ہمت افزائی کر دیتا ہوں۔ یہی حال انجمنوں کا ہے۔ میں جہاں جہاں رہا کوئی نہ کوئی انجمن میری دم میں ضرور بندھی رہی۔ دوستوں کو کیسے یقین دلاؤں کہ انجمن طرازی اور شاگرد سازی سے ذاتی طور پر مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ بھی مروت دوستانہ کی ایک شکل ہے ؎

تم کو ہر شخص سے ہے چشمِ مروت کی امید
تم کو اس چشمِ مروت نے کہیں کا نہ رکھا

گفتگو کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ روزنامہ جنگ میں روزانہ ۲۰ سال سے میرا ایک چار مصرعی قطعہ چھپتا ہے۔ جنگ کے پانچ ایڈیشن نکلتے ہیں، کراچی، لاہور، کوئٹہ، راولپنڈی اور جنگ انٹرنیشنل لندن! ان قطعات کو بہت سے اخبارات نقل کرتے ہیں۔ میں نے غالب (آسٹریلیا)، فکرِ نو (جبین)، امروز اور پاکیزہ انٹرنیشنل (کناڈا)، مہک (نیویارک)، اور ہندوستان کے اردو اخبارات میں بھی اپنے قطعات پڑھے ہیں — روزنامہ جنگ کے پانچوں ایڈیشنوں کی اشاعت چار لاکھ سے کم نہیں۔ اگر ایک اخبار کو روزانہ چار آدمی بھی پڑھیں تو بیس لاکھ افراد کی نظر سے روزانہ میرا قطعہ گذر جاتا ہے۔ اگر بیس لاکھ قارئین کو سال کے تین سو پینسٹھ دنوں سے ضرب دیا جائے تو کتنے مضحکہ خیز اعداد و شمار برآمد ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آدمی خودنمائی اور خودستائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیتا ہے اور میں تو خودنمائی کا پرانا ذہنی مریض ہوں۔

قیامِ پاکستان سے ڈیڑھ دو سال قبل میں مرادآباد سے دہلی منتقل ہو کر حکیم محمد تقی مرحوم کے ماہنامہ "مشہور" کی ادارت میں شامل ہو گیا۔ اس زمانے میں میرے چھوٹے بھائی —

سید محمد تقی روزنامہ "جنگ" (دہلی) اور ماہنامہ "شمع" (دہلی) سے متعلق تھے۔ ایک دفتر سے دو روزنامے شائع ہوتے تھے: "جنگ" اور "مسلمان"۔ دادا عشرت علی اور میر خلیل الرحمٰن بڑی جانکاہی اور مستعدی کے ساتھ دونوں پرچے نکالتے تھے۔ اونٹ کے منہ میں زیرے کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اردو رسائل و اخبارات کے مرکز (دہلی) میں بیٹھ کر صرف ماہنامہ "مشہور" پر قانع رہتا۔ چنانچہ بہت جلد فری لانسر کی حیثیت سے دہلی کے متعدد پرچوں سے رشتہ استوار ہو گیا۔ روزنامہ "انصاری" کانگریسی مسلمانوں کا ترجمان تھا۔ انھیں مدیر کی حیثیت سے میری خدمات کی ضرورت پیش آئی اور میں نے ضرورت مند کی حیثیت سے یہ پیشکش قبول کرلی۔ کیا عجیب پرشور ــــ پرشر ــــ پرتشویش اور پرشورش زمانہ تھا۔ پاکستان کی جنگ پوری شدت سے لڑی جا رہی تھی اور ادھر مشرق میں برما اور مغرب میں عراق کے محاذوں پر دوسری جنگ عظیم کا ہولناک ترین ڈرامہ اپنے بھیانک انجام کو پہنچنے والا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اتنا ہنگامہ خیز دور برِ کوچک کی معلوم تاریخ میں کبھی نہیں آیا تھا۔ میں بھی دوسرے سیاست زدہ نوجوانوں کی طرح بدل و جان ان معرکہ آرائیوں میں شریک تھا۔ عجیب کہ مدیر اعلیٰ تھا قوم پرست مسلمانوں کے روزنامہ "انصاری" کا! اور رضا کار تھا آل انڈیا مسلم لیگ کا! یا رما این دا آں نیز ہم۔ بہت جلد چند شعرا، دوست احباب اکٹھے ہو گئے اور ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈال دی گئی۔ میں اس مجلس کا صدر تھا اور حکیم راغب مراد آبادی جنرل سکریٹری! کوکب شادانی، ظفر احسن آصف، افضل صدیقی (امین)، ہوش تیموری، عثمان بطے اور دجلے کون کون جانے اس چنڈال چوکڑی کے رکن تھے۔ اتوار کے روز ادیب الملک نواب خواجہ محمد شفیع کے دولت خانے مٹیا محل میں شعرا جمع ہوتے تھے۔ اکثر اس پر بہار مجلس میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ سول لائنز میں کنور مہندر سنگھ بیدی کرد تی میں مجسٹریٹ تھے۔ آوارہ گرد شعرا کی جائے پناہ کنور صاحب کی محفل میں بھی گاہے گاہے حاضری کا اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت (۴۵-۴۶-۱۹۴۷ء) میں میرا انتخاب ذوق و غالب، آتش و ناسخ اور میر و سودا نہیں تھے۔ جناح و گاندھی تھے۔ متحدہ ہندوستان کے آخری دارالحکومت میں ایک جاب

کا قیام ڈیڑھ پونے دو سال رہا۔ اور اس زمانے میں اکثر تاریخ ساز اور شعبدہ پرداز اکابر ملک و ملت کی زیارت کا شرف نصیب ہوا کبھی دور سے، کبھی قریب سے ! لیکن ان ملاقاتوں کا کوئی قابلِ ذکر واقعہ یاد نہیں۔ خواجہ حسن نظامی۔ ملّا واحدی۔ علامہ مشرقی۔ مسٹر آصف علی۔ سید عزیز حسن بقائی۔ قائداعظم جناح۔ راجہ صاحب محمود آباد۔ کامریڈ ایم این رائے۔ مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں۔ مفتی احمد سعید۔ کفایت اللہ۔ خان لیاقت علی خاں! غرض اس زمانے میں سیاسی افق پر جتنے چاند سورج چمک رہے تھے۔ ان کا دیدار نصیب ہوا۔ لیکن اب سینتیس اڑتیس سال کے بعد جو قلب کو جھانک کر دیکھتا ہوں تو کسی کا کوئی نقش نظر نہیں آتا۔ ایسا نہیں کہ میں نے انھیں صرف دیکھا۔ اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا۔ مگر ان بلند و بالا شخصیتوں سے کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ اسے اپنی بے حسی اور زود فراموشی ہی سے تعبیر کروں گا۔ قیام دہلی کی داستان عبرت عنوان کے بہت سے اوراق اس قدر باریک حروف میں لکھے ہوئے ہیں کہ جب تک حافظے کو سول پر نہ چڑھایا جائے۔ وہ ہرگز نہیں بتا سکتا۔ متحدہ ہندوستان کی تاریخ کے ان ہولناک ترین مہینوں میں ذہن پر کیا کیا گذری اور روح پر کیا کیا کیفیات طاری ہوئیں۔ میرے پیشے (صحافت) کا تعلق اور تقاضا تھا کہ ان بزرگوں سے ملوں اور میری شاعرانہ افتادِ مزاج کا اقتضا تھا کہ ان تمام بزرگوں کو فراموش کردوں ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ہندوستان کی تقسیم، پاکستان کا قیام۔ بڑے کوچک کے فسادات۔ شمالی ہند کے قتلِ عام۔ لاکھوں خاندانوں کی ادھر سے ادھر ہجرت۔ تشویش انگیز حال۔ نامعلوم مستقبل۔ اب سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ چند سال میں کس طرح پرانی دنیا مٹ گئی اور نئی دنیا وجود میں آگئی ؎

جو نئی دنیا ابھی تخلیق کی منزل میں ہے

اس کا کربِ آفرینش بھی ہمارے دل میں ہے

حقیقت یہ ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا (سنہ ۳۰ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک) عشق و عاشقی کی سرمستیوں، شعر و شاعری کی ساغر مستیوں اور رندی و ہوسناکی کی خرمستیوں کے دوش بدوش اپنے کو سیاسی جھمیلوں میں مبتلا پایا۔ جون سنہ ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان اپنے دفتر (روزنامہ انصاری جامع مسجد دہلی) میں بگوش ہوش سُنا اور پھر حوادث کا ایک سیلاب امڈ آیا ؎

اے دجلۂ خوں ! ذرا ٹھہرنا
اس راہ سے میں گذر رہا ہوں

۱۴ راگست کو قیام پاکستان ۔ ۱۵ راگست کو ہندوستان کا پہلا یوم آزادی ——— ۱۸ راگست کو عید الفطر ۔ ۵ ر ستمبر (سنہ ۴۷ء) کو مسجد فتح پوری میں بم کا دھماکہ ۔ مشرقی پنجاب اور دہلی کا قتلِ عام ۔ محلہ سرکی والاں (لال کنواں) کے ایک چھوٹے سے گھر میں میرا، سید محمد تقی اور سید محمد عباس کا محصور ہو جانا ۔ ۱۹ ر اکتوبر (سنہ ۴۷ء) کو B O A C کے ایک دقیانوسی ہوائی جہاز کے ذریعے اس خانماں خراب کی دلّی سے کراچی میں آمد ۔ آج تک بخوبی یاد ہے کہ ٹیکسی میں جسے ایک سکھ نوجوان چلا رہا تھا دادا عشرت علی اور میر خلیل الرحمٰن مجھے رخصت کرنے کے لیے پالم ایرپورٹ تک آئے تھے ۔ جونہی کراچی جانے والا طیارہ زمین سے بلند ہوا، ہندوستان سے سات سو سالہ تعلق کے تمام رشتے منقطع ہو گئے گویا بہ یک جنبش پرانی دنیا سے تمام تعلقات ٹوٹ گئے ۔ طے یہ ہوا تھا کہ روزنامہ جنگ دہلی اور کراچی سے بیک وقت شائع ہوگا ۔ جنگ کے دلّی ایڈیشن کی ادارت سید محمد تقی کریں گے اور جنگ کراچی کے فرائضِ ادارت میں سنبھالوں گا ۔ کیا کیا خیال باندھے ناداں نے اپنے دل میں ! ——— ہم تقسیم سے قبل اور تقسیم کے وقت سمجھتے تھے کہ اگرچہ برِّ کوچک کے بطن سے دو آزاد مملکتیں معرضِ وجود پذیر ہو گئی ہیں ۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کا تعلق گوشت اور ناخن کا ہوگا ۔ اور تقسیم کے باوجود دونوں طرف کی سرحدیں کھلی رہیں گی ۔ لیکن یہ غلط فہمی زیادہ دن باقی نہ رہ سکی ۔ میری زندگی میں ۱۹ ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء کا دن یادگار حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ اسی روز میری قومیت اور شہریت بالکل بدل گئی تھی ۔ معلوم نہیں کہ اس تبدیلی کے باوجود شخصیت میں

کیا تغیر واقع ہوا؟ ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء سے اب تک جو زندگی گزری وہ ایک مختلف جنم کی داستان ہے جس کو فی الحال بیان کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ میں بحمداللہ بنفس نفیس ابھی قائم ہوں۔ جب بھی ضرورت پیش آئے گی بیان کر دی جائے گی۔ تو جناب! یہ تو ہوا۔ میری شخصیت کا اجمالی خاکہ! اب رہا میرا فن۔ یہاں فن سے مقصد ہے لکھنے کا ہنر۔ اگر لکھنا کوئی فن کاری ہے اور یقیناً ہے تو میں تقریباً ساٹھ سال سے پیرفن ہوں یعنی قلم کا حلقہ بگوش — کاغذ اور قلم سے! غیر مشروط معاہدہ ہو چکا ہے کہ دست از طلب ندارم تا کام من برآید۔ اس قدر کہہ سکتا ہوں میں نے طوعاً و کرہاً، بخوشی یا بناخوشی نثر و نظم کی ہر صنف کو برتا ہے۔ نثری نظم کے علاوہ، اصنافِ نظم میں غزل، قصیدہ، گیت، مثنوی، مسدس، مخمس، مثمن، قطعات (ہر قسم کے قطعات بشمول قطعہ ہائے تاریخ وفات، قطعہ عقد نکاح، قطعہ عقیقہ برخوردار وغیرہ وغیرہ)۔ سہرا، رخصتی نظم، مزاحیہ شاعری، طنزیہ شاعری، غرض ایک موزوں طبع جو کچھ نظم کر سکتا ہے اور سب کچھ نظم کر سکتا ہے۔ ان سب پر اپنی جانب سے طبع آزمائی فرمائی ہے۔ یہی حال نثر کا ہے۔ اخباری اداریے سے لے کر افسانے، ناول وغیرہ تک سب کچھ لکھا ہے۔ ترجمے بھی کیے ہیں۔ مضامین اور مقالے بھی مرتب کیے ہیں۔ لیکن اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ مجھ میں تحقیق و جستجو کا مادہ نہیں۔ میں اتنی جانکاہی برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ میرا ذہن ایک موضوع سے دوسرے موضوع اور ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف جست کرتا ہے۔ اس جست و خیز میں اتنی مہلت کہاں کہ آدمی کسی موضوع پر غور و تامل کر سکے۔ شاعر کا محقق ہونا ضروری نہیں۔ مجھے تحقیق سے زیادہ تخلیق پسند ہے اور اسی پر قانع ہوں۔ میرے نفسیات داں ہونے کی بھی شہرت ہے اور اس موضوع پر تقریباً تیس کتابیں لکھ چکا ہوں۔ لیکن علمی نقطۂ نظر سے ان کا کوئی خاص درجہ نہیں۔ یہ کتابیں عام قاری کے لیے لکھی گئی ہیں اور انھیں اسی نقطۂ نظر سے جانچنا چاہیے۔ میں نے روزنامہ جنگ کے لیے پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تقلید میں ایک کردار تخلیق کیا تھا "نواب اچھے مرزا" یہ مضامین لوگوں نے بہت پسند کیے۔ لیکن یہ بھی نقالی تھی۔ ان مضامین کا ایک مجموعہ "اچھے مرزا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جہاں تک مجموعہ ہائے نظم کا تعلق ہے۔ تو حسبِ ذیل مجموعے اب تک اشاعت پذیر ہو چکے ہیں (۱) منتخب قطعات (۲) قطعات رئیس امروہوی جلد اوّل و دوم (پانچ پانچ سو صفحے کی دو جلدیں ہیں) جون ۱۹۵۳ء سے دسمبر ۱۹۵۸ء تک کے انتخابی قطعات۔ جنوری ۱۹۵۹ء سے اب تک کے قطعات اشاعت طلب ہیں۔ لیکن اس دفترِ بے پایاں کی اشاعت کے لیے وسائل کہاں سے لاؤں۔ پچھلے سینتیس سال میں میں نے جو قطعات لکھے ہیں (جن میں بہت سے زبان زدِ عوام ہیں) ان میں ہر قطعے کا ایک خاص سیاسی، سماجی اور نفسیاتی پس منظر ہے۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ ہر قطعے کے ساتھ اس کی شانِ نزول کے بارے میں ایک اطلاعی نوٹ ہوتا۔ لیکن اب اتنا وقت کہاں؟

ہر دم از عمر می رود نفسے
چوں نگہ می کنم نماندبسے

قطعات کے علاوہ الف (مجموعۂ غزل و نظم) پس غبار (مجموعۂ نظم و غزل) حکایتِ نے (مجموعۂ غزل) پس غبار (منتخب غزلیں) بحضرت یزداں (فلسفیانہ قسم کی نظمیں)، یہ مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں لحنِ لانی نظمیں (رجزِ مسیح) اور آثار (متفرق قومی منظومات) کے مجموعے کتابت کرا کے رکھ لیے ہیں نیز بہت سی مثنویاں (جو روزنامہ جنگ میں چھپ چکی ہیں اور بہت سے قصائد کتابت طلب ہیں۔ پچھلے ۲۵ سال کے قطعات (جنوری ۱۹۵۹ء سے اب تک) بھی اے کاش چھپ سکتے۔ (یک لفظ کاوش کر بصد جاں نوشتہ ایم) پھر بے شمار (بے شمار اس لیے کہ میں نے کبھی ان کا شمار نہیں کیا) مضامین ہیں جو روزنامہ جنگ کے فائلوں میں مل جائیں گے۔ یہ مضامین بھی خالی از لطف نہیں، حسرت تھی اور ہے کہ انھیں بھی کوئی مرتب کر دیتا۔ بقدر ایک دیوان مختصر کے شاعری بھی موجود ہے۔ نعت و منقبت اور سلام و مراثی کا ایک مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ میں اتنا پھیل گیا ہوں کہ اپنے کو سمیٹنا مشکل ہے۔ شعر و ادب اور صحافت کے علاوہ میری زندگی کے اور بہت سے پیچ در پیچ شعبے اور تہ بہ تہ خانے ہیں۔ لیکن اگر میں اس تفصیل میں جاؤں گا تو بھٹک جاؤں گا۔ بس فی الحال یہی عرض کرنا تھا۔

(بہ شکریہ منظر علی خاں)

آسیہ سحر

رئیس امروہوی مرحوم
کا ایک غیر مطبوعہ انٹرویو
(سنہ ۱۹۴۶ء)

مجھے نہ تو رئیس صاحب کی شاگردی کا دعویٰ ہے اور نہ ہی دوستی کی خوش فہمی۔ بلکہ مجھ جیسی ایک ادنیٰ سی صحافی اور گمنام سی افسانہ نگار کو رئیس صاحب جانتے تک نہ تھے لیکن ان کے ذہنی، علمی اور ادبی کارناموں کا اعتراف کرنے والوں اور ان سے عقیدت رکھنے والوں میں مجھ حقیر کا نام بھی شامل ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ رشتہ ہی بہت کافی ہے۔

ان سے میری ملاقاتیں بہت محدود و اور مختصر سی ہیں لیکن ہر ملاقات میں انھوں نے جس محبت اور شفقت کا برتاؤ مجھ سے کیا اور میرا تعارف کروانے والوں کی باتوں میں آکر میری صلاحیتوں کو جس طرح سراہا اس سے میں واقعی خود کو وقتی طور پر ایک اہم شخصیت سمجھ بیٹھی تھی اکثر مشاعروں میں انھیں دیکھا ہلکی سی ملاقات بھی ہوئی مگر ایک ملاقات میرے ذہن کے کینوس پر اپنے خوب صورت رنگوں کے نقش چھوڑ گئی۔ میں مشاعرے کی رپورٹنگ کے سلسلے میں اگلی نشستوں پر براجمان اپنی ڈائری پر سر جھکائے لکھنے میں مصروف تھی کہ کسی نے شرارتاً صدر محفل محترم رئیس امروہوی کے کان میں کچھ کہا، انھوں نے فوراً اسٹیج سکریٹری کو کوئی حکم دیا اور اگلے ہی لمحے مائیک پر چند خوب صورت لفظوں کے بیچ میرا نام پکارا گیا۔ میں اس اچانک افتاد سے بوکھلا گئی کہ یا خدا یہ چپکے چپکے تک بندی کا راز یوں سر محفل کیسے

فاش ہو گیا ۔ اپنی مسلمہ کم فہمی کے باعث رئیس صاحب اور دوسرے بڑے شعرا کی موجودگی میں کچھ سنانا گستاخی، اور انکار کرنا مزید جہالت و گستاخی، ادھر رئیس صاحب کا پیہم اصرار، ادھر حاضرین محفل کی جانب سے دبی دبی ہنسی، چبھتے ہوئے فقرے، کیا کروں، کیا نہ کروں؟ رونا آ گیا ۔ بہر طور ما ئیک کے قریب گئی اپنی پوزیشن واضح کی، کچھ یاد نہ ہونے پر معذرت کی اور انھیں اطلاع دی کہ :۔

یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی

مگر رئیس امروہوی صاحب نے ایک عرصے تک یہ بات یاد رکھی اور ہر ملاقات پر ایک مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے شکوہ کیا ۔ میری شرمندگی سے خوب لطف اندوز ہوتے ۔

انہی دنوں ایک کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں رئیس صاحب کے ایک غیر رسمی انٹرویو کی ضرورت پڑی انھیں تفصیلات سے آگاہ کیا ۔ بہت حوصلہ افزائی کی اور دوسرے روز کا ٹائم دیا اور کمال مہربانی فرما کر خود کو مکمل طور پر فارغ کر لیا میں نے دانستہ طور پر پہلے سے پلاننگ نہیں کی تھی کہ سوالات میں بے تکلفی اور برجستگی قائم رہے اور مقصد محض یہ تھا کہ ان کی زندگی کے زیادہ سے زیادہ حالات میرے علم میں آ جائیں ۔ اب ان کی وفات کی خبر سن کر جو دکھ اور بے پایاں احساس زیاں ہوا اس نے مجھے اپنی یادوں کی گٹھری کھولنے اور یہ سرمایہ نکالنے پر مجبور کیا، اور اب میں اسے آپ کی خدمت میں جوں کا توں پیش کر رہی ہوں ۔

سوال : سب سے پہلے تو آپ یہ بتلائیے کہ شاعری کی ابتدا کیسے ہوئی اور پہلا شعر کون سا تھا ؟

جواب : بات یہ ہے بی بی ! کہ میں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ امروہہ کا خاندان ہے ۔ دہلی سے کوئی ۸۰ میل دور مشرق کی طرف، وہاں صدیوں سے وہ لوگ آباد تھے ۔ ان کی زندگی میں نہ ٹی وی تھا، نہ وڈیو کیسٹ تھے، نہ وی سی آر تھا، نہ گاڑیاں تھیں ۔ بیلوں پر سوار ہوتے تھے ۔ بڑے بڑے کچے مکانوں میں رہتے تھے، نہ کلب تھا نہ تھیٹر ۔ ایسے میں اگر کوئی مشغلہ تھا تو یا شاعری تھی یا شکار ، یا پھر شطرنج ۔ دن بھر بیٹھے ہیں یا شاعری کر رہے ہیں

یا دیوان خانے میں شطرنج کھیل رہے ہیں، اور ہمارے والد محترم تو خود شاعر تھے۔ لہذا مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے۔ (بے اختیار ہنستے ہوئے) پیدا ہوتے ہی کان میں شعر پڑے۔ میں نے پہلا شعر ۱۹۲۴ء میں دس سال کی عمر میں کہا تھا ۔

یا تو کچھ میں ہی غلط سمجھا ہوں
یا نئے سر سے بہار آئی ہے

سوال: بچپن میں آپ نے کچھ سوچا تھا کہ بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟

جواب: (ہنستے ہوئے جواب دیتے ہیں) ارے بی بی! حقیقت یہ ہے کہ بچپن میں دو پیشے مجھے بے حد پسند تھے اکثر سوچا کرتا تھا کہ بڑے ہو کر یا تو شاعر بنوں گا یا پھر انجن ڈرائیور۔ یقین کیجیے مجھے انجن ڈرائیور سے ایک والہانہ عشق تھا اور میں اس سے انتہائی متاثر۔ میرے ذہن پر ایک خواب انگیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی جب رات کے سناٹے میں سیٹی کی آواز آتی تھی چھک چھک ...... چھک چھک ...... تو میں سوچا کرتا تھا کہ یار ......! یہ آدمی کس قدر خوش قسمت ہے گاڑی پر چڑھا گھومتا رہتا ہے۔ چنانچہ گاڑی اور انجن کے عشق میں مبتلا ہو کر میں نے ماچس کی ڈبیوں کی ریل بنائی تھی اور اسے چلا کر منہ سے سیٹی کی آواز نکال کر اپنا شوق پورا کیا کرتے تھے۔

سوال: ابھی آپ نے اپنے زمانے کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ اور کوئی مشغلہ تھا نہیں اس لیے شاعری کرتے تھے تو آج کل تمام مشاغل اور دوسرے مسائل اور ذہنی پریشانیوں کے ساتھ جو شاعری ہو رہی ہے آپ! اس سے مطمئن ہیں؟

جواب: بھئی یہ شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار ہے۔ لوگوں کی غزلوں اور نظموں میں جو خوف ہے، مایوسی ہے، تلخی اور انتشار ہے وہ قدرتی بات ہے کہ یہ سچی شاعری ہے۔ اچھا اب حسن اور عشق کا معاملہ ہے تو پہلے شعر کہے جاتے تھے زلفِ یار پر ...... اب یار نے زلف ہی کٹوا لی ہے تو بے چارا شاعر شعر کس پر کہے۔ (ایک قہقہہ) بھئی آپ کے دور میں محبوب کمبخت نے حلیے ہی بدل ڈالا تو ظاہر ہے کہ پھر ایسی ہی شاعری ہوگی۔

سوال: شاعری میں خوف کی بات چلی ہے تو آپ یہ بتلایئے کہ موجودہ دور میں جو انتشار

اور روحانی شکست کا سلسلہ جاری ہے اس کا کیا نتیجہ نکلے گا، اور آپ کے خیال میں یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟

جواب: یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر میں برابر لکھتا رہا ہوں۔ دراصل تشدد کی ایک لہر ہے جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور پاکستان میں بھی اس کے مظاہرے روز بروز ہو رہے ہیں۔ تشدد، اشتعال، انتشار، بے یقینی، خوف اور روحانی ٹوٹ پھوٹ۔ اس کی بہت سی نفسیاتی، روحانی، معاشی، مادی اور سماجی وجوہ ہیں اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پچھلے سو سال میں انسان نے جو مادی اور سماجی ترقی کی ہے وہ اتنی حیرت انگیز ہے کہ گزشتہ دس ہزار سال بلکہ ایک لاکھ سالہ زندگی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن انسان کی یہ ترقی ایک طرفہ ہے یعنی مادی اور عقلی ترقی تو ہوئی مگر ذہنی اور روحانی ترقی بالکل نہیں ہو سکی ہے بلکہ انسان پستی کی جانب ہی گیا ہے۔ روحانی ترقی سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان نے منظم مذاہب کو چھوڑ دیا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے لوگ اب بھی مذہب کو مانتے ہیں لیکن اصل میں رسمی اور تقریری مذاہب انسان کو روحانی سکون نہیں پہنچا سکتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جب بھی طوفان آنے والا ہوتا ہے تو پہلے فضا میں ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ آج کل ہماری روحوں پر جو سناٹا چھایا ہوا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ایک طوفان عظیم بڑی مدت کے بعد ہماری دنیا پر چھا رہا ہے۔ اب تک بہت سے ازم، بہت سی تحریکیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ قومیت ہے، سوشلزم ہے، احیائے اسلام کی تحریکیں ہیں۔ یہ سب تحریکیں اس بات کی علامت ہیں کہ انسان تبدیلی چاہتا ہے اور گزشتہ ۸۰ سال میں اس کے بہت سے مظاہر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ سوشلزم اور کمیونزم سے جو امیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ انسان نے خود کو ایٹمی اسلحوں سے لیس کر لیا ہے۔ دنیا پر تیسری ایٹمی جنگ کا سایہ منڈلا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفسیاتی انتشار، اخلاقی بحران، سیاسی کشمکش، ایٹمی ہتھیاروں کی ارزانی، سپر طاقتوں کی سازشیں، یہ سب چیزیں ہمیں خطرناک مستقبل کی جانب لیے جا رہی ہیں۔

سوال: آپ ان تمام مسائل کا کوئی حل بھی پیش کریں گے؟

جواب: دیکھیے پھوڑے کا واحد حل یہ ہے کہ آپریشن ہو اور درد کا واحد حل یہ ہے کہ فاسد خون کو جسم سے نکالا جائے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ شدید طوفان آنے والا ہے اور یہ اگزیر ہے گا۔

طوفاں سے مفر ہے نہ زمیں پر نہ فضا میں
چل بیٹھیے خود رہ گزر سیل بلا میں

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے اندر اب اپنے آپ کو باقی رکھنے کی سکت نہیں ہے، یہ بحران ناگزیر ہے، دعا کیجیے کہ ہم اس بحران کو سائنٹیفک پیمانے پر وہ رخ دے سکیں کہ یہ تعمیر کا سبب بن جائے۔

سوال: ہمارے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: آپ کو یہ بتلانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ قیام پاکستان کے لیے کتنی قربانیاں دی گئی ہیں اور اتنے وسیع پیمانے پر ہجرت کا عمل انسانی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھا گیا اب پاکستان میں آبادی کا ایک بڑا حصہ ہے جو ترک وطن کر کے آیا ہے اب پاکستان میں جو انتشار ہے وہ یہ ہے کہ ایک تو آنے والی بڑی آبادی نفسیاتی طور پر اب تک آباد نہیں ہوئی ہے، انھیں یاد ماضی اور موجودہ حالات اور پھر قومیتوں کی کشمکش کا احوال بلاشبہ ملت اسلامیہ ایک ملت ہے اور پاکستان ایک قوم ہے لیکن یہاں کلچرل گروپ اور سماجی برادریاں تو ہیں اب ان کا آپس میں انضمام کا جو عمل ہے یعنی قومی یکجہتی کا، وہ ایک دم نہیں ہو سکتا یہ آہستہ آہستہ ہو گا۔ مختلف صوبے، مختلف زبانیں اور رسم و رواج ہیں ہم ایک دم یہ چاہیں کہ کسی مشینی عمل کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں کو یکلخت تبدیل کر دیں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ پچھلے دنوں جس پیمانے پر خونریزی ہوئی اس کی تو مثال ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں بھی نہیں ملتی اس کی کیا وجہ ہے؟ بداعتمادی اور خوف، اور ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ دیہی آبادی بہت تیزی کے ساتھ شہروں کی جانب منتقل ہو رہی ہے، پھر باہر جانے کا جنون ہے اب تک لاکھوں خاندانوں کے نوجوان باہر جا چکے ہیں وہ سب بظاہر بہت مطمئن ہیں مگر درحقیقت وہ زندگی کے جس عذاب میں مبتلا ہیں وہ تمام خوشحالی اس کے سامنے ہیچ ہے تو یہ نفسیاتی محرومی

عزیزوں کی جدائی، یا دماغی اور پھر دولت کی بے تحاشا دوڑ، وی سی آر، کوٹھی، نئے نئے ماڈل کی کاریں۔ یہ سب وہ محرکات ہیں جنھوں نے انسانی ذہن کو لرزاں کر دیا ہے۔

سوال: رئیس صاحب آپ کا کیا خیال ہے اس مسئلے کا تدارک کیسے کیا جائے؟

جواب: اگر ملک میں وسیع پیمانے پر ہم صنعتی انقلاب لا سکیں اور ایسے ذرائع پیدا کر سکیں کہ ہمارے جو لوگ معیشت اور روزی کی خاطر باہر جاتے ہیں ان کو یہاں روزی مل جائے تو انھیں کیا ضرورت ہے کہ وہ باہر کے ملکوں میں جا کر غلامی اختیار کریں۔

سوال: موجودہ حالات میں آپ کا علم نجوم کیا کہتا ہے؟

جواب: یہ سلسلہ تو میرے علم کی روشنی میں ۱۲ جون ۱۹۸۸ء تک چلے گا اور علم نجوم کی روشنی میں اس کی باقاعدہ وجوہات ہیں۔ یہ ایک مخصوص ستارے کی ظاہری علامت ہے۔ یہ ستارہ جب ظاہر ہوتا ہے لوگوں کو بے صبر اور جنگجو کر دیتا ہے اور مشتعل مزاج بنا دیتا ہے۔

سوال: سائنسی نقطۂ نظر سے بھی کچھ وجوہات ہیں؟

جواب: بالکل ہیں..... سائنسی وجوہ ہیں۔ کبھی جس وقت سورج پر دھبے پڑتے ہیں تو تمام کمیونی کیشن کے ذرائع معطل ہو جاتے ہیں تمام کائناتی شعاعیں پوری فضا کو زہر آلود کر دیتی ہیں۔ مختلف ستاروں سے جو شعاعیں نکلتی ہیں وہ انسانی ذہن پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں مثلاً چاند کی روشنی سے سمندر میں جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے، اسی طرح چڑھتے چاند کے زمانے میں جرائم کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ چاند ہمارے جذبات میں ہیجان پیدا کرتا ہے۔ اب ہماری شاعری میں چاند کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند سورج ستاروں کی تابکاری انسانی ذہن کو متاثر کرتی ہے اور یہ دمدار ستارہ بھی بہت متاثر کرتا ہے۔

سوال: اب میں کچھ آپ کی نجی زندگی کی طرف آتی ہوں۔ یہ بتایئے آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟ اور پہلی محبت۔ پہلی خواہش کے متعلق کچھ بتایئے؟

جواب: زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا...... کبھی میں ضرور بتاؤں گا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ محبت کا تجربہ مجھے خود کرنے سے نہیں ہوا بلکہ ابتدا میں لوگوں نے مجھ سے محبت کی۔ اس زمانے میں ہمارے اوپر سختیاں بہت تھیں گھر سے نہ نکلو، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ اچھا! مزے کی بات یہ کہ

. ہم بچپن میں بہت خوب صورت تھے ۔ محلے میں کچھ لڑکیاں تھیں تو وہ ہمارے ہاں پتھر پھینکا کرتی تھیں اور بعد میں تو باقاعدہ اینٹیں آنے لگی تھیں (رئیس صاحب کے فلک شگاف قہقہے میں ہماری بے ساختہ ہنسی بھی شامل ہو گئی) میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چکر کیا ہے اور پھر میں محبت سے خوفزدہ ہو گیا ۔ مگر خیر یہ سب تو مذاق تھا بچپن کا ...... مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے عشق کیا اب سے کوئی تیس برس قبل وہ بڑا سنجیدہ عشق تھا اور اب بھی ہے ۔ مگر میں اس میں شدید کبھی نہیں ہوا کہ گھر سے بھاگ گئے پاگل ہو گئے ، سڑکوں پر گھوم رہے ہیں ۔

کوئی شعلہ تو نہیں غم کہ بھڑک کر بجھ جائے
یہ اُبھرتا ہے نکھرتا ہے ، جواں ہوتا ہے

ابھی کل ہی ان سے ملاقات ہوئی ان کے شوہر کو بھی علم ہے اور میری بیوی کو بھی ، اصل میں ان کی شاعری میں دلچسپی : ذہانت ، بصیرت اور اعلیٰ ذوق کی وجہ سے ان سے بہت متاثر ہوں ۔

سوال : آپ کی اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ محبت کے لیے کچھ صفات کچھ خوبیوں کا ہونا ضروری ہے ؟

جواب : نہیں بھئی ہرگز نہیں ، قطعی نہیں اصل میں یہی تو سمجھ کا پھیر ہے ۔
محبت اختیاری شے نہیں ہے ۔
محبت کی نہیں جاتی ۔

سمجھے تھے ہم کہ عشق ہے اک حسنِ اتفاق
دیکھا تو واقعات کا اک سلسلہ ملا

حقیقت یہ ہے کہ زمین میں واقعات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے اور اس پر کوئی ایک شخص ہی پورا اترتا ہے ۔ بھئی یہ تو اپنے اپنے اندازِ نظر کی بات ہوتی ہے ۔

عشق بہ پہلی نظر کی بات نہیں
تو بہت کم نگاہ ہے پیارے

سوال: کچھ بچپن کے بارے میں بتائیے، کس قسم کے کھیلوں سے دلچسپی تھی؟

جواب: بچپن ہمارا بڑی پابندیوں میں گزرا، لڑکوں کو لڑکیوں کی طرح رکھا جاتا تھا، سچی بات یہ ہے کہ کبھی کھیلوں سے دلچسپی رہی ہی نہیں، ہاں درختوں پر چڑھنے کا بہت شوق تھا اور کمال امروہوی، سید محمد تقی اور ہمارے لیے گھر پر ہی ایک مکتب کھولا گیا تھا ایک مولوی صاحب ملازم رکھے گئے تھے، کھانا اور پانچ روپے ماہوار پر۔ ... تو بھیا سچی بات یہ ہے کہ ہم نہ ایم اے ہیں، نہ بی اے ہیں اور نہ کبھی کالج گئے نہ یونیورسٹی۔

سوال: آپ سیاست سے بھی تو وابستہ رہے ہیں کچھ اس بارے میں بتائیے؟

جواب: ہاں بی بی! ہم سیاست میں بھی تھے کانگریس سے ابتدا کی تھی۔ جواہر لال نہرو کے ساتھ بہت کام کیا۔ سن ۱۹۴۰ء میں ہم آگئے مسلم لیگ میں۔ جواہر لال نہرو کے تو ہم خاص ساتھیوں میں سے تھے۔ جواہر لال نہرو کے لیے ہم نے کہا تھا ۔

اے جواہر لال، اے مظلوم بھارت کے سپوت\
کیا تری قربانیاں ہیں، جو نہیں ملتا ثبوت

لیکن پھر ہم نے محسوس کیا کہ کانگریس مسلمانوں کے لیے مخلص نہیں ہے سو ہم پھر مسلم لیگ میں آگئے۔ خود قائد اعظم کانگریس میں تھے اور راجہ صاحب محمود آباد اور چودھری خلیق الزماں سب کے سب کانگریس میں تھے۔

سوال: اس وقت آپ کے ذہن میں پاکستان کا تصور تھا؟

جواب: ہاں تھا ..... مگر بڑا مبہم سا تصور تھا۔ چودھری رحمت علی اور دوسرے لوگوں کی وجہ سے آہستہ آہستہ وہ تصور واضح ہوتا گیا۔

سوال: پاکستان بننے کے بعد آپ کے تصورات پورے ہوئے؟

جواب: یہ بڑا نازک سوال ہے پاکستان میں قومیتوں کا جو مسئلہ بڑی شدت کے ساتھ اب اٹھا ہے اسے میں نے سن ۱۹۴۷ء میں محسوس کر لیا تھا اور یہ جو محرومیاں اور مایوسیاں ہیں جواب ایم کیو ایم کی صورت میں سامنے آ رہی ہیں پچھلے دنوں اندرون سندھ گیا تھا بڑا انتشار ہے وہاں، خدا رحم کرے۔

سوال : رئیس صاحب ! اس کا کیا حل ہے آپ کے پاس ؟

جواب : سب سے بڑا حل جو میں سمجھتا ہوں کہ فوراً یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ ۱۹۷۳ء کا آئین بحال کر دیا گیا ہے اور صحافت آزاد ہے عام انتخابات کا اعلان ہونا چاہیے ، اس طرح وقتی طور پر یہ ہوگا کہ لوگوں کی توجہ مبذول ہو جائے گی الیکشن کی طرف ، اور ملک میں جو گھٹن کی فضا ہے یہ ختم ہو جائے گی ۔

(۱۹۸۶ء)

○

کمال امروہوی

رئیس امروہوی کو میں اچھّن کہا کرتا تھا ۔ اچھّن کے اچانک گذر جانے سے میں اس بھری دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں ۔ محسوس ہوتا ہے کہ اپنی بقیہ زندگی میں انھیں ہر روز اپنے پاس ہی دیکھتا رہوں گا ۔ ان کی کئی کتابیں ، غزلوں کا مجموعہ ، قطعات کی چار جلدیں میرے پاس موجود ہیں ، میں روزانہ ان کی تلاوت کیا کرتا ہوں ؛ ان کی دیو پیکر شخصیت میرے اندر کروٹیں لیتی رہے گی ۔ اچھّن اور میں اپنے لڑکپن میں چودہ برس تک ایک ہی بستر پر سوتے رہے اور سولہ برس تک ایک ہی ساتھ پڑھتے رہے ۔ میرا یقین ہے کہ میں حالانکہ ہزاروں میل دور رہا ہوں ، لیکن اب میں گویا ادھورا ہی رہ گیا ہوں ۔

فیاض اعوان

رئیس امروہوی مرحوم

ماہرِ نفسیات، شاعرِ بے مثال سے آخری انٹرویو

کئی ماہ بیتے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا "تم جو معروف اور اہم شخصیات سے انٹرویو کیا کرتے ہو، کیا ان کے کیسٹ اپنے پاس محفوظ رکھتے ہو؟" میں نے کہا "میں مختلف ادیبوں، سیاست دانوں، کھلاڑیوں اور فن کاروں سے انٹرویو کرتا ہوں۔ بھلا سب کے کیسٹ کیسے محفوظ رکھ سکتا ہوں۔ میں غریب آدمی ہوں!"

"غریب ہو تو کیا ہوا، میں تو غریب نہیں ہوں۔ یوں کرو کہ انٹرویو میرے پاس محفوظ کر دیا کرو اور ہر کیسٹ کے عوض مجھ سے دو کیسٹ لے لیا کرو!"

"ٹھیک ہے۔ سوچ کر بتاؤں گا۔ ابھی تو میں رئیس امروہوی سے انٹرویو کرنے جا رہا ہوں!"

"فوراً جاؤ اور انٹرویو ہو جائے تو اس کے کیسٹ میرے حوالے کر دو۔ رئیس امروہوی کی قدر میں ہی جانتا ہوں۔ ممکن ہے تمہیں ادراک نہ ہو۔"

"یہ ۳ر جنوری کی بات تھی۔ میں رئیس امروہوی کی رہائش گاہ واقع گارڈن ایسٹ پہنچ گیا۔ وہ اس وقت اپنی محفوظ نشست پر بیٹھے لکھنے میں مصروف تھے۔ وہی جگہ جہاں ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کے بعد نہ بیٹھ سکے۔

"میں فیاض اعوان ہوں!" میں نے پہنچتے ہی کہا۔

"اچھا اچھا تم آگئے ـــــ آؤ بیٹھو ـــــ" انھوں نے میری خیریت پوچھی اور بولے
"ہاں تو انٹرویو کب لینا چاہتے ہو؟"

"کل ہی ـــــ!"

"جمعہ کو کر لیتے تو اچھا تھا۔ میں فارغ ہوتا ہوں ـــــ!" انھوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا ـــــ!"

۳۱ جنوری دوسرا دن تھا۔ میں بر وقت پہنچ گیا۔ میرے انٹرویو کے تین حصے تھے۔ میں ٹیلی ویژن کے حوالے سے بات کرنا چاہتا تھا۔ پھر ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ انھوں نے کب اور کیسے لکھنا شروع کیا۔ ان کے تجربات، دلچسپیاں، محبتیں، لغزشیں اور دوسرے سوالات۔ تیسرا حصہ ان کے کام سے متعلق تھا۔ وہ چالیس سال سے جنگ میں لکھ رہے تھے۔ لاکھوں کی تعداد میں انھیں خطوط ملے تھے۔ میں ان خطوط، نفسیات، مابعد النفسیات، محبتوں، جنسیات، عوام الناس کے مسائل اور دوسری چیزوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ خصوصاً نوجوان نسل، لڑکے اور لڑکیوں کے مسائل، ظاہر ہے ان سے زیادہ کون بتا سکتا تھا، مگر گفتگو ہوئی تو سب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ میں نے ایک ہی نشست میں ہر طرح کے سوالات شروع کیے۔ حیران ہوں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ میرا یہ ارادہ تو مطلق نہ تھا۔ کیا ان کی پراسرار شخصیت کے سبب سب کچھ خود بخود ہو گیا ـــــ

رئیس صاحب اس وقت قدرے علیل تھے۔ وہ لکھتے لکھتے کھانسنے لگے۔ کھانسی کا دورہ ایسا شدید پڑتا کہ وہ دوہرے ہو جاتے۔ ایک صاحب جو اس وقت آئے تھے کہنے لگے "رئیس صاحب! یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی آپ کا دل باہر آجائے گا!" ـــــ ایسے ماحول میں وہ مجھے انٹرویو دے رہے تھے۔ بس صرف ایک بار انھوں نے کہا ـــــ "کیا تم یہ انٹرویو آئندہ پر نہیں رکھ سکتے؟" میں نے عذر بیان کیا کہ "بہت دور سے آیا ہوں" تب انھوں نے کہا "ٹھیک ہے تم جاری رکھو" پورے انٹرویو میں وہ کھانستے رہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا یہ "خود غرضی" کیسے سرزد ہوئی۔ ایک بار سردار علی صابری سے انٹرویو کر رہا تھا۔ میں پورے تین

برس جاتا رہا۔ ان گنت بار گیا تب جا کر وہ انٹرویو مکمل ہوا" سردار علی صابری، مجھ سے محبت کرتے تھے اور مجھے چکر لگوا رہے تھے۔ لیکن بہرحال وہ انٹرویو ڈھائی تین برس میں ہوا۔ آخر رئیس امروہوی سے میں نے کیوں کہا کہ بہت دور سے آیا ہوں۔ میں پھر بھی تو جا سکتا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں۔ شاید میں نہ جا سکتا، اور بیسویں صدی کے اس عہد آفریں نابغۂ روزگار شخص سے انٹرویو نہ کر پاتا، اپنی خود غرضی پر بعد میں دکھ بھی ہوا تھا مگر اب دکھ نہیں رہا۔ ان کی آواز اور یہ انٹرویو میرے پاس محفوظ ہو گیا۔ ممکن ہے دوسری صورت میں نہ ہوتا اور دکھ ہوتا کہ اس روز میں خود غرض کیوں نہ ہو گیا۔

رئیس صاحب سے انٹرویو کا آغاز کچھ یوں ہوا " رئیس صاحب! اپنے بارے میں شروع سے بتائیے؟"

رئیس صاحب نے کہنا شروع کیا "میرا نام، محمد مہدی ہے میں ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کو ضلع مراد آباد کے شہر امروہہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد اور میرے دادا بھی شاعر تھے۔ گھر میں شاعری کا چرچا عام تھا اور میری پرورش اسی ماحول میں ہوئی۔ میری تعلیم مکتب میں ہوئی میں نے سب سے پہلے عربی، فارسی میں تعلیم پائی۔ گویا ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو کسی کالج یا یونیورسٹی کے شرمندۂ احسان نہیں!"

"تمام تعلیم ذاتی طور پر حاصل کی؟"

"ہاں تمام تعلیم عربی، فارسی، اردو، انگریزی اپنے ذاتی شوق سے پائی۔ صحافت کا قصہ بھی اسی طرح سے ہے کہ بچپن ہی سے صحافی بننے کا شوق تھا، ادب کا رجحان بھی تھا۔ مگر میں بنتا صحافی ہی چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء سے میں باقاعدہ صحافت میں آ گیا۔ اب گویا پچاس برس ہو گئے۔"

"آپ ابتدا سے "جنگ" میں ہیں؟"

"نہیں! جنگ سے ۱۹۴۷ء میں وابستہ ہوا۔ اس طرح اکتالیس سال ہو گئے۔ اس سے پہلے اور بعد میں بھی کئی پرچے نکالے۔ سب سے پہلا پرچہ مراد آباد سے "مسافر" نکالا۔ پھر کئی اور پرچے نکالے۔ مسلم لیگ کا پہلا پرچہ روزنامہ جدت تھا۔ میں اس کا ایڈیٹر تھا وہ خالص

مسلم لیگی پرچہ تھا پھر ۱۹۴۵ء میں دہلی چلا گیا ۔ وہاں کئی اخبارات سے متعلق رہا
۱۹۴۷ء میں کراچی آ گیا ۔ اس کی بڑی وجہ "جنگ" بھی تھا ۔ میرا جنگ سے معاہدہ ہو گیا تھا کہ ایک صاحب دلّی سے جنگ نکالا کریں گے اور میں کراچی میں ذمّے داریاں سنبھال لوں گا ۔
چنانچہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو میں کراچی آ گیا ۔ تب سے اب تک میں جنگ میں ہوں "

"آپ نے کتنی کتابیں تصنیف کیں ؟"

"میں نے کوئی چالیس کے قریب کتابیں لکھی ہیں ۔ ان میں شاعری کے مجموعوں میں الف، گرد و غبار، حکایت نے، آثار، بزم السحر، مجلس بہار، بادیزدماں، شامل ہیں جب کہ قطعات کے کوئی چودہ پندرہ مجموعے ہیں "

"دوسرے کن کن موضوعات پر کتابیں لکھیں ؟"

"نفسیات، مابعد النفسیات، روحانیات، جنسیات پر کوئی بیس کتابیں موجود ہیں ؟"

"کیا آپ نے ان علوم مثلاً نفسیات، جنسیات کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی ہے ؟"

"میں نے کسی اسکول وغیرہ سے تو تعلیم حاصل نہیں کی ہے ۔ لیکن ان پر جتنی کتابیں موجود ہیں ۔ وہ میں نے پڑھی ہیں اور ذاتی تجربات بھی کیے ہیں "

اب رئیس صاحب سے ٹیلی ویژن کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی ۔ یہاں بعض سوالات اور رئیس صاحب کے جوابات نقل کر رہا ہوں ۔

"آپ کی نظر میں ٹیلی ویژن پروگرام کیسے ہوتے ہیں ؟"

"میں ٹیلی ویژن پروگراموں میں تفریحی عنصر کی کمی محسوس کرتا ہوں ۔ میرے خیال میں تفریحی پروگرام اور ہونے چاہئیں ۔ انہوں نے ٹیلی ویژن پر روشن خیالی اور آزادیٔ فکر پر اظہارِ خیال کیا اور کہا سرکاری حصّہ کم ہونا چاہیے ۔ وزراء کو کم آنا چاہیے ۔ اہم ملکی معاملات کے بارے میں خبریں ہونی چاہئیں تاکہ لوگ بیرونی ذرائع کی جانب متوجہ نہ ہوں "

"اس کا مطلب ہے کہ ٹیلی ویژن اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر رہا ہے ؟"

"نہیں ۔ یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کیونکہ ایک حد تک ٹیلی ویژن نے اپنا کردار حسن و خوبی سے ادا کیا ہے ۔ لیکن بحث تو یہ ہے کہ وہ مزید بہتر کر سکتا ہے یا نہیں ۔ ظاہر ہے کر سکتا ہے ۔

چنانچہ اس کے لیے کچھ نئے چینل ہونے چاہییں اور ایک خاص چینل علاقائی زبانوں سندھی پنجابی، بلوچی، پشتو وغیرہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ جن پر وہاں کے رسم و رواج، شادیاں، قصّے کہانیاں، لوک گیت وغیرہ دکھائے جائیں۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ ٹیلی ویژن پر علاقائی زبانوں کا بہت کم حصّہ ہے۔"

"ڈراموں کے بارے میں بتائیے؟"

"ڈرامے ضرور ہونے چاہییں، بلکہ ان کا معیار نہ بڑھنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈرامے کی حد تک ٹیلی ویژن نے بڑا کام کیا ہے۔ بلکہ ڈرامہ وہ واحد شعبہ ہے جس پر ٹیلی ویژن بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔"

"رئیس صاحب! آپ خود کون سے پروگرام خاص طور پر دیکھتے ہیں؟"

"میں ڈرامہ ضرور دیکھتا ہوں، پھر معلوماتی، کوئز پروگرام، درندوں اور جانوروں پر مبنی فلمیں دیکھتا ہوں۔"

"ادبی نوعیت کے پروگرام؟"

"میں ادبی پروگرام نہیں دیکھتا' البتہ وہ پروگرام اور مشاعرے دیکھ لیتا ہوں جن میں خود شریک ہوتا ہوں۔"

"کبھی خود آپ کا جی چاہا کہ آپ اداکار ہوتے؟"

"کبھی جی نہیں چاہا کیوں کہ اداکاری کو اپنے شاعرانہ ذوق سے بالکل الگ چیز سمجھتا ہوں!"

"شاعری کو اداکاری سے زیادہ اہم چیز سمجھتے ہیں؟"

"بلاشبہ شاعری ہی اہم شے ہے۔ اداکاری تو نقل کا نام ہے۔ جب میں اصل کام کر رہا ہوں تو نقل کیوں کروں؟"

"فرض کیجیے آپ اداکار ہوتے تو کیسے اداکار ہوتے؟"

"بہت اچھا اداکار ہوتا۔ میری آواز میں بھی وہ چیز ہے جو مائیکروفون کے لیے موزوں ہے۔ ایک زمانے میں میرا چہرہ بھی جاذبِ نظر اور دل کش تھا۔ میں بڑا خوبصورت شخص تھا

چنانچہ اداکاری میرے لیے مسئلہ نہ تھی۔ میں چاہتا تو اداکار بن سکتا تھا!۔"

" اچھا یہ بتائیے کون کون سے ادیب اور شاعر ایسے ہیں جو اگر اداکار ہوتے تو بڑے اچھے اداکار ثابت ہوتے ؟ "

" ایسے شعرا میں رئیس امروہوی، احمد فراز، پھر حبیب جالب شامل ہیں۔ جوش مرحوم بھی بڑے اچھے اداکار ثابت ہو سکتے تھے۔ حفیظ جالندھری بھی بہت بڑے اداکار ہو سکتے تھے۔ جب کہ خواتین میں فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر قابلِ ذکر ہیں ان کی گفتگو اور انداز میں بڑا چارم ہے۔"

رئیس صاحب! اس وقت ادیبوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے جب کسی محفل میں لوگ ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے گرد ہو جاتے ہیں اور ادیبوں کو کوئی نہیں پوچھتا ؟ "

" نظر بالکل ایکٹروں اور ایکٹرسوں پر ہی ہونی چاہیے۔ کیوں کہ وہی جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔ ادیبوں کے چہرے پر تو پھٹکار برستی ہے۔"

" ادیبوں کے چہروں پر پھٹکار کیوں برستی ہے۔ آخر وہ کرتے کیا ہیں ؟ "

" کرتے تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن بے چارے غریب، افلاس زدہ اور زبوں حال ہوتے ہیں۔ نہ ان کے پاس پیسہ ہوتا ہے نہ کچھ اور، تو پھر چہروں پر رونق کیسے ہو۔ روپیہ پیسہ، لباس، خوشبویات سب کچھ تو ایکٹروں کے پاس ہوتا ہے۔ وہ ہوتے بھی خوب صورت ہیں۔ ظاہر ہے لوگ پھر انہی کے گرد ہوں گے۔"

" آپ کے پسندیدہ فن کار ؟ "

" میں تو بس طارق عزیز کا نام جانتا ہوں۔"

" کوئی فنکارہ ؟ "

" کوئی نہیں۔"

جب ان سے اصرار کیا گیا کہ نام ضرور بتائیں، آخر ایکٹریس کیا کہیں گی۔ تو انھوں نے معصومیت سے کہا۔ واللہ مجھے کسی کا نام معلوم نہیں۔"

میں نے رئیس صاحب سے ذاتی نوعیت کے سوالات بھی کیے، میں ان کی زندگی کے

ہر گوشے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

"آپ کا کوئی کارنامہ جس پر آپ خود فخر محسوس کر سکیں؟"

"نہیں ایسا کوئی کارنامہ نہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ۳۰ برس سے میں مسلسل جنگ میں "قطعات" لکھ رہا ہوں۔ یہ اپنی جگہ بڑی بات ضرور ہے۔ کیوں کہ جنگ سات لاکھ کی تعداد میں چھپتا ہے۔ یہ کئی جگہ سے چھپتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک قطعہ پانچ آدمی پڑھیں تو پینتیس چالیس لاکھ آدمی روزانہ پڑھتے ہیں!"

"زندگی میں کس شخص نے اپنے کردار سے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟"

"دراصل ہر شخص میں کوئی نہ کوئی نفاست ہوتی ہے۔ بُرے سے بُرے آدمی میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے تو ہر شخص کو ہی بہت نفیس پایا ہے۔

ہر شخص نے کسی نہ کسی سے وفا ہی کی؟
ہم کو تو دہر میں نہ کوئی بے وفا ملا

تو ہمیں ہر شخص اچھا ملا۔ لیکن کوئی خاص خوبیوں کا مرقع آدمی، جس میں کوئی کمزوری نہ ہو وہ نہیں ملا۔"

"آپ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے کیا کرتے ہیں؟"

"یوگا کی مشقیں کرتا ہوں۔ یہ میرا روزانہ کا معمول ہے"

"اپنے وسیع حلقۂ احباب کے باوجود یہ بتائیے کہ آپ کا بہترین دوست کون ہے؟"

"میرے نزدیک بہترین دوست کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ویسے میرے بھائی سید محمد تقی ہی میرے بہترین دوست ہیں۔ میں اپنا ہر دکھ سکھ اور ہر بات ان سے کہہ دیتا ہوں اور وہ مجھ سے کہہ دیتے ہیں!"

"آپ کو غصہ کب اور کیوں آتا ہے؟"

"میں غصے کے معاملے میں بڑا کمزور واقع ہوا ہوں۔ مجھے غصہ نہیں آتا۔ اگر آتا بھی ہے تو وقتی طور پر اور بہت کم آتا ہے!"

"رئیس صاحب! آپ کون سی چیز یا بات نہیں بھولتے؟"

"اگر کوئی بڑی پریشانی ہو تو وہ میں نہیں بھولتا۔"

"آپ کی سب سے بڑی کمزوری؟"

"مروّت"

"کوئی بُری چیز جو اچھی لگتی ہو؟"

"شراب"

"کبھی روتے بھی ہیں؟"

"یہ ضروری نہیں ہوتا کہ رونا آنسوؤں کے ساتھ ہی ہو، اکثر دل ہی روتا ہے۔"

کس کو معلوم ان اشکوں کی حقیقت اے دوست
روح کی سمت جو آنکھوں سے رواں ہوتے ہیں

اب میں ان سے نفسیات، محبت اور لوگوں کے مسائل کے بارے میں سوالات کرتا ہوں۔

"رئیس صاحب! آپ ایک عرصے سے لوگوں کے نفسیاتی اور دوسرے مسائل حل کر رہے ہیں۔ یہ بتایئے لوگوں کے زیادہ تر مسائل کیا ہیں؟"

"واقعی یہ بھی اہم سوال ہے۔ مجھ سے مختلف لوگ مختلف سوالات کرتے ہیں۔ کوئی خوف میں مبتلا ہے۔ کسی کو رات کو نیند نہیں آتی۔ کوئی تشویش کا شکار ہے۔ کوئی ڈپریشن میں مبتلا ہوتا ہے۔ کسی کے خاندان میں اختلاف ہے۔ اسی طرح میاں بیوی کے جھگڑے ہیں۔ چھوٹے بچوں کے مسائل ہیں۔ تعلیمی نفسیات وغیرہ وغیرہ۔"

"کیا آپ ان تمام مسائل کو واقعتاً حل کر لیتے ہیں؟"

"ان مسائل کو حل کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ آپ کسی کی بات ہمدردی کے ساتھ سنیں۔ اسے کہتے ہیں دل کا بخار نکالنا۔ چنانچہ لوگ اپنے خطوط میں دل کا بخار نکالتے ہیں۔ لوگ اندر سے بہت گھٹے ہوئے ہیں۔ ان کو کوئی نہیں سنتا۔ اگر آپ ان کی نہ سنیں یا ایک کان سے سن کر دوسرے اڑا دیں تو ان کے مرض میں اضافہ ہو جاتا ہے، میں انھیں تسلی دیتا ہوں۔ ان کی بات سنتا ہوں۔ بس ہر آدمی تسلی چاہتا ہے۔"

"لیکن آپ کا اس میں جو وقت صرف ہوتا ہے؟"

"میں اسے ضائع نہیں سمجھتا بلکہ اسے خدمتِ خلق شمار کرتا ہوں۔"

"اس کا کوئی معاوضہ؟"

"کوئی معاوضہ نہیں، بس میری کتابیں پڑھیں۔ یہی میرا معاوضہ ہے۔" یہ دیکھو آج کی ڈاک ہے۔ یہ کوئی پندرہ خط ہیں۔ ایک اور ڈاک شام کو آئے گی۔ مجھے ۱۹۶۳ء سے اب تک کوئی پونے دو لاکھ خطوط مل چکے ہیں۔ اس سے پہلے کا میں نے کوئی ریکارڈ نہیں رکھا ہے۔ لیکن اب ان خطوط کا ریکارڈ رکھنے لگا ہوں۔ یہ دیکھیے اس بورے میں سب خطوط بھرے ہوئے ہیں۔"

"آپ کو لاتعداد خطوط ملتے ہیں۔ آپ کیا محسوس کرتے ہیں۔ ہماری خواتین کن مسائل کا شکار ہیں؟"

"جو خواتین شادی شدہ ہوتی ہیں ان کے مسائل تو یہ ہوتے ہیں کہ شوہر سے جھگڑا ناچاقی، شوہر پر شک، ہر قسم کا شک، شوہر کی بے اعتنائی۔ نند اور ساس کا جھگڑا اور یہ کہ شوہر پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ شادی شدہ خواتین کے یہ عام مسائل ہوتے ہیں، جبکہ غیر شادی شدہ اور کنواری لڑکیوں کے مسائل یہ ہوتے ہیں کہ مناسب رشتہ نہیں ملتا یا کوئی پیغام نہیں آرہا۔ جس سے محبت کرتی ہیں اس سے شادی کا امکان نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"ان محبت کرنے والی لڑکیوں کا مسئلہ آپ کس طرح حل کرتے ہیں؟"

"میں ان سے کہتا ہوں کہ ٹھیک ہے تم اس سے محبت کرتی ہو، لیکن اگر وہ تم سے محبت نہیں کرتا تو شادی ہو بھی گئی تب بھی وہ محبت نہیں کرے گا۔ چنانچہ ایسی محبت کا کیا فائدہ۔ وہ پھر مجھ سے کہتی ہیں کہ کوئی تعویذ وغیرہ دے دیں۔ یعنی وہ تعویذ کے چکر میں پڑ جاتی ہیں۔ میں انھیں کوئی اسمِ مبارک پڑھنے کو کہتا ہوں کہ اللہ اللہ پڑھو۔ یا اللہ پڑھو، یا کریم پڑھا کرو۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کا موڈ بدلا جا سکتا ہے۔"

"شادی شدہ مردوں کے مسائل کیا ہوتے ہیں؟"

"ان کے اپنے مسائل ہوتے ہیں کہ بیوی کے ساتھ جھگڑا، بیوی کا ناپسندیدہ ہونا، محبت کے مسائل۔ جس میں شادی ہوئی بعد میں محبت نہ رہی اور پھر کسی اور عورت کی طرف رغبت۔"

"رئیس صاحب! آپ کا کیا مشاہدہ ہے، محبت، شادی کے بعد ختم ہو جاتی ہے؟"

"سب تو نہیں مگر کوئی ستر فی صد کیس ایسے ہوتے ہیں جن کی محبت شادی کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ تیس فی صد لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ شادی کے بعد بھی بدستور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ حالانکہ مسائل ان کے بھی ہوتے ہیں، اونچ نیچ بھی ہوتی ہے لیکن وہ اپنی محبت کے دنوں کو بھولتے نہیں۔ چنانچہ ہمیشہ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔"

"آپ کے خیال میں شادی اپنی پسند سے کرنی چاہیے یا ماں باپ جہاں کہیں وہاں کر لینا چاہیے؟"

"نہیں، گھر والوں کے ساتھ اپنی پسند ملا دینی چاہیے۔ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی کسی کو ناپسند ہو تو صاف صاف انکار کر دینا چاہیے کیوں کہ جبری اور ناپسندیدہ شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ اکثر ساری عمر کا روگ بن جاتی ہیں اور پھر وہی لڑکے لڑکیاں والدین کو بددعائیں دیتے رہتے ہیں، کوستے رہتے ہیں۔ ویسے مذہب بھی یہی کہتا ہے کہ جس کی شادی ہو اسی کی رضا مقدم ہونی چاہیے۔"

"طلبہ اور طالبات کے مسائل کیا ہوتے ہیں؟"

"حافظے کا خراب ہونا، کورس کی کتابوں سے خوف یا عدم دلچسپی وغیرہ۔ ہم انھیں خود ترغیبی کی ہدایات دیتے ہیں۔ مثلاً میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ وہ خود سے کہیں کہ "ہم روز بروز بہتر ہوتے جا رہے ہیں"۔ ہر طالبہ اور طالب علم کا کیس الگ ہوتا ہے۔ مگر خود ترغیبی زیادہ تر کے لیے ضروری ہوتی ہے۔"

"آپ لوگوں کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں کہ وہ بہت مشکلات میں ہیں اور آپ انھیں الجھا ہوا محسوس کرتے ہیں؟"

"ہاں بے حد ـــ بے انتہا ـــ بہت ہی زیادہ ـــ انسانیت بے حد مشکلات میں ہے۔ بہت پریشان ہے۔ ماتمی کریں بتا نہیں سکتا۔ میرا دل خون کے آنسو روتا ہے اور یہ میرا ایک اپنا دکھ بن گیا ہے۔"

"کراچی، سندھ اور پاکستان کے جو حالات ہیں اس کی بنیادی وجہ آپ کے خیال میں کیا ہے؟"

"اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ سن ۱۹۸۰ء میں ہیروئن کا صرف ایک مریض پایا گیا تھا اب کوئی بیس لاکھ ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ بے چارگی، دکھ، گھٹن۔ یہ جو ایم کیو ایم اور پی پی آئی کی تحریکیں ہیں۔ یہ طویل مارشل لا اور حقوق سے محرومی کا نتیجہ ہیں۔ کوئی مہاجر، سندھی، پنجابی، پختون کا جھگڑا نہیں ہے۔ آخر ہم چالیس سال سے ساتھ رہ رہے تھے۔ پھر اب کیا ہو گیا؟"

"مجھے یہ بات بڑی جہالت کی لگتی ہے کہ ایک آدمی مہاجر ہے تو وہ اچھا ہے اور پنجابی ہے تو برا ہے۔"

"بالکل جہالت ہے۔ سراسر جہالت ہے۔ دراصل اس کی وجہ کوٹہ سسٹم ہے۔ مہاجر اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوں تو انھیں ملازمت نہیں ملتی ان سے کہا جاتا ہے کہ گلگت کا ڈومیسائل لاؤ اندرونِ سندھ کا ڈومیسائل لاؤ۔ کراچی کا ڈومیسائل کوئی مانتا ہی نہیں ہے۔ پھر مسابقت اور مقابلے کی فضا ہے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے پاس گاڑی ہو، کار ہو، ٹی وی، وی سی آر، ایئر کنڈیشنر فریج ہو۔"

"آپ کیا اندازہ کرتے ہیں آگے چل کر کیا کچھ ہو سکتا ہے؟"

"اگر صورتِ حال یہی رہی تو بڑا خونریز انقلاب آ سکتا ہے۔ ایسا کہ ہم کانپ اٹھیں گے"

"صرف کراچی، سندھ یا پورے پاکستان میں؟"

"پورے پاکستان میں، یہ جو لٹے لوگ باہر سے آ گئے ہیں۔ مختلف لوگ۔ مختلف ممالک کے لوگ ـــ یہی ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔ اب کلاشن کوف آ گئی ہے۔ ہیروئن اور ڈرگ مافیا کا راج ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"رئیس امروہوی بہت دل گرفتہ تھے۔ میں نے محبت کے بارے میں باتیں شروع کردیں۔

"رئیس صاحب! محبت پر آپ کا تبصرہ؟"

"کیا بات ہے محبت کی۔ میں محبت ہی محبت ہوں تیرے سر کی قسم!"

"سب سے زیادہ محبت کس سے کرتے ہیں؟"

"ہر عمر میں محبت کے جذبے کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ جوانی میں اور طرح کی ہوتی ہے لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔"

"آپ کو بھی اس محبت کا اتفاق ہوا؟"

"کیوں نہیں ہوا۔ بالکل ہوا"

"جوش مرحوم سے تعداد زیادہ ہو گی؟"

"نہیں ــــــ جوش صاحب کے اٹھارہ عشق تو میں مانتا ہی نہیں ہوں۔ آدمی سچے دل سے دو ایک عشق کر سکتا ہے، اگر کرے۔ اس سے زیادہ فلرٹ اور ہوس پرستی ہے"

"آپ نے کتنے کیے؟"

"دو کیے۔ سچے دل سے کیے۔ ایک تو بہت زبردست تھا۔"

"اچھا اب وہ کہاں ہیں، اور آپ کا کیا حال ہے؟"

"ایک تو انتقال کر چکی ہیں۔ دوسری حیات ہیں۔ باقی رہا میرا حال تو محبت ایک ایسی شے ہے۔ ایسا جذبہ ہے۔ جو ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ یہ ایک غیر اختیاری جذبہ ہے۔ جس سے محبت ہوتی ہے خود بخود ہو جاتی ہے۔ اب وہ پہلی سی شدت تو باقی نہیں رہی۔ مگر کشش عشق وہی ہے اور مجھ پر اب تک طاری ہے۔"

"اس وقت آپ کی عمر کیا ہے؟"

"۷۴ برس" (میں نے بے ساختہ کہا۔ خدا رحم کرے اس شخص پر جس نے عشق کیا کہ یہ تو ۷۴ برس تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ پھر کیا قبر میں چھوڑے گا)

"رئیس صاحب! اب آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"

"صحت ــــــ" انھوں نے کہا۔

"آپ کی نظر میں سب سے خوب صورت مرد اور عورت؟"

"سب سے خوب صورت مرد میں خود تھا اور عورت میری محبوبہ تھی!"

"کسی ایک شخص کے ساتھ رہنا ہو تو کس کے ساتھ رہنا پسند کریں گے؟"

"جو شاعر نہ ہو!"

"آپ کی پسندیدہ شخصیات؟"

"مختلف شعبوں میں مختلف شخصیات ہیں۔ مثلاً مجھے مولانا رومی بہت پسند ہیں۔ غالب بہت پسند ہیں۔ محمد حسین آزاد، علامہ اقبال ہیں، قائد اعظم لیاقت علی خاں، حسرت موہانی، میری والدہ اور والد ہیں!"

"کیا وجہ ہے کہ آپ نے تمام لوگ "مرحوم" بتلائے ہیں۔ زندہ اور موجود لوگوں میں کوئی پسند نہیں ہے؟"

"ہاں یہ تو ہے۔ موجود لوگوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ دراصل نقش انہی کا ہوتا ہے جو جا چکے ہوتے ہیں۔ آپ جس عہد میں ہوتے ہیں اس کا اتنا نقش نہیں ہوتا۔ جب وہ شخص چلا جاتا ہے تب اندازہ ہوتا ہے کہ مرنے والا کیا تھا اور کیسا تھا!"

"ناپسندیدہ لوگ؟"

"تمام فرقہ پرست، متعصب اور ظالم لوگ ناپسند ہیں۔ سب سے بڑا ظالم "قابیل" تھا۔ جس نے قتل کی رسم جاری کی تھی۔ وہ حضرت آدمؑ کے بیٹوں میں سے تھا۔"

"رئیس صاحب! آپ کیسے آدمی ہیں۔ خود پر تبصرہ فرمایئے؟"

"میں عام سا آدمی ہوں۔ مجھ میں کوئی خاص خوبی نہیں اگر مجھ میں کوئی خوبی ہے تو یہ کہ میں کسی سے رشتا جھگڑتا نہیں میں صلح پسند آدمی ہوں۔ مجھے کسی فرقے، قوم یا علاقے سے کوئی تعصب نہیں ہے۔"

انٹرویو ختم ہوا تو انھوں نے اپنے لیٹر پیڈ پر آٹوگراف کے ساتھ ایک شعر اور میرا نام لکھا میں خوش خوش لوٹ آیا اور اب اس لیے خوش ہوں کہ کسی بھی صحافی کا یہ ان سے آخری انٹرویو تھا۔ رئیس امروہوی کے بارے میں جب بھی اور جو بھی لکھا جائے گا میرے اس انٹرویو کا ذکر ضرور ہوگا۔ کیوں کہ یہ ان کا آخری انٹرویو تھا۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے۔

رئیس امروہوی

خود تماشا ہوں خود تماشائی

ذیل میں رئیس امروہوی مرحوم کا وہ مضمون نذرِ قارئین ہے جو مرحوم اس وقت لکھ رہے تھے جب انھیں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اصل مسودے پر جگہ جگہ مرحوم کا خون گرجانے سے عبارت کے بعض حصّوں کو پڑھنا آسان نہ تھا۔ ہم چونکہ مرحوم کی اس آخری تحریر کو کسی قسم کی ترمیم یا تحریف کے بغیر منظرِ عام پر لانا چاہتے تھے لہٰذا اگر کہیں سلسلۂ تحریر میں کوئی دشواری محسوس ہو تو اسے ایک مجبوری سمجھا جائے۔ (ادارہ)

میں اپنے بارے میں کیا لکھوں۔ کوئی چیز ہے جو اندر سے روکتی ہے، جھڑکتی ہے کہ اپنے متعلق کچھ نہ لکھ۔ اپنے بارے میں کچھ نہ کہہ۔ شاید یہ بھی کوئی نفسیاتی گرہ ہے

۱؎ یہ نامکمل مضمون جو رئیس صاحب کے اپنے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے، "ابوظہبی میں" رئیس امروہوی عالمی سیمینار" کے لیے وہ تحریر کر رہے تھے لیکن افسوس کہ قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔

جوکہ ذہن کو پابہ زنجیر کیے ہوئے ۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ دوستوں کی فرمائش ہے تو مجھے اپنی ذات اور صفات (یعنی فن) کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ لکھ جانا چاہیے کہ آزردن دل دوستان جہل است وکفارہ عین سہل ۔ ممکن ہے کہ پھر لکھنے لکھانے کا موقع نہ ملے ۔ امکان تو یہی ہے کہ نہ ملے گا ۔ البتہ یہ بات ہمت بڑھاتی ہے کہ ۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

شاید لکھنے والے کے بارے میں یہ تحریر باقی رہ جائے ۔ میرا نام ہے محمد مہدی والد مرحوم کا اسم گرامی تھا (سید) شفیق حسن ۔ تخلص فرماتے تھے اختر اور ابلیا۔ دلی سے ۸۰ میل مشرق میں اور لکھنؤ سے تین سو میل مغرب میں ایک بستی ہے (بلکہ ہمارے نقطۂ نظر سے ایک بستی تھی) امروہہ ۔ ہمارے آبا و اجداد حجاز، عراق اور ایران میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے غالباً غیاث الدین تغلق یا اس کے کسی پیشرو کے زمانے میں ملتان پہنچے ۔ جدِ اعلیٰ کا نام (سید) حسین، شریف الدین تھا جنھیں اب تک شاہ ولایت کے لقب سے یاد کرتے ہیں ۔ ان کا مزار امروہے کے مغرب میں قصبے سے متصل واقع ہے ۔ احاطۂ مزار کی مشہور کرامت یہ ہے کہ بچھو خواہ کتنا ہی موذی، مہلک اور سفاک کیوں نہ ہو ۔ مزار مبارک کے احاطے میں ڈنک نہیں مارتا ۔ جو لوگ اس خارق العادت مظہر پر شک کرتے ہیں وہ باہر سے خونخوار بچھوؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں ۔ انھیں شاہ ولایت کی قبر کے نزدیک چھوڑا جاتا ہے اور پھر چھیڑا جاتا ہے تو نیش زنی سے باز رہتے ہیں ۔ گویا اپنی فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں ؎

نیشِ عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

اس غیر طبعی مظہر کی کیا تاویل کی جائے گی ۔ مجھے نہیں معلوم ۔ امروہے کو آج سے سو پچاس سال پہلے امروہہ سادات رسادات امروہہ کے غلبے اور اقتدار کے

سبب) اور امروہہ شریف (شرفار کی بستی ہونے کی وجہ سے) کہتے تھے۔ سادات میں اکثریت سادات نقویہ کی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے خانوادہ ہائے سادات بھی تھے۔ ان میں آپس میں رشتے داریاں تھیں اور یہ سب دانے ایک ہی تسبیح فاطمہ میں پروئے ہوئے تھے۔ سلاطین دہلی کے عہد میں امروہے کے سادات و شرفار کی گزراوقات کا ذریعہ منصب داریاں تھیں۔ سادات باہرہ کی طرح یہ بادشاہ گر تو نہ قرار پا سکے البتہ منصب داران شاہی میں ان کی تعداد کافی تھی۔ بہت سے لوگوں کو نسلاً در نسلاً جاگیریں ملی ہوئی تھیں جو فوجی خدمات کا انعام تھیں۔ ہمارے پردادا سید امیر حسن امیر مرحوم کی الماری میں ایک بوسیدہ شاہی فرمان عبرت اولی الابصار کے لیے موجود تھا اور اس کے ساتھ ایک خریطہ نتھی تھا۔ جس میں آل تمغہ معافی کے ستر اسی دیہات کی تفصیل درج تھی جو حسن خدمات کے صلے میں ہمارے بزرگوں کو وقتاً فوقتاً دربارِ شاہی سے عطا ہوئے تھے۔ یہ گاؤں کہاں غارت ہوئے؟ مجھے نہیں معلوم۔ میرے بچپن میں تو دادا سید نصیر حسن نصیر کے تصرف میں صرف ایک گاؤں رہ گیا تھا جعفرآباد۔ غالباً ۱۹۲۰ء میں بڑے ابا (دادا) نے اسی ہزار روپے کا قرضہ اتارنے کے لیے اسے بھی فروخت کر دیا گویا قصہ کوتاہ گشت ورنہ درد سر بسیار بود۔ ہماری برادری میں صاحبانِ سیف بھی تھے اور صاحبانِ قلم بھی اور سچی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں سیف و قلم کے درمیان وہ فاصلے حائل نہ ہوئے تھے جو قواعدداں پیشہ ور فوجی دستوں کے وجود میں آنے کے بعد حائل ہو گئے۔ امروہہ کبھی شعرار سے خالی نہیں رہا۔ شمالی ہند میں اردو کے غالباً پہلے مثنوی نگار سید اسمٰعیل امروہے کے ہی رہنے والے تھے۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں میر سعادت علی۔۔۔ کا ذکر کیا ہے جنھوں نے میر صاحب کو ریختہ گوئی کی طرف متوجہ کیا تھا۔ میر سعادت علی کا صرف ایک شعر ہم تک پہنچا ہے ؎

سعادت شب تماشے میں اگر تیری نئی جوتی
گئی تو جانے دے دردانہ کے بھڑوں کے سر صدقے

دردانہ کوئی کنچنی (ناچنے والی طوائف) تھی۔ میر صاحب اس کے مجرے (جلسۂ

رقص، میں گئے اور اپنی نئی جوتی کھوآئے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی بھی اس خاکِ پاک سے اٹھے تھے چونکہ احساس کمتری کے مارے ہوئے تھے۔ لکھنؤ پہنچ کر اپنے کو دہلی والا کہلوانے لگے۔ خیر یہ تو تفصیل طلب کہانیاں ہیں۔ ہم نے اپنے بزرگوں کی عظمت، وفاداری، سرفروشی، دین داری اور وضع داری کے جو دیو مالائی قصے سنے ہیں ان کو بہت حد تک ڈرامہ انگیز تخیل کی اختراع سمجھا جائے گا۔ مگر یہ قصے ہماری تشکیل شخصیت کا جزوِ اعظم ہیں اور ہمیں کیا غرض پڑی ہے کہ ہم اپنے آباء و اجداد کی شخصیت کے گرد پُراسرار ہالہ پیدا کرنے والے طلسماتی دیو مالا سے دست بردار ہوجائیں۔ میری یادداشت کے نقش غالباً ۱۹۲۰ء سے اجاگر ہونے شروع ہوئے ہیں۔ میں وہیں سے اپنے بارے میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

والد مرحوم نے اپنی بیاض میں لکھا ہے کہ میری پہلی شادی مسماۃ فاطمہ (دختر حاجی سید کرار حسن ساکن کلہ مچھر تبہ امروہہ) سے ۲۱ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ کو ہوئی۔ پہلی بیوی فاطمہ کا انتقال ۲۹ صفر ۱۳۲۵ھ کو یعنی ایک سال کے بعد ہوگیا۔ پھر میرا عقد واحدہ خاتون بنت سید کاظم نذر مرحوم سے ۱۴ شعبان ۱۳۲۵ھ کو ہوا، اس کا انتقال رخصتی کے بغیر یکم صفر ۱۳۲۶ھ کو ہوگیا۔ ۷ شعبان کو میرا عقد ثالث مسماۃ نرجس خاتون دختر حاجی سید کرار حسین مرحوم سے ہوا اور ۱۳ رجب کو شادی ہوئی۔ جس سے سید محمد مہدی (اچھن) سید محمد تقی (چھچن)، سید محمد عباس (بچھن) اور جون اصغر (جون ایلیا) متولد ہوئے اور دختر نجفیہ سلمہا۔

والد بزرگوار نے اس جانب کے مولود مسعود (نا مسعود) کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ:۔

بتاریخ ۲۱ ماہ شوال ۱۳۳۲ھ ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء بروز ہفتہ بوقت نو اور دس بجے دن کے خدا نے مجھے فرزند عطا فرمایا۔ اس کا نام محمد مہدی عرف اچھن قرار پایا۔ والد مرحوم مستند شاعر تھے۔ دادا مرحوم سید نصیر حسن نصیر حقیقی معنی میں شاعر تھے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ اپنے کو نصیر تخلص سے ضرور مرقع بلکہ مسلح رکھتے تھے کہ اس زمانے میں تخلص رکھنا اور تک بندی کرنا لازم تصور کیا جاتا تھا۔ ہمارے امروہوی

معاشرے میں بے تخلص کے خاندانی شخص کو دُم کٹا بھینسا یا بے سینگوں کا بیل سمجھا جاتا تھا۔ امارت، فارغ البالی اور اقبال مندی کا دور کبھی کا ختم ہو چکا تھا اور اب ہمارے بزرگوں کے لیے لطفِ معاشرت اور لطافت معاشرہ کا وسیلہ صرف شطرنج بازی اور شعر طرازی رہ گئی تھی۔ اس معاشرے میں میرا شاعر ہونا اسی قدر مقتضائے فطرت تھا جس طرح زنگی کا سیاہ فام ہونا! موزوں طبع میں ابتدا ہی سے تھا۔ لہٰذا لفظوں کو جوڑ کر مصرعے تیار کر لینا کچھ ایسا مشکل کام نظر نہ آیا۔ عجیب بات ہے مجھے اس زمانے میں نثر لکھنی زیادہ مشکل نظر آتی تھی۔ البتہ نظم کو بچوں کا کھیل سمجھتا تھا۔ ہمارے گھر والے باضابطہ تعلیم کی اہمیت سے واقف نہ تھے۔ انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ کسی سرکاری اسکول میں داخل کرانے کے بجائے ہم بھائیوں (سید امیر حیدر کمال امروہوی، اور سید محمد تقی) کے لیے گھر پر مکتب قائم کیا جائے۔ ہماری بسم اللہ خوانی کی تقریب خلیفہ جعفر حسین مرحوم کی نگرانی میں ہوئی، نہ جانے یہ خیال کیوں ہے کہ یہ رسم ۱۹ جولائی ۱۹۱۹ء کو ادا ہوئی تھی۔ امروہے میں ائمہ اہلِ بیت کی ولادت اور وفات کے روز قصیدہ خوانی کی محفلیں اور نوحہ سرائی کی مجلسیں بڑے اہتمام اور احتیاط کے ساتھ منعقد ہوتی تھیں۔ یہاں سے میری منبر خوانی کا آغاز ہوا۔ بڑے تایا سید نفیس حسن مرحوم نے ذاکر کی حیثیت سے بھی منبر پر بٹھا دیا۔ یہ بہت کم عمری کی بات ہے۔ بہرحال اس طرح مجھے مستقبل کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ لیکن بزرگوں کی نظر میں ہمارا مستقبل کیا تھا وہ ہمیں کیا بنانا چاہتے تھے۔ آج ۵۰ سال بعد بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا حالانکہ ہماری برادری ہی کے بچے بخوشی یا بجبر انگریزی اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور شیعہ کالج لکھنؤ میں داخل تھے۔ مولوی سید اعجاز حسن مرحوم نے تو اپنے صاحب زادے سید امتیاز حسن کو ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت (لندن) بھیجا تھا اور حامد علی خاں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ گئے تھے۔ ہمارے گرد و پیش یہ سب ہو رہا تھا اور ہم نہایت خوش رفتاری اور اطمینانِ کامل کے ساتھ فارسی، عربی، ادبیات کی کلاسیکی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ اس ماحول میں میری

قدرتی ذہانت اور باطنی استعداد کو بجز شاعری اپنے اظہار کے لیے کوئی ذریعہ میسر نہ تھا میں دس بارہ سال کی عمر ہی میں شعر کہنے لگا تھا اور پھر بابا کی نظمیں، نعت و منقبت، تو مجھے ورثے میں مل تھیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ والد مرحوم کے جو ممکنات شعر ان کے دوسرے علمی و تحقیقی مشاغل کے سبب بروئے کار نہ آسکے اور ان کی محتاط و پارسا طبیعت نے تغزل و تخیل کے جس طوفان کو اپنے نفس کے اندر چھپا دیا تھا وہ سب کے سب کسی پُراسرار قانون جذب و کشش کے تحت ان کے نفس سے میرے نفس میں منتقل ہو گیا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ تمتع زہر گوشہ یافتم۔ کیوں کہ میں نے کسی گوشے سے تمتع حاصل نہیں کیا بلکہ شفقتِ پدری کا ایک ہی گوشہ تھا جو ہمیشہ میرے لیے فیضان کا سرچشمہ رہا اور ہے سہ

تا زلیخانہ ولے نام و نشاں خواہد بود
سرِ من خاک رہ پیرِ مغاں خواہد بود

مختصر یہ کہ چودہ پندرہ برس کی عمر ہی میں راقم الحروف کے دماغ میں یہ خناس سما گیا تھا کہ شعر کی حد تک میں بھی کچھ ہوں، بلکہ بہت کچھ ہوں۔ لاحول ولا قوۃ۔ ہمارے ہم ذوق ساتھیوں میں حیات امروہوی، کمال امروہوی، سید منصور حسین نجم، آل نبی وفا اور تاباں نقوی قابلِ ذکر ہیں۔ کمال امروہوی میرے منجھلے تایا سید انیس حسن مرحوم کے فرزند اصغر ہیں۔ ان کی اور میری پرورش ایک ساتھ ہوئی۔ شعر گوئی کے بجائے ان کا رجحان ڈرامہ نگاری کی طرف تھا اور بلاشبہ اس فن میں انھوں نے اپنے نام (کمال) کا سکہ اطرافِ عالم میں رواں اور رائج کر دیا۔ بہت بچپن کا ایک شعر ہے سہ

ایک ہی شاخ کے دو گل ہیں رئیس اور کمال
یہ تو ناقص ہی رہے اور وہ کامل ٹھہرے

حیات امروہوی کو ان کی یہ غزل ہمیشہ زندہ رکھے گی سہ

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے
ایک تیری اک مری آواز ہے
ٹوٹ جائے زندگی کے ساز کی
زندگی آواز ہی آواز ہے

افسوس کہ حیات امروہوی کا سازِ زندگی بہت جلد بے آواز ہو گیا۔ حیات کی جواں مرگی نے ایک عجیب شیوا بیان، شبنم گفتار اور شیوہ طراز شاعر کو مجھ سے چھین لیا۔ قہر یہ ہے کہ اب ان کا کلام بھی دستیاب نہیں۔ ہمارے بابا مرحوم کی بیاضوں پر بھی یہی سانحہ گزرا۔ والد مرحوم جید اور مستند شاعر ہونے کے باوجود شعر کو والی مرتبہ علم و ادب قرار دیتے تھے۔ ان کا رجحان مطالعۂ مذاہب، تقابل مذاہب، ہیئت، تاریخ (مناظرانہ لب و لہجہ لیے ہوئے) اور الہٰیات کی طرف تھا۔ میرے چھوٹے بھائیوں سید محمد تقی اور جون ایلیا نے ادبی ذوق کے ساتھ فلسفیانہ رجحان بھی بطور ورثہ انہی مرحوم سے حاصل کیا ہے۔ ابتدا میں اپنے کو اس سلسلے میں تہی دامن اور کم ذوق سمجھتا تھا۔ ناگاہ اور یکایک میری روح پر بھی فلسفے کی تجلی نازل ہوئی اور نفسیات کا ایسا والہانہ ذوق پیدا ہوا کہ اپنے مضامین کے ذریعے لاکھوں قارئین کو لوگ "نفسیات اور مابعد النفسیات" (یہ اصطلاح بھی ایجاد بندہ ہے۔ مابعد النفسیات یعنی پیرا سائیکالوجی جسے اب ایک سائنس تسلیم کر لیا گیا ہے) کا دیوانہ بنا دیا۔ لوگ مجھے نہ جانے کیا سمجھتے ہیں۔ جادوگر، تنویم کار، یوگی، روحانی رہنما، پیر و مرشد، سبحان اللہ کہتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔

میرے آغازِ جوانی میں امروہہ سے چند ہفت روزے اور ماہنامے شائع ہوتے تھے۔ حیات مرحوم کا ماہنامہ "حیات" معصوم حسین نجم کا ماہنامہ "" اور ایک ہفت روزہ "اتحاد" "قرطاس" "انصاف" "پبلک گزٹ" وغیرہ۔ اخبار بینی کا شوق ابتدا سے تھا اور وقت کی سیاسی صورت حال ذہن پر شدت سے اثر انداز ہوتی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ایں جانب مقامی پرچوں میں مسلسل لکھنے اور دھڑا دھڑ چھپنے لگے۔ امروہے کی بھولی بھالی صحافت (جس کا واحد ذریعۂ معاش منصفی اور کچہری کے نوٹس اور اعلانات بھرا کرتے

کرتے تھے، پہلے ہی حملے میں سپر انداختہ ہوئی، اب ہمیں توسیعِ مملکت کی فکر لاحق ہوئی۔

کمال امروہوی اس زمانے میں لاہور کے ہفت روزہ حمایت الاسلام اور کئی دوسرے اخباروں سے وابستہ تھے۔ کمال کے توسط سے میری بہت سی نظمیں لاہور کے کئی روزناموں میں شائع ہوئیں۔ یہ زمانہ قومی اور اسلامی نظموں کے عروج و کمال کا زمانہ تھا۔ ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا کے زیر اثر قومی اقبال کے زوال کا ماتم! اور اپنے ادبار کی نوحہ سرائی دوستوں کو پسند تھی۔ دلّی سے ایک صاحب "تیج" کے دفتر سے (یہ ایک کانگریسی روزنامہ تھا) ہفت روزہ "آئینہ" نامی ایک پرچہ نکالتے تھے ابن الحسن فکر ایم اے (غالباً یہی نام تھا) اس کے مدیر اور منشی حامد علی خاں امروہوی اس پرچے کے ہیڈ کاتب یعنی میر منشی تھے۔ لکھنؤ سے روزنامہ "اسد" اور "سرفراز" شائع ہوتے تھے۔ ان سب پرچوں پر ایں جانب بیک وقت چھاپے مارتے تھے۔ یہ تو تھیں ۱۹۳۲-۳۴ء کی صحافتی سرگرمیاں جن کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ لیکن نظموں کے علاوہ میں نے نثر میں بھی خامہ فرسائی شروع کر دی۔ ماہنامہ "حیات" کے مدیر ہمارے دوست حیات امروہوی اور پبلشر مجاہد حسین جوہر تھے۔ ماہنامہ "حیات" میں میرا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ یہ ایک رومانی اور خیالی قسم کی واہمہ طرازی تھی۔ البتہ مولوی معشوق حسین نجم کے ماہنامہ "ادراک" میں میں نے ابن بطوطہ کے سفرنامے کے متعلق متعدد قسطوں میں ایک مضمون لکھنا شروع کیا جو "ادراک" کی دو تین اشاعتوں تک جاری رہا۔ امروہے میں بزم حق نما کے نام سے ایک انجمن بعض دوستوں اور بزرگوں نے قائم کر رکھی تھی۔ چچا مشتاق حسین مرحوم، چچا سعادت حسن مرحوم اور کئی دوسرے بزرگ اس بزمِ حق نما کے کرتا دھرتا تھے۔ یہ بزم ربیع الاول کے مہینے میں مذہبی روایات پر مشتمل بعض ڈرامے کیا کرتی تھی۔ میں نے اس بزم کے لیے ایک ڈرامہ لکھا اور مجھے حیرت ہوئی کہ یہ ڈرامہ بحسن و خوبی اسٹیج کیا گیا اور لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اب اگر اپنے بارے میں قلم اٹھا لیے تو یہ بھی صفائی سے اقرار کر لینا چاہیے کہ بیس برس کی عمر میں

روایتی مذہب کی حلقہ بگوشی سے میں قطعاً آزاد ہو چکا تھا لیکن مذہبی عقائد کی سماجی اہمیت اور نفسیاتی اثرات سے میں کبھی منکر نہیں ہوا۔ میرا بچپن ایک ایسے ماحول میں گزرا جہاں اوہام کے بطن سے شاندار اور خوب صورت مفروضے جنم لیتے تھے۔ اس قسم کا ماحول روایت پسند قصبات میں پایا جاتا تھا۔ ان سطور کی تحریر کے وقت میں خود بھی سوچ رہا ہوں کہ وہ کون سے حیاتیاتی اور نفسیاتی عوامل تھے جنھوں نے مجھے "میں" بنا دیا۔ یعنی میں۔ رئیس امروہوی ہوں۔ بچے کی حیاتیاتی اور روحانی ساخت بطنِ مادر میں ہوتی ہے۔ وہ نو مہینے ازل اور ابد کی مسافت رکھتے ہیں جو ماں کے پیٹ میں گزرتے ہیں ؎

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے ایک دن
یہ دن تڑپ تڑپ کے بسر کر رہے ہیں ہم

انسان پشتِ مادر میں ایک ہیجان انگیز قطرۂ خون تھا۔ شکمِ مادر میں منتقل ہونے کے بعد یہ قطرۂ خون فرد میں تبدیل ہوا۔ قطرۂ خون کی جیتے جاگتے، بولتے چلتے اور چلتے پھرتے فرد میں تبدیلی کائنات کا ایک لامثال اور بے نظیر واقعہ ہے۔ جس کے رموز و اسرار نہ اب تک کسی فلسفی کی سمجھ میں آئے ہیں نہ کوئی نفسیات داں اس عقدۂ لاینحل کو سلجھا سکا ہے۔ البتہ اس باب میں مذہب ایک مستحکم اور غیر مشتبہ بنیاد پر کھڑا ہے۔ نہ سائنس یہ بتاتی ہے کہ مشتِ خاک کو بشر کا روپ کیوں دیا گیا اور پھر بشر کو مشتِ خاک میں کیوں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ نہ فلسفہ ان سوالات کا جواب دیتا ہے۔ اکثر مذاہب تخلیقِ انسان کے بارے میں ایک طلسمی فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی اصرار کرتے ہیں ؎

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

خیر میں اپنے پر نظرِ بازگشت ڈال رہا ہوں۔ اگر مجھ میں کوئی حقیقت پسندی ہے تو وہ میری ماں (سیدہ نرجس خاتون) کا عطیہ ہے اور اگر مجھ میں رقتِ قلب اور سوز و گداز کی کیفیت موجود ہے (اور یقیناً موجود ہے)، تو وہ والد مرحوم کا ورثہ ہے۔ یا شاید معاملہ اس کے برعکس ہو۔ کیوں کہ مجھے یاد ہے کہ میری ماں پر ہسٹریا کے دورے پڑا

کرتے تھے اور ہم باور کرتے تھے کہ کوئی زبردست جن ان کے سر پر کھیلتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے اماں مرحومہ کا بیان کردہ ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ کہانی سناتے ہوئے انھوں نے مجھے بتلایا تھا کہ شادی سے قبل ایک روز وہ خالہ راضیہ مرحومہ اور خالہ مطاہرہ مرحومہ اپنی وسیع اور نیم شکستہ حویلی میں موجود تھیں۔ تپتی ہوئی دوپہر، گرمیوں کے دن، سائیں سائیں لُو چل رہی تھی اور زمین و آسمان کے درمیان گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دنیا کرۂ نار کے کسی خوفناک ترین حصے سے گزر رہی ہے۔ اماں مرحومہ کہتی تھیں کہ اس وقت مجھ پر جنون سا طاری ہوا اور میں نے حویلی کی ایک بند کوٹھری کے قفل کو مروڑ دیا۔ تالا ٹوٹ گیا اور دونوں (مرحومہ) بہنیں سہم گئیں ہمارے ننہیال کی دیوار کے نیچے اونٹ والے رہتے تھے۔ ان کی اونٹ گاڑیاں امروہے سے مرادآباد تک چلتی تھیں۔ وہاں نیم کے کئی پیڑ تھے۔ میں دیوار پر چڑھ کر ان اونٹوں کو شوق سے تکا کرتا تھا۔ مجھے اس وقت بڑا مزہ آتا جب اونٹ نیم کے پتوں کی گٹھڑی کو چبا کر اپنی لمبی گردن کے ذریعے معدے میں منتقل کرتے اور چند سیکنڈ کے بعد چارے (نیم کے پتوں) کی وہی گٹھڑی ان کی لمبی گردن سے گزر کر معدے سے جبڑے میں آتی اور جفاکش اونٹ مزے لے لے کر اس نگلی ہوئی غذا کو اگل کر اپنے دل فریب منہ میں پلکیں جھپکاتے، غذا کو چباتے اور جب اس غذا کو خوب پیس لیتے تو پھر اس کو معدے میں اپنی دو فٹ لمبی گردن کے ذریعے منتقل کر دیتے۔ یہ منظر بطور خاص میری دلچسپی کا سبب ہوتا، آج تک اونٹوں کا یہ تصور اور یہ تصویر حافظے میں زندہ ہے۔ ہاں تو ہماری ننہیال کی دیوار کے نیچے (جہاں اونٹوں کا ٹھکانہ تھا) بیری کا ایک درخت تھا۔ جس سے عجیب خوفناک کہانیاں وابستہ تھیں ایک روز اماں مرحومہ نے عالم وحشت میں (یہ کیفیت ان پر اکثر طاری ہو جاتی اور اس عالم میں ان کی آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سرخ ہو جاتیں) دیکھا کہ جھر بیری کے اس پیڑ کی ٹہنی پر کوئی لڑکی سرخ کپڑے پہنے بیٹھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ التباس حواس کی ایک شکل تھی محض واہمہ! مگر یہی واہمے تو انسانی شخصیت کے مرکز پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ میری شاعری پر میرے ماں باپ کی

عصبی کیفیت کا کیا اثر پڑا ؟ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر پڑا ضرور ہے سہ

مہبطِ روحِ ازل میرا دماغ
اور آسیب زدہ ہے میرا دل
اک حور سے ہوتی ہے ملاقات سرِ شام
اک روح ڈراتی ہے مجھے آخرِ شب میں

یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ ایک زمانے میں ہر روز سرِ شام کسی حور سے ملاقات ہوتی تھی اور شاید دو چار مرتبہ کسی روح نے آخرِ شب میں مجھے ہیبت زدہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے سہ

رہزن ہیں چپ و راست جلو میں ہیں حوادث
اور لشکرِ ارواحِ خبیثہ ہے قفا میں

کوئی شبہ نہیں کہ میرا ذہن خوفناک تصورات کا زندان خانہ ہے سہ

رئیس حجرۂ تاریک جاں کو کھول تو دوں
جو کوئی آفت قتالِ جہاں نکلے ؟

اور یہ شعر بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں سہ

مرے شعور کا عرفاں کسے نصیب کریں
سروشِ روحِ ازل ہوں سما سے آیا ہوں
دمک رہی ہے زمان و مکاں کی پیشانی
ستارۂ ابدی ہوں خلا سے آیا ہوں
تمہارے غنچہ و گل سے غرض نہیں مجھ کو
ادھر اشارۂ بادِ صبا سے آیا ہوں

بھوت بن کر مجھے ڈراتی ہیں
میری نا آفریدہ تخلیقات

کون آیا مرے تعاقب میں
وہی فکر و خیال کے جنّات
کس نے پیچھے سے قہقہہ مارا
یہ اندھیرے میں کون ہے مرے ساتھ

میری ذہنی ترکیب و تربیت میں جن عوامل نے حصّہ لیا ہے ان میں کچھ تو موروثی ہیں یعنی سو پشت سے ہے پیشۂ آبا و سپہ گری (سپہ گری کے بجائے سخن وری سمجھ لیجیے) امروہے کا شاعرانہ ماحول، والد مرحوم کی تشویق بلکہ تشویش خود میرا بے قابو اور سرکش ادبی و شعری رجحان! محلّے بھر کی عورتوں کی فرمائش پر گیت، سہرے اور رخصتی نظمیں لکھتا۔ جب ذرا لکھنے پڑھنے کی تمیز آئی تو بھائی سید معراج النبی عروج کے شوق دلانے پر داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ عجیب سحر انگیز زمانہ تھا۔ ہر وقت دماغ میں اہرج نامے اور تورج نامے کے جادوگر اچھل کود کرتے رہتے تھے۔ جب اور شعور بڑھا تو خود طلسم ہوشربا کی ایک داستان شروع کر دی۔ اس داستان حسرت بیان کے سامعین میں سید امیر حیدر، کمال امروہوی، سید محمد تقی اور مولوی سید تصدق حسین مولوی فاضل قابلِ ذکر ہیں۔ منشی اور منشی فاضل کے امتحانات کے سلسلے میں دو ایک بار لاہور جانے کا اتفاق ہوا، وہاں اختر شیرانی اور جناب وقار انبالوی مرحوم کے علاوہ علّامہ اقبال کی خدمت میں بھی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

جون ۱۹۳۲ء میں این جانب کو عقد کے بندھنوں میں باندھ دیا گیا ؎

مبارک ہو تمہیں اے دوستو! تکمیل بربادی
تمہاری کوششوں سے ہو گئی آخر مری شادی

لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ شادی ہر اعتبار سے محفوظ و مسعود ثابت ہوئی اور احقر کو عقدِ ثانی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد چلا گیا اور ایک سال سے کچھ اوپر اپنے بڑے ماموں سید حامی حسن وکیل ضلع بیڑ اورنگ آباد اور منجھلے ماموں سید حامد حسن (نظام آباد) کے یہاں قیام رہا۔ بڑے ماموں کے صاحبزادے ڈاکٹر خیال امروہوی

اردو فارسی کے ممتاز شاعر اور مصنف ہیں۔ منجھلے ماموں کے لڑکے اختر نقوی کا ذوقِ سخن بھی قابلِ اعتبار ہے۔ لیکن ان کی شدید مذہبی جس نے انھیں زاہد خشک بنادیا ہے۔ اختر کے لڑکے ماشاء اللہ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں سرگرم ہیں۔ معاشی کے لحاظ سے یہ بہت تنگی اور تنگ دستی کا زمانہ تھا۔ ہندوستان انقلابی دور سے گزر رہا تھا اور ہمیں اپنے پاؤں کے نیچے زمین دلبتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میرا اور سید محمد تقی کا رجحان کانگریس کی طرف تھا۔ رجحان ہی نہیں، ہم باقاعدہ کانگریس کے ممبر تھے۔ بلکہ میں نے کانگریس وزارتوں (۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء) کے زمانے میں کانگریس کے رکن کی حیثیت سے گمام سدھار تحریک میں باضابطہ کام کیا تھا۔ اس زمانے میں سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد اشرف، پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگریسی لیڈروں سے گہرے سیاسی تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ مولوی منصور حسین نجم سادات امروہہ کے انقلابی نوجوانوں کے رہنما تھے اور ہم اپنا شمار کانگریس کے بائیں بازو میں کرتے اور کراتے تھے۔ اس زمانے میں حافظ محمد ابراہیم اور بشیر بھٹہ کا الیکشن بڑا ہنگامہ خیز انتخابی معرکہ تھا۔ حافظ ابراہیم کو کامیاب بنانے کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو خود امروہے تشریف لائے تھے۔ ایک جلسۂ عام کو خطاب کیا تھا اور وہاں سے نوگانواں (قصبہ) کے محاذ پر تشریف لے گئے تھے۔ میں نے ان جلسوں میں انقلابی نظمیں پڑھی تھیں۔ ہم کیا اور ہماری بساط اور حیثیت کیا ہے، تاہم اس زمانے میں جب کہ ضلع مرادآباد کا زمیندارانہ ذہنیت رکھنے والا طبقہ انگریز پرستی کو اپنا ایمان اور کانگریس کو شیطان سمجھتے تھے۔ امروہے کے چند سیدزادوں کا آل انڈیا کانگریس میں شمول ایک ایسا بھونچال تھا۔ جس کی دھمک دور دور تک محسوس کی گئی۔ ان ہنگامہ آرائیوں میں شغلۂ شعر و سخن بھی جاری تھا۔ اردو میں بھی فارسی میں بھی، یہ بھی عرض کردوں کہ فارسی شاعری سے مجھے طبعی مناسبت ہے اور اگر میں فارسی میں شعر گوئی کا سلسلہ جاری رکھتا تو سبک ہندی کا خاصا نام آور فارسی شاعر شمار ہوتا رہا ہے! کیا عجیب پر کیف زمانہ تھا۔

روزِ وصلِ دوست داراں یاد باد
یاد باد آں روزگاراں یاد باد

کہاں تک اس قصے کو طول دوں کاش گردشِ ایام پیچھے کی طرف دوڑ جاتی،
اور میں چھلانگ لگا کر اپنے ماضی میں جا پہنچتا ؎

گر بود عمر بہ میخانہ رسم بارِ دگر
بجز از خدمتِ رنداں نہ کنم کارِ دگر

کانگریس کا دور بھی گزر گیا۔ ہم گام سدھار تحریک کے سلسلے میں گھوم گھماتے
اور گھومتے پھرتے اس کوچے میں جا پہنچے۔ جس میں اب تک بھٹک رہے ہیں۔ خاکسار
کی جسمانی ولادت آغاز جنگِ عظیم اوّل کے دوش بدوش پھیلی ہوئی تھی یعنی ۱۲ ستمبر
۱۹۱۴ء! گویا بندۂ ناچیز کرۂ ارض پر جنگِ عالم گیر بن کر نازل ہوا تھا۔ میری دوسری
پیدائش باضابطہ صحافی کی حیثیت سے ستمبر ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ جب دوسری جنگِ عالمگیر
کا پہلا آتشیں گولہ داغا گیا۔ ان دونوں جنگوں کا درمیانی وقفہ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۳۹ء)
میری تشکیل کا زمانہ تھا۔ شعر بھی کہتا تھا، نثر بھی لکھتا تھا، سیاسی سرگرمیوں میں بھی
حصہ لیتا تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ انجمن سازیاں بھی کرتا تھا۔ پارساؤں
کا محفل نشین بھی تھا اور رندوں کا صدر محفل بھی، اس زمانے کے بہت سے فسانے اور
بہت سے افسوں یاد ہیں۔ مگر اب کیا؟ اب کیوں ان کہانیوں کو دہرایا جائے ؎

برد فسانہ منخواں وفسوں ہمدم حافظ
کزیں فسانہ وافسوں مرا بسے یاد است

ہر چند کہ شادی شدہ تھا۔ مگر اس زمانے میں قلب پر ایک واردات بھی گزری،
چھیالیس سینتالیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ بایں ہمہ اس واردات کے اثرات اب بھی
گاہے گاہے محسوس کرتا ہوں ؎

جنوں اپنا ہی دلدادہ ہے اب تک
یہ مستی تشنۂ بادہ ہے اب تک

اجازت ہے تمہارا نام لکھ لوں
مرے دل کا ورق سادہ ہے اب تک

پھول ہیں ننگ مری ہمتِ عالی کے لیے
لاؤں گا توڑ کے تارے میں خیالی کے لیے
میں تو آیا ہوں پئے نذر دل و جاں لے کر
تم نے کیا سوچا مرے دامن خالی کے لیے

ستمبر ۱۹۳۹ء میں کوکب مرادآبادی اور عادل ادیب مرادآبادی (مرحومین) کے ساتھ ہم نے اسلامیہ مسافر خانہ مرادآباد سے ماہنامہ "مسافر" کا اجرا کیا۔ یہ پرچہ پہلے حضرت افق امروہوی مرحوم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ قلیل مدت میں اس شمارے نے اپنا شمار مقبول عام ماہناموں میں کرالیا۔ اس کے ساتھ ہی روزنامہ "جدت" مرادآباد سے وابستہ ہوگیا۔ یہ یوپی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا واحد روزنامہ تھا۔ بعد کو چودھری خلیق الزماں کی ادارت میں لکھنؤ سے روزنامہ "تنویر" کا اجرا ہوا۔ ان صحافتی مصروفیات کے ساتھ میں ہفت روزہ "مخبرِ عالم" مرادآباد اور قاضی عبدالغفار مرادآبادی کے روزنامے (پیام، دکن، حیدرآباد) کے لیے بھی مضامین لکھتا تھا۔ "مخبرِ عالم" کے لیے مستقلاً اور "پیام دکن" کے لیے اس وقت جب قاضی عبدالغفار مرحوم چھٹی منانے کے لیے حیدرآباد سے مرادآباد آیا کرتے تھے۔ صحافت کا پیشہ میں نے ذریعۂ معاش کے طور پر اختیار نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ تقسیم سے قبل صحافت سرے سے حصولِ معاش کا ذریعہ تھی ہی نہیں۔ اخبار سے بہ مشکل اتنی یافت ہوتی تھی کہ آدمی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھ سکے۔ میں بیک وقت متعدد پرچوں میں جبرِ معاش کے سبب نہیں لکھتا تھا بلکہ میرے اندر کوئی چیز تھی جو ہر چیز لکھتی اور ہر چیز لکھواتی تھی۔ یہ کیا چیز تھی۔ میں اب تک نہیں سمجھا اور اس لمبیز میں یہ چیز اب تک علیٰ حالہٖ برقرار ہے۔ اب میں پچھترویں سال کی منزل طے کر رہا ہوں۔ اب بھی یہ حال ہے کہ اگر اپنی بکواس کو قلم بند نہ کروں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔

کچھ نہیں تو خطوط کے جوابات ہی سہی۔ پچھلے چالیس سال میں میں نے دو لاکھ سے کم خطوط تو نہ لکھے ہوں گے۔ مجھے ہر روز پچیس تیس خطوط وصول ہوتے ہیں اور اتنے ہی خطوط کے جوابات دینے پڑتے ہیں۔ ان خطوط کے مندرجات اور موضوعات کی حد بندی ممکن نہیں۔ سیاسی مسئلے، سماجی مسئلے، نفسیاتی الجھنیں، جنسی معمے، روحانی مرحلے، ایں جانب کا یہ حال ہے کہ بندہ نہ سیاسی مبصر ہے نہ ماہرِ معاشیات نہ معالجِ نفسیات، نہ مشیرِ جنسیات، لیکن واہ رے دیدہ دلیری کہ ہر مسئلے کا جواب دیتا ہوں اور ہر جواب سے ایک مسئلہ گھڑ لیتا ہوں۔ خدا شاہد ہے کہ مجھے از خود شاگرد بننے اور شاگرد بنانے کا شوق نہیں۔ لیکن ہندوستان، پاکستان اور دوسرے بیرونی ملکوں میں بیسیوں افراد کا اصلاحِ سخن کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ رہا ہے اور رابطہ ہے۔ ان میں متعدد صاحبِ دیوان اور مسلّم استاد بھی ہیں۔ پہلے استادی شاگردی کے رشتے کی بڑی قدر تھی اور لوگ اپنے کو فخریہ تلمیذ رشید فلاں اور جانشین حضرت فلاں لکھا کرتے تھے۔ لیکن آج کل نا زو نیاز مندی کے دوسرے رشتوں کی طرح یہ تعلق بھی بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

الغرض میں نے اتنا تحریری کام کیا ہے کہ خدا کی پناہ! یہی حال ادبی اور سماجی انجمنوں اور اداروں کا ہے۔ امروہہ سے لے کر مرادآباد۔ مرادآباد سے لے کر دہلی اور دہلی سے لے کر کراچی تک جہاں جہاں بھی رہا۔ کوئی نہ کوئی انجمن میری دم سے مزدوری بندھی رہی ہے۔ نہ جانے میں کتنی انجمنوں کا صدر اور سرپرست رہا ہوں اور ہوں۔ کراچی میں دو کالونیاں اور متعدد ادارے، اسکول، لائبریریاں، میرے نام سے منسوب ہیں۔ یہ بحالی و آبادکاری کی اس عظیم الشان تحریک کا ثمرہ ہے جو میں نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد بعد جوش و خروش شروع کی تھی اور جس کے نتیجے میں ہزاروں خاندانوں کی از سرِ نو آبادکاری ممکن ہو سکی۔ گفتگو کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ میں ان سطور کی تحریر کے وقت ۴۱ سال سے روزنامہ جنگ کے لیے روزانہ ایک قطعہ اور ہفتہ وار ایڈیشن کے لیے ایک مضمون پابندی سے لکھتا ہوں۔ اس قطعے کو جنگ کراچی، جنگ لاہور، جنگ کوئٹہ، جنگ راولپنڈی اور جنگ (انٹرنیشنل لندن) سے اردو کے وہ اخبارات بھی نقل کرتے ہیں جو دوسرے

ملکوں سے نکلتے ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا سے غالب اردو زبان، چین سے "فکرِ نو" کناڈا سے "امروز" اور "پاکیزہ"، نیویارک سے "اخبارِ وطن" اسکنڈے نیویا سے "نوائے پاکستان" وغیرہ۔ کبھی کبھی ہندوستان کے بعض اخبارات بھی ان قطعات اور مضامین کو نقل کر لیتے ہیں۔

قیام پاکستان سے ڈیڑھ دو سال قبل مراد آباد میں اپنے حلقۂ احباب کے ساتھ کافی اودھم مچانے، بہت سی انجمنیں بنانے اور بہت سی محفلیں اجاڑنے کے بعد با بدولت دھوم دھڑکے کے ساتھ دلی منتقل ہوئے اور حکیم محمد تقی مرحوم کے پرچے ماہنامہ "مشہور" سے منسلک ہوئے۔ (نامکمل)

○

مولانا کوثر نیازی

حضرت رئیس امروہوی سے مجھے ایک ربع صدی سے نیاز حاصل تھا۔ ایک انسان کی حیثیت سے اور انسانیت دوست انسان کی حیثیت سے میرے دل میں ان کا بڑا مقام ہے۔ احترام آدمی تو شاید ان کا مذہب تھا اور اس معاملے میں وہ کسی مسلک اور مذہب کا امتیاز روا نہیں رکھتے تھے۔ شاعری کا مقام ان کا مولانا ظفر علی خاں کے مرتبے کا نہیں تو ان سے کسی طور کم بھی نہیں۔ بدیہہ گوئی اور پوری اردو شاعری ان کا جواب لانے سے قاصر ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد اتنا بڑا عوامی شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ان کی بدیہہ گوئی اور سیاسی شاعری میں فکر کی جو اتھاہ گہرائی پائی جاتی تھی، وہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھی کہ یہ ایک بہت ہی پڑھے لکھے عالم کے افکار ہیں۔

اردو صحافت، شعر و ادب اور انسانیت کی دنیا میں رئیس مرحوم کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اب ہمارا ملک اسے پُر نہیں کر سکے گا۔

ڈاکٹر آغا سہیل

حضرت رئیس امروہوی صحافی، شاعر، نقاد، منجم، نفسیات داں اور ایک معصوم سیاسی شخصیت تھے۔ ان کی گھریلو زندگی سے کر قومی اور ملکی زندگی تک ایک وسیع حلقہ اثر موجود تھا۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورتِ حال پر ان کے قطعات جو روزنامہ "جنگ" میں بلاناغہ چھپتے تھے اپنے طنز کی نشتریت کے حوالے سے ہمہ گیر اور عالمگیر شہرت رکھتے تھے اور ان قطعات کی مقبولیت کا احاطہ نہایت وسیع تھا۔

وہ ایک وسیع النظر دانشور تھے اور دانش و بینش کے حوالے سے مجہول الفکر بر خود بنیاد پرستوں کو ملک و قوم اور انسانیت کا دشمن سمجھتے تھے۔ اپنی بصیرت سے کام کرتے ہوئے انھوں نے صحافت کے میدان میں بھی اور شاعری میں بھی اہم خدمات انجام دیں۔ وہ اپنی ذات میں بجائے خود ایک ادارہ تھے اور شعر و ادب کے علمی حقائق پر ان کی بخوبی نظر تھی۔ وہ ہمیشہ دقتِ نظر سے کام لے کر بنظرِ غائر ہر شے کا معروضی مطالعہ کرتے تھے۔ انفس و آفاق میں کوئی موضوع ان کی نگاہ سے مخفی نہ تھا۔ وہ ایک عالم متبحر تھے۔ اپنی تحریر و تقریر دونوں میں وہ علم کا سمندر تھے اور غواصی کر کے جو دُرِ مقصود نکال کر لاتے تھے عوام الناس کی نذر کر دیتے تھے۔

بقول میرؔ ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ڈاکٹر سلیم اختر

رئیس امروہوی تخلیقی لحاظ سے بے حد فعال تھے۔ نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ روزنامہ "جنگ" کے لیے ہر روز ایک نیا قطعہ لکھنا آسان کام نہیں تھا مگر مرحوم رئیس صاحب نے اس مشکل کام کو آسان بنا لیا تھا۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں!

• شخص و عکس

• یادیں اور باتیں

maablib.org

سیّد محمد تقی

حضرت رئیس امروہوی کی تحریر کے بارے میں

۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء کے روزنامہ جنگ کے جمعہ ایڈیشن میں بھائی (حضرت رئیس امروہوی) کی "آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے" کی ایک طویل تحریر جس کا عنوان ہے ۔۔۔۔ خود تماشا ہوں۔ خود تماشائی ۔ اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ یہ تحریر ان کی آخری تحریر ہے ۔ کسی بھی مصنف کی آخری تحریر ہمیشہ تاریخی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی رہی ہے اور اس اعتبار سے رئیس صاحب کی یہ تحریر بھی تاریخ کے دامن میں محفوظ رہ جانے والی ایک یادگار دستاویز ہے جو مصنف کی نسبت سے بیش قیمت تحریر کے طور پر باقی رہے گی ۔ لیکن اس تحریر کی چند اور بھی جہتیں ہیں جن کو تاریخ کے ریکارڈ کے حوالے کر دیا جائے تو یہ مستقبل کے مؤرخوں کے ساتھ انصاف ہوگا۔

بھائی نے یہ مضمون یا سوانحی خاکہ ایک ایسے کاغذ پر لکھا ہے جو کوئی ساڑھے گیارہ انچ لمبا اور ساڑھے چار انچ چوڑا ہے اس کے کُل صفحات ساڑھے انیس سے کچھ زیادہ ہیں۔ ساڑھے انیس سے کچھ زیادہ کا مطلب یہ کہ آخری صفحے یعنی بیسویں صفحے پر گیارہ سطریں ہیں۔ جب کہ ہر صفحے پر ۱۹ سطروں کا اوسط آتا ہے۔ مگر آپ یہاں یہ کہیں گے کہ ایسی تفصیلات بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن آپ تھوڑی دیر ان بظاہر غیر ضروری تفصیلات کو برداشت کر لیں کہ ان کا تعلق ان جہتوں سے بڑا گہرا ہے جن کا میں آگے ذکر

کرنا چاہتا ہوں۔

تو یوں کہیے کہ یہ سوانحی خاکہ خاصا طویل ہے۔ تاہم نامکمل ہے، رئیس صاحب اپنی تحریری زندگی کے ابتدائی دور یعنی قیام دہلی کے آغاز تک پہنچے تھے اور یہ بتا رہے تھے کہ وہ حکیم محمد تقی مرحوم کے پرچے ماہنامہ مشہور سے منسلک ہوئے، یہاں یہ سوانحی خاکہ اچانک ختم ہو گیا اور یہ دلچسپ کہانی تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ایک خونخوار گولی کی زد میں آ کر مر گئی۔ نقطۂ اختتام پر ..... خون کا ایک دھبہ کاغذ پر ابھر آیا ہے۔ دہلی کے تمام قیام دہاں سے پاکستان ہجرت اور پھر ۴۱ سال کی پاکستانی زندگی کی ساری داستان اس سوانحی خاکے سے غائب ہے، اس تحریر کا ایک پہلو تو یہ تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا وہ بھی خاصا طویل ہے یعنی یوں کہیے کہ انھوں نے ۲۰۴ سطریں اور کوئی چھ ہزار تین سو الفاظ لکھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کئی نشستوں میں یہ تحریر مکمل ہوئی۔

۲۲ر ستمبر ۱۹۸۸ء جمعرات کے کوئی سوا پانچ بجے تک وہ اپنی ڈائری لکھ رہے تھے جس کے بعد انھوں نے یہ خاکہ لکھنا شروع کیا۔ پھر پانچ بج کر چالیس منٹ کے لگ بھگ ایک دھماکہ ہوا ...... ذرا رک جائیے میں ان آنسوؤں کو پونچھ لوں جو آنکھوں سے ٹپک کر کاغذ پر گرنا چاہتے ہیں ...... جو بعد کو معلوم ہوا کہ گولی کی آواز تھی۔ یہ وہی ظالم گولی تھی جس نے اخلاق و شرافت، تہذیب و انسانیت اور قلم کی پاکیزگی اور معصومیت کا سہاگ لوٹ لیا تھا یوں کوئی پچیس منٹ وہ آخری نشست میں لکھ سکے۔ نہیں معلوم انھوں نے باقی کتنی نشستیں اس تحریر کو دی تھیں کہ واضح طور پر ۲۵ منٹ میں اتنا بڑا مضمون مکمل کرنا ممکن نہ تھا۔

اب اس تحریر کے سب سے اہم اور مرکزی پہلو پر آئیے۔ بیسویں صفحے پر جو آخری صفحہ ہے خون کے چھینٹے موجود ہیں۔ اسی طرح صفحہ ۱۹ پر بھی مگر نسبتاً کم، البتہ انیسویں صفحے کی خالی پشت پر متعدد جگہوں پر خون کے قطرے بکھرے ہوئے ہیں باقی اٹھارہ صفحے صاف ہیں البتہ بیسویں صفحے کی خالی پشت پر بھی چند قطرے نظر آتے ہیں۔

تو یہ تو ہیں اس تحریر سے متعلق بعض پہلو، لیکن یہاں ایک مسئلہ اور بھی ہے جس کی وضاحت ضروری ہے، زیرِ نظر سوانحی خاکہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ انجمن سادات امروہہ کے لیے لکھا گیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے نہیں۔ دبئی میں جناب اظہار حیدر صاحب اور اقبال حیدر صاحب جو کئی اہم ادبی تقریبات کر چکے ہیں اور پچھلے سال برادرِ مکرم جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کے اعزاز میں ایک بین الاقوامی اجتماع کرا چکے ہیں وہ جنوری یا فروری ۱۹۸۹ء میں ایسا ہی اجتماع حضرت رئیس کے سلسلے میں کر رہے تھے چنانچہ اس سلسلے میں ہمارے ایک محترم ساتھی صہبا لکھنوی بھی رئیس صاحب کے بارے میں ایک اینتھالوجی چھاپ رہے تھے اور انھوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ اپنے بھائی کی شخصی زندگی پر ایک تاثریہ لکھوں۔ وہ ابھی لکھا نہ جا سکا تھا کہ یہ سانحہ رونما ہو گیا۔ اسی مذکورہ اجتماع کے لیے رئیس صاحب یہ ایک تفصیلی سوانحی خاکہ مرتب کر رہے تھے جو اگر ان کی زندگی کے پورے پھیلاؤ کو گھیر لیتا تو ایک بڑی دلچسپ کہانی اور تہذیبی سرگرمیوں کی ایک وسیع داستان بن جاتی مگر ایک خطرناک گولی نے ٹیکنیکلی طور پر انتہا درجہ کی خطرناک قسم، اس ادبی و تہذیبی کہانی کے بڑے حصے کو خون میں ڈبو کر رکھ دیا۔

اس ماحولیاتی پس منظر کو سامنے رکھ کر ہم کن نتائج تک پہنچتے ہیں، پہلی بات تو یہ کہ رئیس القلم جناب رئیس امروہوی حروف کی کڑیاں ملا رہے تھے کہ شہیدِ ادب کے محترم رتبے پر فائز ہوئے اور غالباً یہاں یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ حرف۔ یعنی لوگس یونانی فلسفے میں اس کائناتی اصول کا نام ہے جو عقل و شعور کے اظہار کا فرض انجام دیتا ہے، گویا وہ حقیقتِ کبریٰ کے بعد سب سے مقدس تر ذات ہے گویا جناب رئیس نے اس وقت موت کا استقبال کیا جب قلم تحریر کے حروف کو وجود بخش رہا تھا۔ اور قلم ۔۔۔۔ یہ قلم وہ فکر و خیال گیر ذریعہ ہے جس کی عظمت اور جس کے تقدس پر بھرپور زور دینے کے لیے خود ذاتِ احدیت نے اعلان کیا ہے ۔۔۔۔ قسم۔ ن۔ دوات، اور قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھتے ہیں (القرآن)۔ گویا قلم کاری ایک مقدس ترین عمل ہے ایک اہم ترین عبادت جسے ذاتِ احدیت کی انتہائی پسندیدگی کی سند حاصل ہے۔ رئیس صاحب

اسی عبادت میں مشغول تھے کہ انھیں اس پاکیزہ سرگرمی کی تکمیل کرنے سے محروم کر دیا گیا۔ یوں یہ عجیب تر اعزاز ہے جو انھیں تاریخ ادب میں حاصل ہوا۔ دوران تحریر کسی مستند ادیب اور قلم کار کو ایسا اعزاز حاصل ہو سکا ہو کہ اس کے قلم کی روشنائی اچانک خون کے قطروں میں بدل گئی ہو، اس کی کوئی دوسری مثال میری یاد میں موجود نہیں۔ لیکن اس داستان کا سب سے حیرت انگیز پہلو جو خرق عادت کے دائرے میں شامل ہو گیا ہے، اس کہانی کا یہ مرکزی نقطہ ہے کہ خود مصنف کو تقریباً یہ یقین تھا کہ زیر نظر تحریر ان کی آخری تحریر ہوگی۔ ادب عالیہ کے اس محترم نمائندے نے تحریر کے بالکل آغازی جملوں میں صاف اپنے اس خیال کا اظہار کر دیا تھا جو یقین کی حد تک پہنچا ہوا تھا کہ۔۔۔۔ "ممکن ہے کہ پھر لکھنے لکھانے کا موقع نہ ملے امکان قوی یہی ہے کہ نہ ملے گا البتہ یہ بات ہمت بڑھاتی ہے کہ نوشتہ بماند سیہ بر سفید۔ نویسندہ را نیست فردا امید۔۔۔۔ شاید لکھنے والے کے بارے میں یہ تحریر باقی رہ جائے۔۔۔۔"

فارسی شعر کے بعد جو جملہ ہے اس میں شعر کا مفہوم آ گیا ہے۔ یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی کہ رئیس صاحب بارہا اپنی موت کی پیش گوئیاں کرتے رہتے تھے لیکن پوری تحریک کی تاریخ میں اس بات کی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی کہ مصنف نے اپنی تحریر کے بارے میں یہ لکھا ہو کہ یہ اس کی آخری تحریر ہوگی اور فی الواقع وہی تحریر اس کی آخری تحریر بھی بن جائے۔ بلکہ ذرا رک جائیے ابھی بات پوری طرح منتقل نہیں ہو پائی، یہاں صورت یہ نہیں ہے کہ مصنف نے ایک تحریر لکھ کر رکھ دی ہو جو اس کی آخری تحریر ہو، اور جسے اس نے آخری تحریر بھی قرار دیا ہو۔ بلکہ یہاں معاملہ یہ ہے کہ وہ تحریر جسے مصنف نے آخری تحریر قرار دیا ہے اپنے اختتامی مرحلے پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک نقطے پر آ کر کٹ گئی اور تحریر کے آخری حصے خون کی بوچھار میں نہا گئے ایک عجیب اور انتہائی نادر الوقوع واقعہ جو تاریخ کی آغوش میں پہلی بار آیا ہے، ان واقعات کے مرکزی کردار رئیس امروہوی کے بارے میں سوچیے، کیا یہ وہی شخصیت ہے جس کو ۲۲ ستمبر کی شام کے ساڑھے چھ بجے تک کوئی شخص دیکھ سکتا تھا، بجا ہونے کی نسبت سے قطع نظر مجھے اس بات کا پورا اور غیر جانبدارانہ

اعتراف تھا کہ جناب رئیس امروہوی ایک بہت ہی بھاری بھرکم شخصیت ہیں لیکن یارانِ محفل ایک بہت ہی بھاری بھرکم شخصیت متداول طریقۂ وفات کے راستے بھی تو ہم سے جدا ہو سکتی تھی اور اس کی شخصی عظمت ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوتی لیکن وہ سب کچھ جس کا ذکر اوپر آیا اس کی روشنی میں تو یہ رئیس امروہوی صاحب ایک بالکل مختلف شخصیت نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسے ابعاد رکھنے والی شخصیت جس سے میں ۲۲ ستمبر سے پہلے متعارف نہ تھا۔ (کیوں کیا میں عزیزداری یعنی نی پاٹزم کا مظاہرہ تو نہیں کر رہا؟) تو بہرحال یہ چند باتیں تھیں اس تحریر کے بارے میں جو رئیس صاحب کا وہ آخری مگر ناتمام ادبی تحفہ ہے جو انھوں نے معاشرے کو دیا ہے، مگر میں خیال کے اس تسلسل کو توڑنے سے پہلے کچھ باتیں آپ کے توسط سے رئیس صاحب سے کرنا چاہتا ہوں تاکہ کائنات یا وجود کے انھیری منطقوں سے گزر کردہ حروف ان تک پہنچ جائیں جو میں آئندہ استعمال کروں گا، مجھے اپنے بڑے بھائی صاحب سے یہ شکایت ہے کہ وہ جس سانحے کے وقوع کو اس قدر تیقن کے ساتھ مستقبل قریب ہی میں نہیں مستقبلِ اقرب میں دیکھ رہے تھے اور جس کا تذکرہ وہ اپنے بھائیوں کے علاوہ اور تمام حضرات سے بڑے واضح لفظوں اور یقین کے ساتھ بار بار کرتے رہے تھے اس سے انھوں نے ہمیں آخر کیوں لا بےخبر رکھا، اور کیوں یہ تاکید کی کہ یہ خبر ہم تک نہ پہنچنے پائے، رئیس صاحب اس کا جواب نہیں دے سکتے کہ انھوں نے اپنے قطعات میں بار بار اس طرف اشارے کیے تھے اس لیے کہ ان اشاروں کی ادبی توجیہ بآسانی کی جا سکتی تھی، اتنا ہی نہیں رئیس صاحب اس بات کی بھی کیا وضاحت کریں گے کہ ہمارے چھوٹے لان میں اس واقعے سے صرف چند دن پہلے جب وہ، میں اور فیصل آباد کے مشہور ماہر یا طنیات پروفیسر خاور بیٹھے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنا ہاتھ خاور صاحب کو دکھایا تھا تو اس وقت خاور صاحب کے اس جملے پر جس کی میں نے تائید کی تھی کہ آپ کی عمر ۹۰ بلکہ ۹۴ سال ہو گی وہ خاموش کیوں ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنے تیقن موت کے بارے میں کوئی ذرا سا اشارہ کیوں نہ دیا، ہاں وہ یہ جواب دے سکتے ہیں کہ دردناک حادثے سے چند دن

پہلے جب ہم دونوں تنہا تھے تو انھوں نے ایک خواب سنایا تھا، خواب یہ تھا کہ وہ ریگل کے علاقے میں ہیں جہاں اونٹ سے بڑے جسم کے دو جانور (گویا ڈائنوسار) ان پر حملہ آور ہیں اور چند لوگ رسیّوں سے حملہ آوروں کو کھینچ رہے ہیں اور میں نے خواب سن کر اس کی تعبیر وسیع معاشرتی پس منظر میں کی تھی جس میں ان کی ذات سے متعلق خطرے کو تعبیر کا مرکزی نقطہ بنانے سے نیم شعوری طور پر احتراز برتا تھا، اس وقت کیوں انھوں نے سکوت اختیار کیا اور اپنے تیقن کو لفظوں کا جامہ پہننے کی اجازت نہ دی۔ کیا وہ ان سوالات کا کوئی جواب دیں گے، میں ان کے جواب کا انتظار کروں گا۔ ہاں ۔۔۔ ایک شکایت تو اور بھی ہے اور وہ شکایت یہ ہے کہ ۔۔۔۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس شکایت کے تذکرے میں جس واقعے کا ذکر ہوگا، کیا اس کے بیان کی مجھ میں برداشت موجود ہے۔ رواقی فلسفی صبر اور ضبط کو انسانی زندگی کا سب سے بڑا آئیڈیل قرار دیتے تھے میرے خیال میں وہ اس جیسے واقعے کے تذکرے میں جس کا مجھے تجربہ ہوا غالباً ضبط کی منزل سے لڑکھڑا جاتے۔ صرف دو حرفوں پر مشتمل وہ لفظ جس کو ۔۔۔۔ غم ۔۔۔۔ کہتے ہیں، اور جو پُراسرار طور پر آنسوؤں میں بدل جانے کی حیرت انگیز صلاحیت کا حامل ہے، محض اس واقعے کے تذکرے کے امکان کی وجہ سے پوری طاقت سے مجھ پر حملہ آور ہو گیا ہے اور آنسوؤں کے قافلے پپوٹوں سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں، لہٰذا اس شکایت کا ذکر رہنے دیجیے بلکہ بہتر یہ ہے کہ میں اپنے قارئین سے اب رخصت چاہوں تاکہ آنسوؤں کے ان قافلوں کو روکنے کی جدوجہد کر سکوں جو رات کی خاموشی میں کئی بار مجھے شکست دے چکے ہیں۔

○

سید محمد تقی

موت کے بعد

وہ قلم ٹوٹ گیا جو اپنے کالم میں نور بکھیرتا تھا اور خیالات کا وہ سلسلہ بکھر گیا جو لاکھوں انسانوں کے دل کی دھڑکنوں کو ایک تار میں پروتا تھا۔ رئیس امروہوی نے بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ معاشرے کو بہتر خیالات مہیا کرنے والی زندگی اور موت .... جو ایک لرزہ خیز حادثے کی طرح نازل ہوئی، اس نے پاکستان، ہندوستان اور ان تمام علاقوں میں جہاں برصغیر کے باشندے بسے ہوئے ہیں لاکھوں آنکھوں کو اشکبار کردیا اور دہشت سے لوگوں کے سامنے یہ سوال پیدا کردیا کہ کیسے وہ اس دنیا میں رہیں گے جس سے رئیس امروہوی رخصت ہو چکے ہیں۔ جنازے کی تیاری ہوئی تو کراچی کی ادبی برادری نے اعلان کردیا کہ یہ میّت کسی ایک خاندان کی ذمے داری نہیں ہے یہ پورے کراچی والوں کی مشترکہ میّت ہے جس کا بندوبست کراچی کے ادبی نمائندے کریں گے۔ تین ہفتے گزرنے کو آئے مگر ان خطوط، تاروں اور ٹیلیفون کالوں کا سلسلہ برابر جاری ہے جو برصغیر اور بیرونی ممالک سے موصول ہو رہے ہیں اور ان حضرات کی تعداد کا اندازہ لگانا تو ممکن نہیں جو ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کی لرزہ خیز شام سے آج تک ان کے اعزا کے غم میں شرکت کرنے کے لیے تشریف لاتے رہے ہیں۔ معاشرے کے تمام طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے رئیس صاحب کی موت پر اپنے آنسوؤں کو

الفاظ کا جامہ پہنا کر ادب اور انسان نوازی کے اس غم میں برابر کی شرکت کی ہے۔ صدرِ مملکت سے لے کر فیصل آباد سینٹرل جیل کے قیدی محمد اصغر تک (جو ۲۵ سال کے قیدی ہیں)، نامحروم اور محروم طبقوں کے بہت سے افراد نے اپنے محبوب کے غم میں محبت کے آنسوؤں کے تحفے پیش کیے ہیں۔

امروہوی صاحب کے غم میں کوئی ایک نہیں رویا سب ہی روئے۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں سے لے کر اس بڑھیا تک جو سانحۂ ارتحال کے دوسرے دن رئیس صاحب سے اس لیے ملنے آئی تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی کے لیے روپے کی ضرورت تھی جو رئیس صاحب کسی سے مہیا کرا سکتے تھے لیکن بڑھیا مایوس ہو کر چلی گئی اس لیے کہ وہ شخص جو اس کی دادرسی کر سکتا تھا اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسی کتنی مظلوم اور محتاج خواتین، بے روزگار اور ستم زدہ افراد ہوں گے جو اب بے سہارا ہو گئے ہیں۔

فیصل آباد سینٹرل جیل کے قیدی محمد اصغر جن کا ذکر اوپر آیا ایک انتہائی غریب اور ستم زدہ شخص ہیں۔ ان کا خط ملاحظہ فرمائیے جو اس قسم کے بہت سے خطوط میں ایک نمائندہ خط کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصغر صاحب لکھتے ہیں۔ میرے شفیق، میرے محسن، میرے عظیم بزرگ دوست جناب رئیس امروہوی صاحب السّلام علیکم۔ میں نے جب بھی آپ کی خدمتِ اقدس میں خط لکھا اور ہر وقت آپ کے لیے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی، صحت اور تندرستی عطا فرما کر آپ کو ملک و قوم کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے! آج میں اشکبار آنکھوں سے آپ کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، بہشت بریں میں آپ کے درجات بلند کرے، آپ کی بخشش فرمائے (آمین)

آج ٹی وی پر ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء ۹ بجے کی خبروں میں یہ سنا کہ آپ ہمیں داغ مفارقت دے گئے ہیں اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ میرے عظیم محسن! آپ جس دنیا میں چلے گئے ہیں کچھ دیر بعد ہمیں بھی آپ کی دنیا میں حاضر ہونا ہے مگر

آپ کی موجودہ جدائی نے دل کو بہت سوگوار کیا ہے ابھی تو بہت سی حسرتیں تھیں میری، میں تو کہا کرتا تھا کہ میں آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گا لیکن آپ نے یہ پسند نہ فرمایا..... آپ تو دکھی دلوں کا مرہم ہوا کرتے تھے، آپ تو ڈگمگاتے ہوئے دلوں کا سہارا ہوا کرتے تھے۔ خدا نے آپ کے دل میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ پھر اتنی جلدی کیا تھی کہ آپ ہم سے روٹھ گئے۔ ٹھیک ہے آپ کو اپنے خالق حقیقی سے ملنا تھا اس کے حضور پیش ہونا تھا لیکن مخلوقِ خدا کو ابھی آپ کے سایۂ شفقت کی بے حد ضرورت تھی، آپ کچھ تو خیال کرتے، کچھ دیر تو رک جاتے، کچھ تو پیاسی روحوں کو سیراب کر جاتے، پوری قوم بلکہ انسانیت آپ کی جدائی میں سوگوار ہے۔ آپ نے پوری زندگی خدمتِ انسانیت میں گزار دی۔ یقیناً خدا آپ کو اجرِ عظیم سے نوازے گا (آمین)، میرے عظیم محسن! آپ کا مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۸۹ء کا لکھا ہوا خط مجھے ملا جو کہ میرے لیے آپ کی آخری تحریر ہے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ آپ کو جواب میں کوئی خوش خبری لکھوں، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ مجھے ہمیشہ کے لیے اس سعادت سے محروم فرما دیں گے کہ مجھ جیسا حقیر انسان آپ جیسے عظیم لوگوں سے رابطہ کرے۔ میرے عظیم بزرگ دوست! مجھے تو اب اتنا بھی نہیں معلوم کہ میں یہ اظہار کس سے کروں، آپ کی مقدس، عظیم، مخلص اور بے لوث تحریریں خطوط کی صورت میں میرے پاس محفوظ ہیں، آج یہ تحریریں میری زندگی کا سرمایہ ہیں مجھے ان سے بڑھ کر کوئی چیز دنیا کی قیمتی معلوم نہیں ہوتی۔ میری قوم کے محسن! گو آپ ہم سے جسمانی لحاظ سے جدا ہو چکے ہیں لیکن جب تک پاکستان قائم ہے آپ ہماری روحوں سے جدا نہیں ہو سکیں گے۔ قوم سدا اپنے دلوں میں آپ کو محسوس کرے گی۔ آپ نے قوم کو سنوارنے میں پوری زندگی صرف کر دی۔ خدا آپ کی آخرت سنوار دے اور آپ کا مشن زندہ و تابندہ رہے (آمین ثم آمین) فقط آپ کا پرستار..... ایک حقیر انسان میاں محمد اصغر، قیدی ۲۵ سالہ سینٹرل جیل فیصل آباد۔

رہے وہ لاکھوں قارئین جو اردو دنیا کے تمام حصّوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور جو ان کے قطعات، ان کے دلچسپ اور مقبول کالموں کو پڑھ کر انسان دوستی اور مظلوم نوازی کا جذبہ تازہ کیا کرتے تھے آج بڑی بیتابی سے جناب رئیس کو ڈھونڈ رہے ہیں، مگر۔۔۔۔

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمی سو گئے داستاں کہتے کہتے

دوسرا دور

لیکن یہ صرف ایک پہلو ہے رئیس صاحب کے سانحۂ ارتحال کا مگر اس کا ایک اور پہلو بھی ہے، وہ پہلو ہے اس ردِّ عمل کی ایک خاص نوعیت کا۔۔۔۔۔ یہ ردِّ عمل ان کی موت کے فوراً بعد اور آج تک دیکھنے میں آرہا ہے۔ رئیس صاحب ایک ادیب اور ایک دانشور تھے، اس ادیب اور دانشور کی موت پر قوم کے تمام طبقوں کی طرف سے رنگ، نسل، عقیدہ، صنف اور زبان کے فرق کے بغیر جس پرجوش جذبۂ محبت و عقیدت کا اظہار کیا گیا وہ میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے اور اس بات کا ثبوت کہ مشرقی تہذیب سے متعلق حلقے عموماً اور پاکستانی معاشرہ خصوصاً دانش و ادب کے احترام کے بارے میں کتنا واضح، کتنا ستھرا ترقی یافتہ اور باشعور احساس رکھتا ہے۔ وہ لوگ جو آج کے معاشرے سے قطعی طور پر مایوسی کا اظہار کرتے ہیں اس تجربے کے بعد اپنی رائے پر لازماً نظرِ ثانی کے لیے مجبور ہوجائیں گے اس لیے یہ تجربہ بار بار ہوتا رہا ہے۔ جو معاشرہ اپنے دانشوروں کا احترام کرنا جانتا ہے وہ آخر کار اپنے مسائل پر قابو پانے میں کامیاب بھی ہوجاتا ہے کم سے کم اس سلسلے میں اب پہلے سے زیادہ پر امید ہونے کی وجوہ موجود ہیں۔ آخر وہ دانشور کیسے دانش و بینش کا دعویٰ کر سکتا ہے جو انسانیت، دوستی اور مظلومیت نوازی کی مثالوں کو سامنے رکھتا ہوا اس بات کو یوں کہہ لیجیے کہ جو اسلام کے اعلیٰ انسانی آئیڈیل اور مظلومیت کے نازک خدمت کو اپنی سوچ کا مرکزی نقطہ بنائے (اے محمدؐ) نہیں، بھیجا گیا، تمہیں مگر عالموں کے لیے رحمت بنا کر اور دیا ایسا انسان کے ذریعے تمام

انسانوں سے مخاطب نیز ھدیٰ للناس کا اعلان، انسان گیر نقطۂ نظر پیدا کرنے پر اصرار ہے، مقصود ہے پوری انسانیت پر زور دینا، پھر یہ بھی یاد رہے کہ نہیں کہا گیا کہ ..... (اے محمد) تمہیں رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ بھیجا گیا تمہیں مگر عالموں کے لیے رحمت بنا کر تاکہ آنحضرتؐ کا عالمین کے لیے رحمت ہونے کا تصوّر پورے زور اور مکمل تاکید کے ساتھ منتقل کیا جاسکے۔ یاد رہے کہ قرآن مجید تاریخ کی وہ واحد کتاب ہے جس میں الفاظ کے باریک ترد و بست کے ذریعے مفاہیم کے انتہائی نازک رشتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پروتے میں معجزانہ کمال کا ظہور رہا ہے، اس لیے قرآن مجید کے ہر ہر لفظ، ہر ہر نقطے کو بڑی احتیاط کے ساتھ پڑھنا چاہیے تاکہ معانی کی نت نئی تہیں سامنے آسکیں۔

ردِّ عمل

تہذیب کی اعلیٰ قدروں نے جو معاشروں کے ارتقار کی علامت ہوتی ہیں اکتالیس سال میں پہلی بار اس ہمہ گیر ردِّ عمل کی شکل میں کامیابی حاصل کی ہے جو دانشور کی موت پر دیکھنے میں آیا اور اب یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ قلم کاری ایک نامقبول اور نامحترم پیشہ ہے، اس لیے کہ مرنے والا کئی جہتیں رکھنے کے باوجود بنیادی طور پر تو قلم کار ہی تھا اور اگر معاشرے کی طرف سے اتنا شاندار ردِّ عمل آسکے جو بکھر جانے پر نظر آیا تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس معاشرے میں قلم کاری کے پیشے کو بلند مقام حاصل ہے۔ کیا نئی نسل کے لیے عملیت پسند نوجوان اس پہلو پر غور کریں گے ..... مگر ..... اور اس مگر کے بعد کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ جن میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ آخر اس معاشرے کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے جہاں کسی قاتل کی گولی کسی دانشور کے دماغ کو پاش پاش کرنے کے لیے چلائی جاسکتی ہے؟

مجھے نہیں معلوم کہ مجھے اس سوال کا کیا جواب دینا چاہیے کہ کیا اب اس معاشرے کے ادیب و دانشور بھی قاتلوں کی خون آشام گولیوں کی زد میں آچکے ہیں؟ ..... اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو پھر ہم تہذیبی آبرو باختگی کی آخری حد پر پہنچ چکے ہیں تو بہر حال یہ دو رجحانات ہیں جو ساتھ چل رہے ہیں جس

کا مطلب یہ ہے کہ شرافت اور بربریت کے درمیان کے بڑے نازک راستے سے یہ قوم گزر رہی ہے ایک طرف تو پہلا شاتمار رجحان ہے اور دوسری طرف خوں ریز اژدہے منہ کھولے پھنکاریں مار رہے ہیں اور اب تو اس ملک کے ادیب و دانشور بھی وحشی گولیوں کی زد میں آ گئے ہیں۔ آخر جب ایک حبیب لہرتے سر اٹھا ہی لیا ہے تو پھر وہ سب ہی ادیب و دانشور اس کی لپیٹ میں آسکتے ہیں جو اپنی فکر و دانش سے ظلمت کو نور میں بدلنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔

کچھ اور باتیں

رئیس صاحب کے بہت سے موضوعات میں خواب اور اس کی تعبیر کا مسئلہ بھی بڑے اہم موضوع کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن یہ عجیب صورت حال ہے کہ وہ آج خود تعبیر کا موضوع بن گئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے خواب یا بیداری میں ان کو دیکھا ہے۔ ان خوابوں کا تذکرہ آئندہ کیا جائے گا جس کے ضمن میں نفسیات اور مابعد النفسیات کی راہوں سے بھی گزرنا پڑے گا۔ دوسرا مسئلہ رئیس صاحب کی تعزیت سے متعلق ہے۔ تعزیت کے سلسلے میں ان گنت تار ٹیلیفون کالیں اور خطوط کا ایک انبار ہے، جن میں محبت اور خلوص کے گہرے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ قطعاً رئیس صاحب کے اعزا ان حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں مگر سوچنا یہاں یہ ہے کہ یہ سلسلہ تو برابر جاری ہے ٹوٹتا تو نہیں ہے تو پھر شکریے کا اس وقت کیا جواز ہوگا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس مرحلے پر بھی شکریہ ادا کر دیا جائے اور آئندہ کچھ عرصے بعد بھی اس شکریے کا اعادہ کر دیا جائے تاکہ فوری طور پر ان حضرات کی تسکین ہو جائے جنھوں نے اپنے محبت نامے ارسال فرمائے ہیں اور بہرحال کسی رسید کے منتظر ہیں۔

ایک تیسرا قابل ذکر امر یہ ہے کہ متعدد حضرات جو کراچی کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتے ہیں، رئیس صاحب کے چالیسویں میں شرکت کرنا چاہتے ہیں ان حضرات کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ چالیسواں ۲۰ر اکتوبر یعنی جمعرات کے دن سہ پہر کے وقت یعنی ساڑھے تین بجے شروع ہوگا۔

○

زاہدہ حنا

کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

۲۲ ستمبر کی شام ہے۔ سورج ڈوب رہا ہے اور پرندوں کی واپسی شروع ہو چکی ہے۔ میں شہر کے ایک بھرے پُرے بازار سے لوٹ رہی ہوں۔ لوگوں کے ہجوم اور کاروں کی ریل پیل کے باوجود، بازار کے در و بام پر ایک اداسی اور مخزونی ہے۔ میں طارق روڈ سے گزر کر دھوراجی کالونی کی طرف آتی ہوں دائیں بائیں گلیاں ہیں جن کے آغاز پر بڑے بڑے آہنی دروازے نصب ہیں ان آہنی دروازوں کو دیکھ کر دل ڈوب جاتا ہے میرے شہر کے چہرے پر یہ کیسا کوڑھ پھوٹ آیا؟ وہ شہر جس کی شاموں کی دل آویزی کی مثالیں سارے ملک میں دی جاتی تھیں اب اسی شہر کی شاموں پر خوف کے سائے منڈلاتے ہیں اور اس کی راتیں آسیب زدہ محسوس ہوتی ہیں۔

مجھے بچّوں کو گھر چھوڑ کر واپس دفتر جانا ہے۔ میں گھر میں قدم رکھتی ہوں کہ فون کی گھنٹی بجتی ہے دوسری طرف جون ایلیا ہیں ان کی آواز ٹوٹ ٹوٹ کر آ رہی ہے جلد کی سے دفتر آجاؤ۔ بھائی عباس کا فون آیا تھا بڑے بھائی اپنے کمرے سے خون میں لت پت ملے ہیں، بھائی تقی انھیں فاطمید لے گئے ہیں۔

میں انھیں تسلّی دیتی ہوں۔ بھائی کا پیر پھسل گیا ہوگا۔ چوٹ لگ گئی ہوگی۔ بھائی عباس اختلاجی مزاج کے آدمی ہیں۔ معمولی باتوں پر بھی زیادہ ہی پریشان ہو جاتے ہیں۔

میں بچّوں کو کچھ بتائے بغیر الٹے قدموں پلٹتی ہوں اور دفتر پہنچتی ہوں۔ جون ایلیا

ندیم اختر اور جمال سر جھکائے بیٹھے ہیں، میں یہ جاننے کے لیے کہ بھائی رئیس کے ساتھ واقعی ہوا کیا ہے اور وہ کہاں ہیں۔ بھائی تقی کے گھر فون کرتی ہوں۔ نصرت سے بات ہوتی ہے وہ کہتی ہیں بابا کو اب جناح اسپتال لے گئے ہیں۔ شاید کسی نے ان کو گولی ماردی ہے، دھماکہ تو ہم سب نے سنا تھا لیکن کوئی سمجھا ہی نہیں کہ آواز بابا کے کمرے سے آئی ہے۔

میں دہشت زدہ ہو کر ریسیور رکھ دیتی ہوں۔ وہ کون سا ہاتھ ہو سکتا ہے جو بھائی رئیس ایسے بوریا نشین پر اٹھا ہوگا۔ وہ تو ان لوگوں میں سے تھے جو مرغی ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتے اور جن کی نظر زمین پر رینگتی ہوئی چیونٹی پر پڑ جائے تو اسے بھی بچا کر چلتے ہیں مجھے یقین آئے بھی تو کیوں؟ ہمارے شہر میں آگ اور خون کے اس کھیل کی ریت ابھی نئی ہے۔

جون اور میں جناح اسپتال کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں شہر پر اب اندھیرا اتر آیا ہے۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالوں میں غرق ہیں۔ گفتگو ہمارے درمیان برائے نام ہوتی ہے۔ جناح اسپتال کے شعبہ حادثات میں گھر کا کوئی فرد نظر نہیں آتا تحقیقات پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں لائے ہی نہیں گئے۔

میں باہر نکل کر جون سے کہتی ہوں کہ اس طرح اسپتالوں میں پھرنے سے کوئی حاصل نہیں۔ تم گارڈن ایسٹ پہنچ کر گلشن فون کرو اور بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں تاکہ میں بچوں کو لے کر سیدھے وہیں پہنچوں۔ میں انھیں ٹیکسی دلوا کر گلشن کے لیے روانہ ہو جاتی ہوں۔ میرے گلشن پہنچنے سے پہلے ہی جون کا فون آچکا ہے۔ بھائی رخصت ہو گئے۔ سادات امروہہ کا سب سے روشن چراغ گل ہو گیا۔ لگ بھگ نصف صدی سے جس نام کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے، اسی نام کے علم سرنگوں ہوئے۔

ندیم اور میں، ہم دونوں ایک ناقابل یقین کیفیت سے دوچار ہیں ہم گھر پہنچتے ہیں فینانہ کو خبر سناتی ہوں تو وہ سفید پڑ جاتی ہے۔ رئیس تایا کو بھلا کون گولی مار سکتا ہے، وہ تو بہت بوڑھے، بہت کمزور تھے۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے۔

میں اس سے کس طرح کہوں کہ ہمارے ملک، ہمارے صوبے اور ہمارے شہر میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ ایک بڑی قیامت کا پیش خیمہ ہے۔ میں اسے یہ بھی نہیں سمجھا سکتی کہ اجرتی قاتلوں کے لیے بوڑھے بچے، عورتیں اور نوجوان سب برابر ہوتے ہیں۔

اس وقت روزنامہ "مسلم" سے فون آجاتا ہے وہ لوگ اس "افواہ" کی تصدیق چاہتے ہیں۔ میں تصدیق کر دیتی ہوں۔ ریسیور رکھتے ہی گھنٹی پھر بجتی ہے۔ دوسری طرف سے "مسلم" کے فرہاد زیدی بول رہے ہیں۔ انھیں اپنے دفتر کی اطلاع پر شاید اعتبار نہیں آیا زیدی صاحب سے بات کرکے گاڑی میں بیٹھنے لگتی ہوں تو شکیل عادل زادہ کا فون آجاتا ہے۔ شکیل کو ایک عرصے تک رئیس امروہوی کا سب سے چھوٹا بیٹا یا بھائی سمجھا جاتا رہا اور جو واقعی اس خاندان کا دست و بازو رہے۔ شکیل کہتے ہیں گارڈن ایسٹ نہ جاؤ، بھائی تو ابھی لیاقت میڈیکل میں ہیں۔

ہم لیاقت میڈیکل اسپتال جا رہے ہیں۔ پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی فینی بار بار مجھ سے پوچھ رہی ہے لیکن امی یہ کیسے ممکن ہے؟ میں اور ندیم دونوں خاموش ہیں ہم اسے یہ بتانا نہیں چاہتے کہ سارے ملک پر برسوں آسیب کا جو سایہ رہا وہ پھیلتے پھیلتے گھروں کی دہلیزیں پھلانگ گیا ہے۔ اب کوئی گھر محفوظ نہیں۔ اب شانوں پر رکھے ہوئے تمام سر اجرتی قاتلوں کی زد میں ہیں۔

ہم لیاقت میڈیکل پہنچتے ہیں۔ پولیس کی بلیو بک اپ سیڑھیوں کے ساتھ کھڑی ہے "استقبالیہ" پر کچھ لوگ جمع ہیں لیکن ان میں جرّار نقوی کے سوا تمام چہرے اجنبی ہیں، میں لپک کر جرّار کے پاس جاتی ہوں۔ وہ بتلاتے ہیں کہ بھائی صاحب کے انتقال کے بعد لقی صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی تھی سب لوگ ان کے ساتھ چلے گئے ہیں، گھر کا کوئی بھی فون نہیں مل رہا۔ معاملہ چونکہ قتل کا ہے اس لیے پولیس آگئی ہے وہ لاش کو اپنی تحویل میں لینا چاہتی ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں تاکہ کسی کو ساتھ لے کر آؤں آپ بھی گھر ہی چلیں۔

میں ان سے کہتی ہوں میں بھائی کے پاس رکوں گی اور پوسٹ مارٹم چونکہ یہاں

نہیں ہو سکتا اس لیے میں انھیں لے کر جناح اسپتال جاتی ہوں۔ آپ بھی گھر سے دوسرے لوگوں کو لے کر وہیں پہنچیں۔

وہ چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی نہایت ملول ہیں۔ کہتے ہیں ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔ وہ آئے تو سانس اکھڑ رہی تھی، میں ان سے بھائی کے بارے میں پوچھتی ہوں وہ مجھے ایک کمرے میں لے جاتے ہیں۔ اسکرین کے پیچھے بھائی تنہا ہیں، میں چادر ہٹاتی ہوں سر اور پیشانی پٹیوں سے ڈھکی ہوئی ہے جس پیشانی کے اماں نے بوسے لیے ہوں گے اور جسے دوستوں اور چاہنے والوں نے چوما ہو گا اب خون آلود ہے۔ مجھ سے بھائی پہچانے نہیں جاتے۔ میں چہرے کو چادر سے ڈھک دیتی ہوں۔ ایک سب انسپکٹر آ جاتا ہے اور ایک طول طویل فارم کی خانہ پری کرنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر عابدی ایمبولنس کے لیے بار بار فون کر رہے ہیں۔ اب علی مختار نقوی آ گئے ہیں، وہ بھائی کو عباسی شہید اسپتال لے جانا چاہتے ہیں۔ میں خاموش رہتی ہوں۔ پوسٹ مارٹم جناح میں ہو یا عباسی میں بھلا فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر عابدی مجھے ایک کاغذ دیتے ہیں، بی بی اس پر دستخط کر دیجیے۔ لکھ دیجیے کہ لاش وصول پائی۔ میں بول رہی ہوں اس لیے زندہ ہوں۔ رئیس مر دہ ہوئی چپ ہو گئے ہیں اس لیے لاش ہیں۔ بولنے اور خاموش ہو جانے کے درمیان کتنا مہیب اور بھیانک فاصلہ ہے۔ میں دستخط کرتی ہوں۔ تاریخ لکھتی ہوں پھر وقت کا بھی اندراج کرتی ہوں اس وقت ۹ بج کر ۳۵ منٹ ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عابدی کے شدید اصرار پر سب انسپکٹر اپنا نامکمل فارم سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ بھائی پہیوں والے اسٹریچر پر منتقل کیے جاتے ہیں ان کے بدن کے نیچے خون ہی خون ہے۔ ہم باہر آتے ہیں۔ برآمدے میں کچھ لوگ اکٹھا ہو گئے ہیں۔ سامنے سیاہ ریگزین سے ڈھکی ہوئی ایک سوزوکی کھڑی ہے۔ ایدھی ٹرسٹ کی ایمبولنس۔ بھائی کو زندگی میں بھی قرار نہیں تھا۔ دیر تک ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ لکھتے لکھتے اٹھ کر ٹہلنے لگتے بے مقصد ہی سہی پچھواڑے کا ایک چکر لگا آتے۔ یہ عادت اب بھی نہ گئی۔ پہیوں والے اسٹریچر سے وہ ایمبولنس کے اسٹریچر پر لٹا دیے جاتے ہیں۔ ڈرائیور کے

برابر والی نشست سب انسپکٹر نے سنبھال لی ہے۔ علی مختار نقوی اپنی گاڑی تیزی سے نکال لے جاتے ہیں وہ شاید پہلے اسپتال پہنچنا چاہتے ہیں۔ ندیم میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں تم فینی کو لے کر آؤ۔ میں بھائی کے ساتھ جاؤں گی۔ میں ان سے کہتی ہوں۔ فینی کا چہرہ اتنی دیر میں ست گیا ہے۔ امّی آپ تنہا نہ جائیں۔ میں ساتھ چلتی ہوں۔ نہیں میری جان۔ پھر میں ندیم کو اشارہ کرتی ہوں اور وہ اس کا ہاتھ تھام کر تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہیں۔ جانے کون مجھ سے کہتا ہے آپ اپنی گاڑی میں جائیں۔ میں رئیس صاحب کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ میں اس اجنبی اور مہربان چہرے کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور بھائی کے برابر لگی ہوئی سیٹ پر بیٹھ جاتی ہوں۔

ایمبولنس روانہ ہوجاتی ہے۔ ہم اسپتال سے باہر نکل آتے ہیں۔ شہر پر اب گہری رات اتر آئی ہے۔ اپنی تمام رونقوں اور دہشتوں کے ساتھ۔ پولیس کی پک اپ ایمبولنس سے ملی ہوئی چل رہی ہے۔ ندیم کی گاڑی اس کے پیچھے ہے۔ پک اپ کی چھت پر لگی ہوئی سگنلوں روشنی تیزی سے گردش کر رہی ہے ایک سپاہی گاڑی میں کھڑا ہے۔ اس کی اسٹین گن کی نالی پک اپ کی چھت پر ٹکی ہوئی ہے اور وہ کسی نادیدہ دشمن کو نشانے پر لیے ہوئے ہے۔ وہ جو زندہ انسانوں کی حفاظت نہیں کر سکتے وہی قتل ہوجانے والوں پر کس اہتمام سے پہرا دیتے ہیں۔ بھائی جب بول رہے تھے تو لوگوں کی نظروں اور دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے اور اب جب کہ خاموش ہوگئے ہیں کس قدر حفاظت کی جارہی ہے ان کی۔ گھومتی ہوئی تیز سگنلوں روشنی سے ان کے سفید چادر سے ڈھکے ہوئے خون آلود بدن پر عجیب ہیولے بن اور بگڑ رہے ہیں۔

ایک جگہ گاڑی کو جھٹکا لگتا ہے۔ بھائی کا دایاں ہاتھ چادر سے باہر نکل آتا ہے۔ میں اسے تھام لیتی ہوں۔ اس ہاتھ نے عمر بھر لکھا اور صرف لکھا تھا۔ لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں یہ انگلیاں۔ کانٹوں سے فگار انگلیاں ہیں۔ ملبوس

بہار سی لکھ رہا ہوں ۔ انھوں نے "الف" کا نسخہ جب مجھے عنایت کیا تھا تو اس پر لکھا تھا ۔ زاہدہ حنا ! مادر گیتی تم سے توقع رکھتی ہے، نسلِ انسانی میں نہیں ، علمی ادبی سرمائے میں اضافے کی، یہ بھولا بسرا جملہ یاد آتا ہے اور میں ان کا ہاتھ آہستہ سے ان کے پہلو میں رکھ کر چادر برابر کر دیتی ہوں ؎

دور جا کر قریب ہو جتنے
ہم سے کب تم قریب تھے اتنے

ہماری ایمبولنس عباسی شہید اسپتال میں داخل ہوتی ہے اور مردہ خانے کا رخ کرتی ہے ۔ میں گاڑی سے اترتی ہوں ۔ تعفن باہر تک پھیلا ہوا ہے ۔ ندیم اور فینی بھی آ جاتے ہیں ۔ ندیم ایمبولنس میں چڑھتے ہیں پھر وہ ایمبولنس کا ڈرائیور اور مردہ خانے کا ایک ملازم اسٹریچر باہر نکالتے ہیں ۔ چوتھے آدمی کی ضرورت ہے ۔ میں ہاتھ لگانا چاہتی ہوں تو سب انسپکٹر لپک کر آگے آتا ہے ۔ نا بی بی نا ۔ آپ ہٹ جاؤ ۔ پھر یہ چاروں بھائی کو اندر لے جاتے ہیں ۔

فینی مجھ سے پوچھتی ہے ۔ امی یہاں اس قدر بدبو کیوں ہے ؟ میں اسے کیا بتاؤں کہ کہنے کو تو یہ بو مردہ جسموں کی ہے لیکن دراصل ہمارے سڑتے ہوئے سماج کی بو ہے ۔ یہ وہ سماج ہے جسے زندہ تو درکنار اپنے مردوں کو بھی چند گھنٹوں کے لیے رکھنے کا سلیقہ نہیں آتا ۔

بھائی کو اس "مردہ خانے" میں چھوڑ آتے ہیں جہاں گرمی اور حبس کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا ہے ۔ میں آرام اور کی تلاش میں نکلتی ہوں ۔ مختلف اسپتالوں کے چکر لگا کر لوگ اب آہستہ آہستہ پہنچنے لگے ہیں ۔ انور سعید آتے ہیں پھر وہ ڈپٹی میئر سے مل کر قبر کا انتظام کرنے چلے جاتے ہیں ۔ صادق مدہوش، شمیم نوید، بزم انصاری اور دیگر صاحبان خبر سن کر آ پہنچے ہیں ۔ کئی رشتے دار اور قرابت دار بھی آ گئے ہیں ۔ سوا بارہ بجے ممتاز سعید آ جاتے ہیں ۔ میں بھائی کو ان کے سپرد کرتی ہوں اور ہم تینوں گارڈن ایسٹ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں ۔

پرانے رواج کے مطابق بھائی نے پہلی مرتبہ قلم رسم بسم اللہ کے موقع پر ہی تھاما ہو گا لیکن انھوں نے پہلا شعر گیارہ برس کی عمر میں لکھا اور اس دن سے قتل کیے جانے کے لمحے تک لکھتے ہی رہے۔ آخری دنوں میں ان کی نظر بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس لیے لکھتے ہوئے کاغذ کو آنکھوں سے تقریباً لگا لیتے تھے۔ ان کے خون کی چھینٹ لباس یا دیوار پر پڑنے سے پہلے اس کاغذ پر پڑی جس پر وہ لکھ رہے تھے۔ کسی بھی لکھنے والے کے لیے اس سے قابلِ رشک موت بھلا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب سانس کی ڈوری ہاتھ سے چھوٹے تب ہی کاغذ اور قلم سے رشتہ ٹوٹے۔ ان کی عمر ۷۴ برس تھی۔ آج نہیں تو چار چھ یا دس برس بعد انھیں رخصت ہو جانا تھا اور جب مرنا ہی انسان کا مقدر ہے تو پھر انسان شان سے کیوں نہ رخصت ہو؛ نیکیاں لکھتے ہوئے قتل ہو جانا ایک سعادت ہے۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں۔

ان سے شدید نوعیت کے بعض نظریاتی اختلافات تھے۔ ان کی زندگی کے کئی پہلو تھے جو مجھے ہی نہیں دوسرے بہت سے لوگوں کو ناگوار گزرتے تھے۔ ہم بہ بانگِ دہل ان معاملات پر ان سے بحث کرتے۔ اختلاف کا اظہار کرتے لیکن کچھ لوگوں نے ان پر اس طرح نرغہ کیا تھا کہ بہت سی باتیں سمجھتے ہوئے بھی وہ ان معاملات سے کنارہ کش ہونے پر قادر نہیں رہے تھے۔ لیکن ان کی وضع داری اور اعلیٰ ظرفی کی داد دینی پڑتی ہے کہ اختلاف کرنے والوں کی سخت سے سخت بات سن کر بھی ہمیشہ مسکراتے ہی رہے۔ انھوں نے کبھی درشت لہجے میں بحث نہیں کی، کبھی ہمیں غلط نہیں کہا۔ کبھی باتوں کو ہنس کر ٹال گئے اور کبھی یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ ہاں بات تو تم لوگوں کی صحیح ہے۔

ان کے گرد لوگوں کا ہمہ وقت اس قدر ہجوم رہتا تھا کہ ان کو تنہائی کم کم ہی میسر آتی تھی۔ کاش ان کے نادان دوستوں کی تعداد اتنی زیادہ نہ ہوتی اور کاش ان کے آس پاس چند دانا دشمن بھی ہوتے۔

آہستہ آہستہ ان کی حیثیت شہر کے بزرگ کی سی ہو گئی تھی۔ گھر دروازے کھلے تھے۔ جس کا جب جی چاہ رہا ہے آ رہا ہے۔

جب جی چاہ رہا ہے، جا رہا ہے۔ کوئی سبزے پر بیٹھا سو تا ہے، کوئی پلنگ پر بیٹھا ہے، نہ لوگوں کو آنے سے کوئی روکنے والا تھا، نہ کوئی ان سے ان کے آنے کا مقصد پوچھنے والا۔ درویش کا دربار تھا جو لگا رہتا تھا گھر والوں کو بھائی کا یہ انداز ناگوار گزرتا تھا، لیکن اسی ادا نے ہزاروں لاکھوں کے دل موہ لیے تھے۔ کسی کو سہرا لکھ کر دے رہے ہیں، کسی کو باپ کی لوحِ مزار، کسی کے لیے سفارشی خط تحریر ہو رہا ہے تو کسی کو مشاعرے میں پڑھنے کے لیے غزل لکھ کر دی جا رہی ہے۔ کسی کی نفسیاتی بیماری کے لیے علاج تجویز کر رہے ہیں تو کسی کو شمع بینی کا ڈھب سکھا رہے ہیں۔

ہم چڑ جاتے۔ بھائی یہ آپ نے کیا خرافات شروع کر رکھی ہے۔ آپ شاعر ہیں، نثار ہیں، نہ کہ پیر سائیں، وہ ہنستے، لوگوں پر دکھوں کا اس قدر بوجھ ہے، اگر میں کسی کے دل کا بوجھ کم کر دیتا ہوں تو تم لوگوں کو اس پر کیا اعتراض ہے؟ ہم پھر بھی قائل نہ ہوتے ان سے الجھتے، تب وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر چلے جاتے۔

وہ علمی اور ادبی حلقوں کی جان تھے لیکن سیاسی حلقوں میں بھی ان کا اثر و رسوخ تھا تب ہی تو ان کی موت پر پیپلز پارٹی سے لے کر این پی پی تک نے تعزیت کی۔ سائیں جی ایم سید نے کس قدر غم انگیز اور پر معنی تحریری پرسہ بھیجا ہے بھائی تقی کے نام۔ لکھتے ہیں اس موقع پر اردو بولنے والے سندھی مرحوم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے استحصالی قوتوں کے خلاف اور سندھ کے حقوق کے لیے کام کریں۔

بھائی کو نشانہ بنانے کے لیے ہاتھ کسی کا بھی اٹھا ہو، ان کے اصل قاتل تو وہ لوگ ہیں جو سارے ملک اور بطور خاص سندھ کو دہشت گردی اور تشدد کا نشانہ بنا کر اپنی پسند کا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔

رات ڈھل گئی ہے۔ پرسہ کرنے والے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے سوگوار روتے روتے نڈھال ہو گئے۔ میں اس کمرے میں چلی جاتی ہوں جو کل تک بھائی کا کمرہ تھا۔ چھت تک پہنچنے والی دیوار گیر الماریوں میں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی کی کتابیں، اخباروں اور رسالوں کے انبار ہیں۔ میں ان کی میز تک جاتی ہوں۔

سامنے دیوار پر گولی کا نشان ہے جو خطا ہو گئی اور جو نشانے پر بیٹھی اس کا بہایا ہوا طشت بھر خون فرش پر پھیل کر جم گیا ہے اور سیاہ ہو گیا ہے ان کا چشمہ پڑا ہے۔ رئیس اکیڈمی کے کئی لیٹر پیڈ زمین پر بکھرے ہوئے ہیں اور خون میں لتھڑ کر زمین سے چپک گئے ہیں۔

جان رئیس امروہوی کی ہو یا کسی رئیس احمد اور رئیس الدین کی، ہر جان یکساں طور پر بیش قیمت ہے، ہر زندگی مساوی انداز سے قابلِ احترام ہے۔

ہم واویلا صرف اس لیے نہیں کرتے کہ ایک مشہور اور نامدار شخص قتل کر دیا گیا، ہم آہ و بکا اس لیے کرتے ہیں کہ جس ملک کے سربرآوردہ لوگ، جس سماج کے شاعر، ادیب اور دانشور بھی اجرتی قاتلوں کی زد سے محفوظ نہ ہوں، اس شہر اور ملک کے عوام کی بے بسی اور ان کی جان کی ارزانی تو پھر اظہر من الشمس ہے۔ میں خون کے اس دھبے کو دیکھتی ہوں۔ یہ کوئی نیا دھبہ نہیں۔ میرے ملک میں خونِ ناحق کے ایسے ان گنت دھبے ہیں۔ ہزاروں خاک نشینوں کا خون رزقِ خاک ہو چکا ہے لیکن اس کا حساب کہیں بھی نہیں۔ اس کا قصاص اب تک ادا نہیں ہوا۔

کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں؟

O

ضمیر جعفری

رئیس امروہوی مرحوم جس رخ پر چلے ایک نئی شاہراہ نکال دی۔ شاعری کے جتنے شالامار ان کے کلام میں ملتے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی ؎

قبر نے رنگ کی جھولیاں لوٹ لیں
کتنے خوابوں کو لے کر چمن سو گیا

شاہانہ رئیس

لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں

رئیس الشعراء حضرت رئیس امروہوی جیسے الفاظ ہمارے کانوں میں شعور کی اوّلین منزل سے پڑ رہے ہیں، ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ان کی تعریف و توصیف سنتے آئے ہیں۔ ہم اپنے باپ کی تعریف کے اس قدر عادی تھے کہ کبھی ہم نے خوشی یا حیرت محسوس ہی نہ کی۔ اب جب کہ وہ ہم سے بچھڑ کر نوری دنیا کے باسی ہو گئے تو معلوم ہوا کہ وہ واقعی بہت بڑے شاعر و مفکر تھے۔ ان کی تعریف و توصیف بہت کم ہوتی تھی، وہ ان الفاظ سے کہیں بڑے بلکہ بہت ہی بڑے شاعر تھے۔ جب تک وہ ہمارے ساتھ رہے، ہم انھیں نہ شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے نہ مفکر کی طرح دیکھتے تھے۔ معلوم تھا تو بس یہ کہ وہ ساری دنیا سے پیارے، نفیس اور شفیق باپ ہیں، ہم نے زحمت ہی نہ کی کہ انھیں رئیس امروہوی کی طرح پرکھیں، ان کے دیو قامت ذہن کو جانچیں۔ ان کی شاعری میں جو کائنات کے راز پوشیدہ ہیں انھیں ٹٹولیں۔ ان تمام باتوں کی ہمیں کوئی پروا نہیں تھی۔ ہم تو اتنا جانتے تھے کہ ان کے دم سے ہمارا میکہ آباد ہے۔ آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تو ہمارا میکہ اُجڑ کر ویران ہو گیا۔ ہم کیا یتیم ہوئے، ایک عہد یتیم ہو گیا ان کے نہ ہونے کا خلا شاید پُر نہ ہو سکے۔

ان سے بچھڑنے کے بعد جب ان کی شاعری کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے اشعار تو پوری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے تھے، وہ کتنے عظیم مفکر تھے یہ اب پتا چلا،

انسانی فطرت پر ان کی کتنی گہری نظر تھی، جو طاقت انسان میں قدرت نے رکھی ہے اُسے کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے وہ ان علوم کے ماہر تھے، نفسیات کی پیچیدہ سے پیچیدہ گتھی سلجھانے پر انھیں کمال حاصل تھا۔

ان کے بارے میں تقریباً ہر مکتبۂ فکر کا آخری اور قطعی فیصلہ ہے کہ وہ مکمل شاعر تھے، عارف تھے، قلندر تھے، نثر لکھی تو درجۂ کمال تک پہنچادیا۔ نثر اور نظم لکھنے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ اپنے بارے میں ان کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ عارف ہیں، قلندر ہیں وہ اپنے خیال میں حق بجانب تھے، فرماتے ہیں ؎

اک ساتھ دو ادائیں بخشی گئی ہیں مجھ کو
موضوع عارفانہ وضع قلندرانہ

خوشی منزل نہیں ہے غم نہیں ہے
قلندر کا کوئی عالم نہیں ہے

اپنی ان صفات کے بارے میں تو انھوں نے خود ہی فرمادیا کہ وہ کیا تھے؛ اب رہا سوال روحانی منزل کا کہ ان کے اندر روحانیت کتنی تھی تو ان کے اشعار نے یہ بھی ثابت کردیا کہ وہ واقعی بہت دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اس کی ایک مثال عرض کرتی ہوں کہ ۱۹۴۶ء میں ان کی نظم شائع ہوئی تھی جو بہت زیادہ مقبول ہوئی ؎

حکم قدرت کا کسی عنوان ٹل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں

یہ اس وقت کا شعر ہے جب پاکستان عالم وجود میں نہیں آیا تھا۔ مسلم قوم تذبذب کا شکار تھی۔ ایسے غیر یقینی وقت میں اگر کوئی وثوق سے کچھ کہے اور وہ پورا بھی ہوجائے تو یقیناً اس وثوق کے پیچھے کوئی نگاہ ہے جو سب کچھ دیکھ رہی ہے۔

موت کی پیش گوئی

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ انھیں اوّل سے یہ معلوم تھا کہ ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آئے گا۔ ۱۹۴۲ء میں جو کچھ

انھوں نے کہا تھا وہ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کی ایک منحوس شام کو پورا ہو کر رہا سے
پڑھے کیوں کر کوئی اس دفتر تہذیب انساں کو
ورق اکثر کتابوں کے لہو میں تر نکلتے ہیں

ابھی تدفین باقی ہے ابھی تو
لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں
مثال سخت جان نیم مذبوح
تہہ شمشیر تڑپایا گیا ہوں

یہ بات خاص طور پر عرض کردوں کہ اس اندوہناک واقعے کے بعد وہ ایک گھنٹے تک عالم فانی میں موجود رہے ۔ یقیناً وہ گھنٹہ شدید کرب کا ہوگا اسی روشنی میں اس شعر کو پڑھا جائے ۔ میرے خیال سے کسی مفکر، کسی دانشور، شاعر یا ادیب نے اس طرح اپنی موت کی بالکل صحیح پیش گوئی نہ کی ہوگی ۔ آخری مضمون کے بارے میں تو سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے صاف طور پر وقت کی بھی نشان دہی کردی ۔ اب اگر انھیں ولی کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو ۔ بھائی (ہم انھیں بھائی کہتے تھے) واقعی ایسے شاعر تھے کہ موجودہ صدی ان کا بدل پیش ہی نہیں کر سکتی ۔

مراقبہ اور اشعار

یوگا اور مراقبے پر لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی ۔ اس موضوع پر نثر لکھنا بھی بہت احتیاط طلب کام ہے چونکہ یہ موضوع بہت نازک اور حساس ہوتا ہے ۔ ذرا سی غلطی سے شدید نقصان ہو سکتا ہے ۔ چہ جائیکہ اس نازک موضوع کو نظم کیا جائے مشکل در مشکل کام ہے ۔ مگر بھائی نے اس مشکل ترین موضوع کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر ثابت کردیا کہ وہ موجودہ صدی کے لاثانی شاعر و ادیب تھے ۔ ان کی مثال ملنی مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ۔ بھائی نے نفسیات اور مابعد النفسیات پر بے پناہ لکھا ہے ۔ جمعہ وار کالم اس بات کا ثبوت ہیں کہ انھیں یوگا، نفسیات اور روحانیت پر کس قدر عبور تھا ۔ نثر لکھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف ادیب ہیں ۔

رئیس ۔ فن و شخصیت

شعر کہتے تھے تو ان سے بڑا اور کوئی شاعر نظر نہ آتا تھا۔ شاعری بجائے خود بڑی نزاکت کی حامل ہے ۔ اس پر طرہ یہ موضوع ..... مگر انھوں نے اپنی شاعری میں یہ کمال بھی کر دکھایا۔ بھائی لوگوں کو سانس کی مشقیں تجویز کیا کرتے تھے ۔ اسی ضمن میں کہتے ہیں ؎

عالمِ بے خودی میں گہرا سانس

سینۂ کائنات میں ہے سفر

سانس کی مشقوں سے انسان میں کافی تبدیلی آنے لگتی ہے، وہ آگہی کی منزل سے گزرنے لگتا ہے ۔ اس بات کو شعر میں کہنا صرف بھائی کا کام تھا۔ سانس کی مشقوں یا مراقبے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا منہ شمال کی جانب ہو اور پشت جنوب کی طرف ہو۔ اس لیے کہ نور کی طاقت ور لہریں شمال سے جنوب کی طرف بہتی ہیں جو مراقبے یا مشقوں کے لیے ضروری ہیں ..... کہتے ہیں ؎

کہکشاں سے شمال کی جانب

وقت کے بے نشان محور پر

نور کے دائرے ہیں گردش میں

آخر ان قافلوں کا رخ ہے کدھر

مراقبے اور مشقوں کی ابتدائی اور انتہائی کیفیت کو جس خوبی سے بھائی نے پیش کیا ہے ۔ اس کی مثال مل ہی نہیں سکتی ..... فرماتے ہیں ؎

پہلے تو ساتھ ساتھ ابد اور ازل گئے

پھر ہم حدودِ کون و مکاں سے نکل گئے

جب انسان مراقبے میں پختہ ہو جاتا ہے تو اس کی کیفیت عجیب و غریب ہو جاتی ہے ۔ اس مادی دنیا کے تقاضے بیکار محض ہو جاتے ہیں ۔ اسی کیفیت کو بیان فرماتے ہیں ؎

ہم اس تلاطمِ پنہاں میں غرق رہتے ہیں

جہاں زمان و مکاں ساتھ ساتھ بہتے ہیں

مراقبے یا مشقیں اس لیے کرائی جاتی ہیں کہ انسان جب سکون اور شانتی کی تلاش

میں سرگرداں ہے وہ مل جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب نفس جیسے سرکش عفریت پر قابو پا لیا جائے۔ مشق اور مراقبے سے اپنے اندر رہنے والے دیو زاد پر قابو پایا جاتا ہے اور جب مراقبے کی اور مشقوں کی سخت منزل سے گزر کر روح شانت ہو جاتی ہے تو ایک نئے انسان کا جنم ہوتا ہے۔ مکمل اور پرسکون شخصیت ابھرتی ہے۔ اسی سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

محبت ماورائے ہر تمنا ہے جہاں میں ہوں
نہ عذرا ہے نہ لیلیٰ ہے نہ سلمیٰ ہے جہاں میں ہوں

ان کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ وہ ولی شاعر تھے۔ ایلن کیلر جو سکون کی تلاش میں ہندو جوگی بن گئے ہیں۔ ان کی رائے میں بھائی مکمل اور بہترین یوگی تھے۔ ایلن کیلر کہتے ہیں کہ ان کی نظر میں اتنا بھرپور انسان اور اتنا مکمل یوگی نہیں گزرا۔ ان کو افسوس ہے کہ بڑی تلاش و جستجو سے انھیں بھائی کے روپ میں گرو (مرشد) ملا تھا مگر وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس معصوم اور بے ضرر انسان کو ہم سے جدا کر دیا۔

بھائی اپنی نظم "مرزا غالب" میں فرماتے ہیں۔ جو وقت نے حرف بہ حرف ان پر صحیح ثابت کر دیا ... کہتے ہیں ؎

وہی والہام وآیہ والقا
جس کے اعجاز شعر میں اک بات

جو بات انھوں نے مرزا غالب کے لیے کہی وہی بات پوری قوم ان کے لیے کہہ رہی ہے۔ خیر میں پھر یہی عرض کروں گی کہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ انھوں نے کس طرح حرف بہ حرف صحیح پیش گوئی کی تھی۔ جو کچھ جس طرح ہونا تھا بہت پہلے کہہ گئے ..... کہتے ہیں ؎

رواج قتل سخن ہو تو مقتل فن میں
قلم کو آلۂ خونریزئ قضا لکھیے
قلم جو دست قلم کار میں نہ ہو محفوظ
تو حرف صدق بہ انگشت ہائے پا لکھیے

سیّد قاسم محمود

میں رئیس صاحب کا کالم ہوں

وہ خالق تھا، میں اس کی مخلوق ہوں
وہ مصوّر تھا، میں اس کی تصویر ہوں
میں رئیس صاحب کا کالم ہوں
وہ عامل تھا، میں اس کا معمول ہوں
وہ فن کار تھا، میں اس کا فن ہوں
میں رئیس صاحب کا کالم ہوں

آج ان کی وفات کے بعد ہر شخص یہ دعویٰ کرتا پھر رہا ہے کہ رئیس صاحب سب سے زیادہ محبت اس کی ذات سے کرتے تھے، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ مجھے چاہتے تھے۔ اپنے بچوں سے بھی زیادہ، اپنی شاعری سے بھی زیادہ، اپنے قطعات سے بھی زیادہ۔ مجھے آج بڑے دکھ سے یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ میں دل ہی دل میں ان کے قطعات سے جلا کرتا تھا۔ میں نے دبے دبے لفظوں میں ان سے کئی بار شکوہ کیا کہ آپ قطعہ تو روزانہ چھپواتے ہیں۔ لیکن مجھ پر لطفِ کرم ہفتے میں صرف ایک بار کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ میری بات مسکرا کر ٹال دیتے۔ لیکن ایک دفعہ مجھے غصّہ آگیا۔ میں نے ان کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے مجھے لکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن میں نے ان کے لفظوں کو ایک قدم نہ چلنے دیا۔ وہ جھلاگئے۔ حسبِ معمول کمروں میں بولائے بولائے پھرے، پھر معصوم

صورت بنائے میرے پاس آئے اور تسلی دیتے ہوئے بولے "دیکھو میرے پیارے کالم، تم بڑے بھائی ہو، قطعہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ میں مرجاؤں گا تو تم اس کے باپ ہو گے اس سے ناراض نہ ہوا کرو، اس کی زندگی عارضی اور یک روزہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں جس چیز کی راگنی چھیڑتا ہوں، اس کا تعلق اسی ایک دن سے ہوتا ہے۔ تم میرا اصل گیت ہو، تم میرے اصل لخت جگر ہو، تمہارے تاروں پر میں اپنی روح کا اصل نغمہ چھیڑتا ہوں۔ تم اور صرف تم ہی ہو جو میرے دل کا پورا وزن سہار سکتے ہو قطعہ تو روز پیدا ہوتا ہے، روز مرتا ہے۔ لیکن تم امر ہو، تمہارے اندر جذب ہو کر میں ان نغموں کو چھیڑتا ہوں جو ابدی ہیں اور جن کو فنا نہیں۔ تم اپنی قدر خود جانو کہ تم وقت کے کتنے بڑے بڑے مسئلوں کی ترجمانی کرتے ہو کتنے بڑے بڑے لوگوں کی سفارت کرتے ہو اور کیسے کیسے گرے ہوئے لوگوں کو تھام کر ان کو سہارا دیتے ہو، ان کی حاجت روائی کرتے ہو۔"

میں نے غور کیا تو بہت شرمندہ ہوا۔ قطعہ لکھنے کے لیے انھیں کوئی کاوش نہ کرنی پڑتی تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں یا گھاس کے قطعے پر ٹہلتے ہوئے اک ذرا گنگناتے اور قطعات جھم... لے کر ہاتھ باندھ.... کر کھڑے ہو جاتے، لیکن مجھے اپنے ہاتھوں سے بناتے سنوارنے کے لیے پورا ہفتہ، بعض اوقات دو دو ہفتے محنت کرتے کسی تحقیق طلب امر کے لیے کتابیں دیکھتے۔ احباب سے مشورہ کرتے، مواد کی چھان پھٹک کرنے کے بعد مجھے تین حصوں میں تقسیم کرتے۔ پہلا حصہ قومی اجتماعی، اصولی امور کے لیے، دوسرا حصہ علم و ادب کے لیے، تیسرا حصہ قافلے سے بچھڑے ہوئے غریبوں، محتاجوں، بیوگان، یتیموں، بے بسوں، بے کسوں کے لیے وقف ہوتا۔ ملک کا کوئی بڑے سے بڑا ادیب، شاعر، دانشور، فن کار، ڈاکٹر انجینئر، سائنس داں اور سیاسی رہنما ایسا نہیں ہے جس کو میرے دامن صفحات میں جگہ نہ دی گئی ہو۔ جتنی بھی قابل احترام ہستیاں موجود ہیں، وہ میرے صفحات میں زندہ ہیں۔ قوم اور معاشرے کو پیش آمدہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے، جس کو انھوں نے اپنے سازِ قلم سے چھیڑ کر سوزِ دروں سے میرے تار و پود میں نہ سمودیا ہو۔ غربت،

افلاس، جہالت، ضعیف الاعتقادی، بدعنوانی، رشوت، فرقہ واریت، نسل پرستی جہیز کی لعنت، معاشرتی خرابیاں، اور بری رسوم میرے ہاں آئیں تو عریاں ہو گئیں۔

ان کی الماری میں ملک بھر سے آئی ہوئی سیکڑوں کتابیں اور رسالے رئیس صاحب کے دو چار سطرے تبصرے کے لیے مہینوں اپنی باری کا انتظار کرتی رہتیں۔ ہر ہفتے چار پانچ کتابوں پر خوشنما لفظوں کے پھول کاڑھ کر میرے دامن میں ٹانک دیتے۔ اس معاملے میں وہ کسی کی سفارش نہ مانتے تھے۔ بس اپنی موج کے مالک تھے۔

میز کی درازوں میں اور ادھر ادھر دوسری جگہوں پر حاجت مندوں کے خطوط کے انبار لگے ہوئے۔ میں بیوہ ہو گئی ہوں، میرے تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، کیا کروں، میرا باپ مر گیا، میں یتیم ہو گیا۔ اپنی تعلیم کیسے جاری رکھوں اور بہنوں بھائیوں کی کفالت کیسے کروں۔ میری چار بچیاں شادی کے لائق ہو گئی ہیں، بہت پیاری خوش کردار، تعلیم یافتہ سگھڑ بیٹیاں ہیں، جس گھر میں جائیں گی، چار چاند لگا دیں گی لیکن لوگ جہیز مانگتے ہیں، جہیز میں کہاں سے لاؤں، رئیس صاحب خدا کے لیے کچھ کیجیے۔ میں بی اے پاس ہوں، دو چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ہیں۔ میرے شوہر کو ہیروئن کی لت پڑ چکی ہے میں ان کی زندگی بھی بچانا چاہتی ہوں اور بچوں کی صحیح پرورش بھی کرنا چاہتی ہوں، میں لکھنے پڑھنے کا کام کر سکتی ہوں، برتن مانجھ سکتی ہوں، کپڑے دھو سکتی ہوں، سب کام کر سکتی ہوں، اتنا مجبور ہو چکی ہوں کہ . . . . اگر کسی کو ایسی ملازمہ کی ضرورت ہو کر . . . . خیر اوپر اللہ ہے نیچے آپ کی ذات، مجھ کو کوئی سروس دلوا دیجیے۔ میں صدر میں ٹھیلہ لگاتا ہوں۔ میرا بیٹا میٹرک میں فرسٹ گریڈ میں آیا ہے بہت ذہین، محنتی اور ہونہار ہے لیکن اسے آگے پڑھانے کی ہمت نہیں۔ اپنے کالم میں ایسا مضمون لکھ دیجیے کہ کوئی اللہ کا بندہ اس غریب کا ہاتھ تھام لے۔

میرا نام رئیس صاحب نے "معمول" رکھ چھوڑا تھا۔ دراز پر ہلکے سے انگلی رکھ کر چٹکی بجاتے "اٹھ میرے معمول بسم اللہ" اللہ نے ان کے قلم میں ایسی برکت دی تھی کہ جو لکھ دیا، سو ہو گیا۔ اللہ سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ میری وساطت سے لاکھوں روپیہ

عیاں اور لاکھوں روپیہ پوشیدہ، اور پسے نیچے کی طرف یوں ادا ہوا کر دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی خبر نہ ہوئی۔

اکثر اوقات وہ نفسیاتی مریضوں اور مستحق لوگوں کی مدد کے لیے ماورائے حسّی ادراکات، مافوق الفطرت، روحانیات اور جنات کا بادہ بھی اوڑھ لیا کرتے ایسے موقعوں پر میں دل ہی دل میں مسکرایا کرتا اور کبھی کبھار چھیڑ دیا کرتا، "کیوں حضرت" لوگوں کو بیوقوف بنایا جا رہا ہے، وہ اک ادائے دلبری سے ڈانٹ دیتے "چپ رہ بے تجھے کیا معلوم، بعض لوگ اتنے مجبور اور بے بس اور اپنی جہالت اور ضعیف الاعتقادی کے حصار میں ایسے مقید ہوتے ہیں کہ وہ علاج بالمثل ہی سے ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ جس شخص نے طے کر رکھا ہو کہ اس کے سر پر جن یا آسیب کا سایہ ہے تو اس کا دل رکھنے کو کہنا پڑتا ہے کہ ہاں بیٹے تمہارے سر پر تو جنوں کے بادشاہ کا سایہ ہے۔ ایسا کہا جائے گا، تبھی تو مریض کا علاج ہو گا۔ جیسا مریض، ویسا علاج۔ ہر شخص کے خاندانی پس منظر، تربیت، تعلیم اور مزاج کے مطابق نفسیاتی حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ خبردار جو تم نے یہ راز کی بات کسی کو بتائی۔

ان کی وفات پر سب اپنا اپنا رونا رو رہے ہیں، لیکن کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ مجھے کتنا دکھ ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے خود میں مر گیا ہوں۔ ان کا میرا تعلق وہی تھا جو ایک سانس کا دوسرے سانس سے اور ایک دھڑکن کا دوسری دھڑکن سے ہوتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، کون تھا جس کو وہ اپنے ہمراہ رکھتے تھے گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، جاگے ہوئے ہوں یا گہری نیند میں ہوں وہ ہمیشہ مجھے اپنی جان سے چمٹائے رکھتے۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ حقیقت ہیں اور میں ہمزاد، یا میں حقیقت اور وہ ہمزاد۔ ہم دونوں میں ایسا تال میل تھا کہ وجود کو سائے اور سائے کو وجود سے الگ کرنا ممکن نہ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان کا قاتل دھوکا کھا گیا۔ شیطان نے اس سے کہا تھا، جاؤ رئیس امروہوی کو قتل کر آؤ، کامیاب لوٹو گے تو انعام دوں گا۔ قاتل آیا اور اس نے جالی

رئیس امروہوی تو میں ہوں
میں رئیس صاحب کا کالم ہوں
وہ فانی تھا، میں لافانی ہوں
وہ تو نقش تھا، اصل نقّاش میں ہوں
وہ عارضی تھا، میں مستقل ہوں
وہ سایہ تھا، میں حقیقت ہوں
حقیقتِ اولیٰ، صداقت کبریٰ
میں رئیس صاحب کا کالم ہوں
وہ تصویر تھا، میں مصوّر ہوں
وہ مخلوق تھا، میں خالق ہوں
وہ کاغذ تھا، میں قلم ہوں
میں رئیس صاحب کا کالم ہوں
میں رئیس امروہوی زندہ ہوں تابندہ ہوں
قاتلوں، شیطانوں سے جنگ کھلی کرتا ہوں

○

منیر نیازی

رئیس امروہوی صاحب اوّل سے آخر تک شاعر ہی تھے۔ وہ شمالی امریکہ اور العین میں میرے ہم سفر تھے۔ ان کا کراچی میں گارڈن ایسٹ والا گھر اکثر میری محفل آرائیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ وہ اچھے ہم سفر، خوب صورت میزبان اور خوب صورت شاعر تھے۔ خدا ان پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وسیلے سے رحمت کرے۔

پروفیسر بزم انصاری

رئیس امروہوی ۔۔۔ ایک نادر شخصیت

حضرت رئیس امروہوی جن کے نام کے ساتھ مرحوم کے لفظ کا اضافہ کرنے کو اب تک نہ دل تسلیم کرتا ہے اور نہ لکھنے کو قلم آمادہ ہے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء جمعرات تقریباً پونے چھ بجے شام رہائشی آفس میں اس وقت ایک بدبخت علم دشمن قاتل کی گولی کا نشانہ بن کر خالقِ حقیقی سے جا ملے جب وہ ایک تاریخ ساز مضمون سپردِ قلم کر رہے تھے۔

عجیب بات ہے کہ عباسی شہید اسپتال کے مردہ خانے سے لحد میں سپردِ خاک ہونے تک سب کچھ ان غمزدہ آنکھوں نے دیکھا لیکن دل ابھی تک یاد کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا کہ رئیس صاحب ہم سے بچھڑ گئے ہیں! کیفیت یہ ہے کہ بقول رئیس صاحب!

اب دل کی یہ شکل ہو گئی ہے
جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے

وہ قلندر صفت بے ضرر انسان جو زندگی کی ۷۴ منزلیں طے کر چکا تھا، سب کا دوست، سب کا ہمدرد، سب کا خیرخواہ، جس کا درِ فیض بلا امتیازِ مذہب و ملت بلاتخصیص رنگ و نسل سب کے لیے کھلا تھا۔ اس کا ایسا کون دشمن ہو سکتا تھا؟ پھر یہ سانحہ کیوں پیش آیا؟ قاتل کون تھا؟ یہ اور اس قسم کے نہ جانے کتنے سوالات آسیب کی طرح ذہن پر مسلط ہیں اور دل کی وحشت ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا

ایسا کیوں ہے؟ شاید اس لیے کہ

اک عمر کا ساتھی چھوٹا ہے
مدت کا سہارا ٹوٹا ہے
دل ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہرے گا
صبر آتے آتے آئے گا

ابھی کل ہی کی تو بات ہے! اس سانحے سے دو روز قبل وہ فون پر میری شفیق بہن (جو رضاعت کے سبب میری ماں کا درجہ رکھتی تھیں)، کے اچانک انتقال پر بڑی دردمندی سے اظہارِ تعزیت اور بڑے مشفقانہ لہجے میں مجھے صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ وہ اس ہیچ کار کو اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ فون پر تعزیت کے ساتھ مجھے صحت کا خیال رکھنے کی تاکید بھی کر رہے تھے، یہ آخری گفتگو تھی جو ان کے سانحۂ ارتحال سے دو روز قبل فون پر ہوئی تھی! لیکن ذرا ٹھہریے رئیس صاحب کی محبت اور شفقت کا ذکر آیا ہے تو یہاں میں آپ کی توجہ قاسم محمود صاحب کے ایک مضمون کی طرف بھی مبذول کراتا چلوں جو "میں رئیس صاحب کا کالم ہوں" کے زیرِ عنوان ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء "جنگ" کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے فرمایا ہے: "آج ان کی وفات کے بعد ہر شخص یہ دعویٰ کرتا پھر رہا ہے کہ رئیس صاحب سب سے زیادہ محبت اس کی ذات سے کرتے تھے"۔ اگر ایسا ہے تو یہ کمال ہے رئیس صاحب کے اس حسنِ اخلاق اور حسنِ سلوک کا جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے کہ وہ بلا امتیاز و تخصیص سب کے دوست، سب کے ہمدرد اور سب کے خیر خواہ تھے، یہ اور بات ہے کہ نفسا نفسی کے موجودہ مشینی دور میں پرانے لوگوں خصوصاً رئیس صاحب کی وضعداری، رکھ رکھاؤ، روایات و اقدار کا پاس، نئے لوگ نہ سمجھ سکیں، حقیقت یہ ہے کہ رئیس صاحب ایک ایسی مقناطیسی شخصیت کے مالک تھے کہ جو ان سے ملتا تھا ان کی محبت کے اَن مٹ نقوش لے کر اٹھتا تھا، یہی ان کا کمال تھا۔ رئیس صاحب کے دیرینہ دوستوں اور رفقا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن پر ان کی اس اچانک اور ڈرامائی موت کا غم شدید سے شدید تر ہے وہ اگر یہ دعویٰ بھی کریں کہ رئیس صاحب ان سے

محبت کرتے تھے تو بے جواز و بے دلیل نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر راقم نے اگر یہ کہا ہے کہ رئیس صاحب اسے بہت عزیز رکھتے تھے تو راقم کے پاس اس دعوے کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہونا چاہیے! بات چونکہ اب دلیل اور ثبوت تک پہنچی ہے تو کیوں نہ ان اٹوٹ رشتوں کی تصدیق اور وضاحت مختصراً رئیس القلم کی تحریروں کے اقتباس سے کرلی جائے جو ہمارے درمیان استوار تھے ورنہ راقم رئیس صاحب کے بارے میں آگے جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہے قارئین کے نزدیک معتبر اور درخور اعتنا نہیں ٹھہرے گا۔

رئیس صاحب اپنے ایک طویل تبصرے مرقومہ ۳۰ مئی ۱۹۸۲ء اس ناچیز کے بارے میں فرماتے ہیں "آج سے نصف صدی قبل کے امروہہ کی تصویر پیش نظر ہے۔ میں نے اور جرم انصاری نے ایک ایسے ہی ماحول میں آنکھیں کھولیں، ہم نے اپنے گرد و پیش مخصوص ثقافتی اقدار، وضع داری اور رکھ رکھاؤ کو کارفرما پایا۔ ہم وطنی اور ہم ذوقی کے علاوہ میرے اور بزم انصاری کے رشتے ہیچ در پیچ، تہہ در تہہ اور خم در خم ہیں۔ بزم صاحب نے جتنے بھی تعلیمی اور فلاحی ادارے قائم کیے ان سب کی خدمت گزاری یا سرپرستی کا شرف مجھے حاصل ہے۔ اس سلسلۂ خدمت کی ایک کڑی پاک اورینٹل کالج بھی ہے۔ جو انہوں نے ۱۹۶۳ء میں میرے ایما پر قائم کیا تھا۔ کالج کا قیام اور اجرا، ایک جنگا سودا تھا لیکن اس مرد بلند ہمت نے صد ہزار مشکلات کے باوجود کالج کی بنیادوں کو متزلزل نہیں ہونے دیا، یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس چھوٹے سے علمی ادارے سے بڑے بڑے نام وابستہ رہ چکے ہیں۔ علامہ نیاز فتح پوری اور سید ذوالفقار علی بخاری مرحوم بھی استاد کی حیثیت سے کالج کی سرپرستی کرچکے ہیں، بزم انصاری شاعرانہ حساسیت کے باوجود ایک علمی، فرض شناس، ہمدرد اور مخلص انسان ہیں۔"

تو حضور! یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ یہ تو رئیس صاحب کی تحریر کا مختصر سا اقتباس تھا ورنہ پچاس سالہ دوستی اور رفاقت کی نہ جانے کتنی یادیں ان گنت تحریروں اور تصویروں کے علاوہ مشترکہ طور پر قائم کردہ فلاحی، ثقافتی اور ادبی اداروں کی شکل میں بکھری پڑی ہیں، کس کس کا ذکر کیا جائے، اندرون

پاکستان ہو یا بیرونِ پاکستان، بھارت کے بڑے بڑے شہروں، لندن، یورپ کینیڈا اور امریکہ کے مہینوں کے دورے، ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں میں شرکت محض ہمسفری کی حد تک نہ تھی بلکہ جس شہر میں جاتے رئیس صاحب اور میں ایک ساتھ ایک ہی کمرے میں فروکش ہونا پسند کرتے تھے۔ اس لیے میزبان ان کی خواہش پر ایسا ہی اہتمام کرتے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں جب تمغۂ حسنِ کارکردگی کا اعزاز وصول کرنے اسلام آباد جانا ہوا تو اس بندۂ عاجز کو سرکاری طور پر ان کے رفیقِ خاص کی حیثیت سے کراچی سے مدعو کیا گیا تھا۔ بہرحال قاسم محمود صاحب کا مذکورہ مضمون "میں رئیس صاحب کا کالم ہوں" بڑے دل نشین انداز میں لکھا گیا ہے، لیکن جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے صاحبِ مضمون سے معذرت کے ساتھ مجھے اس سے اختلاف اس لیے ہے کہ

میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ!

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اردو صحافت میں قطعہ کے موجد رئیس امروہوی تھے اور یہ سب مانتے ہیں کہ اس میدان میں ان کا مدِمقابل کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اردو صحافت میں جب لوگ انھیں بابائے قطعہ کہتے تھے تو وہ اس پر بھی فخر کرتے تھے۔ پھر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قطعات کی صورت میں ۴۳ سال تک انھوں نے روزانہ پاکستان کی تاریخ لکھی ہے۔ مستقبل کا مورخ اس سے ضرور استفادہ کرے گا، اس لیے قطعہ کی زندگی کو عارضی یا ایک روزہ کہنا سراسر زیادتی ہے، قطعہ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے رئیس صاحب کا خیال اس کے برعکس تھا، ان کے کالم کے خلا کو تو سید محمد تقی جیسے بڑے صحافی بھی بڑی حد تک پُر کر سکتے ہیں پھر یہ ادبی و علمی گھرانہ ہے زاہدہ حنا، جون ایلیا، سید محمد عباس اور رئیس صاحب کی دختر شاہانہ رئیس سب اہلِ قلم ہیں، لیکن قطعہ! قطعہ کے لیے رئیس امروہوی کا ہم پلّہ نعم البدل ملنا مشکل ہی نہیں محال ہے۔ اور یہ بات آج سے اٹھارہ سال پہلے راقم سے دورانِ گفتگو "جنگ" کے ایڈیٹر انچیف جناب میر خلیل الرحمٰن نے جنوری ۱۹۷۱ء میں اس وقت کہی تھی جب ہم "جشنِ رئیس امروہوی" منا رہے تھے۔

رئیس صاحب کا مضمون "خود تماشا ہوں، خود تماشائی" جو "جنگ" کی ۳۰ ستمبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے، ایک ایسا سوانحی خاکہ ہے کہ قاتل کی خونخوار گولی نے اگر اسے تکمیل کے مرحلے تک پہنچنے کی مہلت دی ہوتی تو ان کی ۶۰ سالہ علمی، ادبی، صحافتی اور تہذیبی زندگی کی بڑی دلچسپ سرگزشت اور نادر الوجود داستان منظر عام پر آتی جو بلاشبہ فکر و فن، شعر و ادب، تاریخ و ثقافت، لسانیات، ادبیات، سماجیات اور نفسیات پر محیط تاریخ کا ایک حیرت انگیز شاہکار بن جاتی، جو وہ لکھ چکے تھے وہ اس مضمون کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے جو انھیں لکھنا تھا، ابھی تو وہ اپنے ابتدائی دور کی سرگزشت تک ہی پہنچے تھے کہ رشتۂ لوح و قلم منقطع کر دیا گیا۔
کون نہیں جانتا کہ رئیس امروہوی کی شخصیت وہ شخصیت تھی جس کے سر پہ ہشت پہلو شخصیت کا تاج مرصع پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ ان کی تمام حیثیتیں، تمام صلاحیتیں گھل گھلا کر اور سمٹ سمٹا کر ایک ایسی نادرِ روزگار شخصیت کے سانچے میں ڈھل گئی تھیں جسے عہدِ حاضر کی مشرقی تہذیب اور ثقافت کا نمونہ اور مثالیہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ہر عہد کی تہذیب و ثقافت اپنے اظہار و ابلاغ کے لیے چند افراد کو منتخب کر لیا کرتی ہے جنھیں معاشرے کے تمام فکری و ثقافتی رجحانات کی علامت سمجھا جاتا ہے رئیس امروہوی کی شخصیت ایک ایسی ہی علامت بن چکی تھی، ان کی ذات شوخی و سنجیدگی رنگینی و متانت، رندی و ثقاہت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی، رفتہ رفتہ ان کے تمام کمالات، ان کی تمام صلاحیتیں بلکہ ان کا وجود ایک نادر شخصیت کے سانچے میں ڈھل گیا تھا، نرم خو، خندہ رو، نہ کرختگی نہ ثقالت بلکہ ایک پیکر لطافت، جس کی ہر ادا سے خاص محبوبیت ٹپکتی تھی، شعر کے موقع پر شعر، علم کی جگہ علم، رنگینی کے موقع پر رنگینی، اور سنجیدگی کے محل پر سنجیدگی، ان کی صحبت، معلومات، تجربات اور مشاہدات کی ایک زندہ درس گاہ تھی، وہ اپنی ذات سے ایک انجمن بلکہ دبستان تھے، وہ جس محفل میں ہوتے ماحول تابناک نظر آنے لگتا۔

رئیس صاحب کی آخری تحریر اور اس پر خون کے چھینٹے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے موت کو بھی اسی خوش طبعی سے گلے لگایا جو ان کا اچھا اسوۂ حیات تھا اور جس پر وہ عملاً کاربند رہتے تھے، صبر و تحمل کا یہ عالم تھا کہ قاتل کی گولی کا شکار ہونے کے بعد بھی جیسا کہ معلوم ہوا، نہ انھوں نے شور و واویلا کیا، نہ کسی کو آواز دی، دیر تک سر سے خون بہتا رہا اور کافی دیر بعد جب لوگوں کو علم ہوا تو انھوں نے صرف 'پنکھا' پنکھا کے الفاظ دہرائے، گویا ہوش میں تھے، بول رہے تھے، پہچان رہے تھے اگر بروقت علم ہو جاتا اور فوری طبی امداد میسر آجاتی تو ممکن تھا کہ ان کی جان بچائی جاسکتی لیکن موت کا وقت معین ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں انسان بے بس ہے! تاہم لوح و قلم کی پاکیزگی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ قاتل کی گولی نے رئیس صاحب کو شہید علم و ادب کے منصب پر فائز کر دیا، اللہ تعالیٰ ان کی شہادت قبول فرمائے ؎

وہ پاسِ داریِ وضع وہ احترامِ بشر!
وہ لوگ بزم کہاں کھو گئے خدا جانے؟

○

مستنصر حسین تارڑ

ایک تنگ نظر اور تنگ دماغ معاشرے میں جس میں کہ ہم رہتے ہیں، رئیس صاحب کی وسعت ہم جیسوں کے لیے زندہ رہنے کا ایک وسیلہ تھا، ایک جواز تھا۔ وہ شاید آخری بزرگ تھے جو کسی گروہ کے نہ تھے بلکہ سب کے تھے ان کے زمانے میں، وہ مہاجر تھے نہ میں پنجابی تھا اور یہ ان کی وسعت کی دلیل تھی۔ وہ ایک دلیر شخص تھے ہم ان کی دلیری سے تقویت پاتے تھے۔ وہ ایک بہت سچے آدمی تھے آج ہم ان کے نہ ہونے سے شاید سچ سے دور ہو رہے ہیں۔

بزم انصاری

رئیس القلم

رئیس القلم حضرت رئیس امروہوی زمانۂ حال کی ان نادرِ روزگار شخصیتوں میں تھے جن کا ہم پایہ، ہم پلّہ، مثل اور نظیر کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے! ان کی ذات شوخی، زندہ دلی، رندی اور روحانیات کا ایک ایسا حیرت انگیز امتزاج تھا جسے سمجھنا آسان نہیں، ان کی شخصیت مجموعۂ اوصاف بلکہ "عطر مجموعہ" تھی جس کے خدو خال اور نقش و نگار کی نقشہ کشی ازبس دشوار ہے کیوں کہ خدوخال کا حسن اور نقش و نگار کی رعنائی کسی تجزیے کی متحمل نہیں ہو سکتی ان کی ہمہ گیر شخصیت سمجھنے کے لیے ایک ایسے باغ و بہار فرد کا تصور کیجیے کہ شوخی و سنجیدگی کا پیکر، رندی و ثقاہت کا مجسمہ رنگینی و متانت کا نمونہ، یار ہمہ داں، رفیق ہمہ محفل، شعر کا نکتہ سنج، عروض کا حقیقت شناس، صنائع بدائع کا مزاج داں، مجلس آرائی کے فن میں طاق، زندوں کی انجمن میں رند، پارساؤں کی مجلس میں پارسا، لطیفہ طرازی میں منفرد، فنِ تقریر سے آشنا، نشست و برخاست اور وضع داری میں بزرگوں کی روایات کا ورثہ دار، آدابِ کہن اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کا محرم، بزرگوں میں بزرگ، خردوں میں خرد، طبیعت میں بلا کی شوخی، چہرے پر غضب کی سنجیدگی، الغرض ایک ایسی معاشرت، ایک ایسی ثقافت اور ایک ایسے تمدّن کا مرقع جو ہر چیز پر حاوی اور ہر رنگ میں منفرد ہو، یہ تھی رئیس امروہوی کی ہشت پہلو شخصیت جس کی بالغ نظری، تاریخی بصیرت

ادبی صلاحیت، فنی مہارت اور علمی وسعت کا اندازہ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، وہ بیک وقت عظیم شاعر بھی تھے اور بلند پایہ ادیب اور انشاپرداز بھی، وہ تاریخ داں بھی تھے اور لسانیات کے مزاج داں بھی، وہ نفسیات کے نبض شناس بھی تھے اور روحانیات کے رموز سے آشنا بھی، رئیس امروہوی کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی شاعری تھی۔ ان کے قطعات نے ان کے نام کو ساری دنیا میں پھیلایا اور ان کی بیباک شاعری اور نڈر انشاپردازی نے ان کی شہرت کو دوام بخشا۔ اس میں کلام نہیں کہ رئیس امروہوی مولانا ظفر علی خاں کے بعد بیسویں صدی کے سب سے بڑے قادر الکلام اور زود گو شاعر تھے اور اس میدان میں دور تک ان کا ہم پلہ، ہم پایہ مقابل اور حریف کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ مولانا ظفر علی خاں کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ ان کی شاعری: قادر الکلامی اور زود گوئی کے بارے میں یہ فیصلہ دیا جا چکا ہے کہ ؂

ہر آں کہ تیغ بگیرد نمی شود غازی
ہر آں کہ شعر بگوید ظفر علی خاں نیست

ترجمہ:۔ یعنی ہر وہ شخص جو تلوار اٹھائے غازی نہیں ہو سکتا اور ہر وہ شخص جو شعر کہے وہ ظفر علی خاں نہیں ہو سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ ایران میں فارسی شعر گوئی کے ایک زبردست مقابلے کے بعد مولانا ظفر علی خاں کی شاعری اور قادر الکلامی کو ایران کے وزیر اعظم کی طرف سے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا گیا تھا، لیکن جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے رئیس امروہوی کے کلام کا ذخیرہ مولانا موصوف کے کلام سے بھی زیادہ ہے، بہرحال یہ جملہ معترضہ تھا جو قادر الکلامی اور زود گوئی کے ضمن میں آگیا ورنہ ہر دو کا مقابلہ کرنا مقصود ہرگز نہیں ہے۔ مولانا ظفر علی خاں اور رئیس امروہوی دونوں کی عظمت اپنی اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو صحافت میں باقاعدہ قطعہ گوئی کا اضافہ رئیس امروہوی ہی کا کارنامہ ہے۔ کوئی مانے یا نہ

مانے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اردو صحافت میں رئیس امروہوی کو قطعہ کے موجد کا مقام حاصل ہے اور آج اردو صحافت میں "قطعہ" کی جو اہمیت ہے یہ ان ہی کی مرہون منت ہے جس کا سہرا بلاشبہ روزنامہ "جنگ" کے سر ہے۔

قسام ازل نے ذہانت و فطانت، سلاست و بلاغت، شوخی و زندہ دلی، کی تقسیم میں ان کے لیے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا طبیعت دراک تھی، فکر چالاک تھی، جو کچھ دل سے زبان تک اور زبان سے قلم تک آیا اس نے گل ہائے معنی کا وہ جلوۂ رنگ دکھایا کہ سخنوری اور معنی گستری نے اس کے قدم چومے۔ ان جیسے قادر الکلام شاعر کے کلام پر تفصیلی تبصرے کے لیے تو دفتر درکار ہیں وہ کون سی صنفِ سخن ہے جسے ان کی ضربتِ قلم نے نہیں نکھارا، زیر نظر مضمون کی محدود گنجائش ان کی شاعری کے سمندر پر اجمالی نظر کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی، یہاں ان کی شاعری بالخصوص قطعہ گوئی کا ذکر صرف ان کی باکمال اور ہشت پہلو شخصیت کے حوالے سے کرنا مقصود ہے۔

ان کے قلم کی دسترس صرف علم و ادب اور شعر و سخن تک ہی محدود نہ تھی، حالات حاضرہ پر بھی وہ بڑی گہری نظر رکھتے تھے، دلبرانِ سیاسی کی ایک ایک ادا کے محرم تھے ان اسرار کا انکشاف وہ اپنے قطعات کے ذریعے کرتے تھے لیکن زبان وہی اپنی سادہ، سلیس اور مخصوص جو لوگ ان کی زبان سے واقف اور ان کے انداز بیان کے رموز سے آشنا ہو گئے تھے وہ معنی و مفہوم کو سمجھ کر پھڑک اٹھتے تھے جو تہہ تک نہ پہنچتے وہ بھی بہرحال زبان کی چاشنی سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ شاعری ان کے فکر رسا کی بلائیں لیتی، سخن سنجی سر دھنتی اور معنی آفرینی وجد میں آ کر رہتی۔ چار مصرعوں میں ایسے نکتے بیان کر جاتے اور ان مسائل کی گرہ کشائی کرتے جو سالہا سال کے مطالعے سے بھی نہ حل ہو پاتے۔

کچھ سیاست پر ہی موقوف نہیں رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عاصی، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، سنی، شیعہ سبھی ان کے ہم مجلس اور یارانِ محفل تھے اور وہ

بلاامتیاز رنگ و نسل سبھی سے بڑے اخلاص اور کشادہ دلی سے پیش آتے تھے۔ مرنجان مرنج طبیعت، کرختگی نہ ثقالت بلکہ ایک پیکر لطافت، یاروں کے یار، عصبیت انھیں چھو کر نہیں گزری تھی، کمال تو یہ ہے کہ ذاتی یا نظریاتی اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ بھی وہ عزت و احترام اور بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ عفو و درگزر ان کا خاص مزاج تھا افکار و افراد دونوں ہی کے سلسلے میں ان کا ذہن آگے دیکھنے کا عادی تھا، وضع داری اور تعلقات کو بہر قیمت برقرار رکھتے تھے، وہ نظریاتی اختلاف کو کبھی ذاتی مخالفت کی بنیاد بننے نہیں دیتے تھے۔

وہ اپنی ذات سے ایک انجمن بلکہ ایک دبستان تھے، ان کی صحبت ایک ایسی زندہ درسگاہ تھی جہاں سے بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا جا سکتا مثلاً ادب سے عشق، علم اور عالم کا احترام، گرد و پیش کے مسائل سے آگاہی اور ان کے حل کی کوشش، مجھے ان کی مقبولیت کا اندازہ تو تھا لیکن اتنا نہیں جتنا ان کے ساتھ بھارت، امریکہ، یورپ اور کینیڈا کے دوروں میں ہوا، ہر جگہ سے ابھی تک مجھے تعزیتی پیغام موصول ہوتے ہیں جن کی ترجمانی میں نے اپنے قطعۂ تاریخ وفات میں یوں کی ہے، جو اب سنگ مزار کی زینت ہے

قطعۂ تاریخ وفات حضرت رئیس امروہوی

زہے وہ موت کہ جس موت کا یہ عالم ہو
ہر ایک سینہ ہو بریاں، ہر آنکھ پُر نم ہو
کسے نصیب ہوا بزم مرتبہ ایسا
کہ شہر شہر رئیس قلم کا ماتم ہو

۱۹۸۸ء

رئیس امروہوی کی پہلی برسی (۲۲ ستمبر ۱۹۸۹ء) پر "جنگ" کے خصوصی ضمیمے کے لیے تحریر کیا گیا۔

منظر علی خاں

بابا

حضرت رئیس امروہوی کا خاکہ نما

اس خاکے کی تصنیف ایک خاص تقریب کے لیے حضرت رئیس امروہوی کی زندگی میں شروع ہوئی اور اس کی تکمیل ان کے انتقال کے بعد کی جا سکی لہذا خاکے کی تحریر مختلف مزاج کی حامل ہے۔

برِصغیر پاک و ہند میں باباؤں کا دور دورہ ہمیشہ سے رہا ہے وہ بابائے اردو ہوں یا بابائے فارسی، بابائے صحافت ہوں یا بابائے خطابت، جاق تپا ہوں یا دھرم تپا ——— پھر بابا یا تپا سے آگے دادا یا نانا بھی ——— اپنی تاریخ میں کہیں نہ کہیں ملتے ہیں۔ مثلاً دادا بھائی نوروجی اور نانا فرنویس وغیرہ۔ مگر ان تمام باباؤں، داداؤں اور ناناؤں کا اپنا اپنا ایک مخصوص میدان تھا یعنی میدانِ جنگ کے نانا کی میدانِ ادب میں نہیں چلتی تھی یا سیاست کے بابا کی میدانِ ظرافت میں، اب سے پہلے سنا ہے ایک نہیں چلتی تھی ——— اب سے پہلے یوں کہ اب سیاست اور ظرافت میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہ گیا۔ اکثر زعماء کی تقاریر پر جناب دلاور فگار کی آزاد نظم کا گمان ہوتا ہے جنھیں سن کر لوگ دل کھول کر ہنستے ہیں بشرطیکہ یہ نظم دلاور

صاحب نے خود سنائی ہو وہ اس لیے کہ متوزیسلطے نہیں ہو سکا کہ لوگ نظم سُن کر ہنستے ہیں یا دلاور فگار صاحب کو دیکھ کر — ہنستے ضرور ہیں۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ تمام باباؤں، داداؤں اور ناناؤں کا اپنا اپنا مخصوص میدان رہا ہے جس کے دم سے ان کی شہرت ہوئی یا ان کے دم سے ان سے منسوب میدان کو وسعت اور شہرت ملی اس موقع پر ایک بات اور بتا تا چلوں کہ میدان صرف باباؤں اور ناناؤں ہی کو نہیں ملا ہے ان کے لڑکے بالے بھی مخصوص میدانوں میں دندناتے نظر آتے ہیں، بہر حال یہ سو فی صد طے ہے کہ کوئی ہستی ایک سے زیادہ میدانوں کو اپنی جولانگاہ بنا تو سکتی ہے لیکن اس کی شناخت بہر حال کسی ایک میدان یا کسی ایک کوچے سے ہوگی جیسے اپنے مخدومی حضرت صہبا لکھنوی میدان صحافت کے علاوہ کسی اور کوچے میں بھی کبھی بڑے معروف تھے۔ سنا ہے اس پُر رونق کوچے کے ساکنان کے یہاں ان کا اکثر انتظار بھی ہوتا تھا لیکن یہ سعادت محض صحافت ہی کو ملی کہ حضرت صہبا نے اپنی جوانی گزارنے کے لیے اسے منتخب کیا، اب ایسے میں خود صحافت گزر جائے تو اللہ کی مرضی!

صاحبو — بات ہو رہی تھی کہ ہر عظیم شخصیت کا اپنا اپنا ایک مخصوص شعبہ ہوتا ہے جس شعبے سے اسے قلبی لگاؤ ہوتا ہے لہٰذا اسی میں اس کی کارکردگی بے مثل و یادگار رہتی ہے، اس کلیے کی روشنی میں جب ہم اپنے بابا کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے شعبے کا انتخاب مشکل ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے جہاں تک میں بابا کو دریافت کر سکا ہوں آپ کے سامنے بیان کر دوں کہ آپ خود فیصلہ کرلیں کہ بابا کا شعبہ کیا ہے یا کیا ہو؟

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ پہلے میں بابا کا تعارف کرا دوں پھر دیگر باتوں کا تذکرہ یا فیصلہ ہو۔ ویسے بابا کا تعارف کرانا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ تعارف کرانے کے لیے ضروری ہے کہ تعارف کنندہ نے متعارف کی جانے والی شخصیت کو بغور دیکھا ہو، اُسے سنا ہو، اُسے سمجھنے کی کوشش کی ہو۔ بابا کی ذات سے آگہی کے لیے انھیں دیکھنا، سننا اور سمجھنا ہی ضروری نہیں بلکہ بابا کی شخصیت کے صحیح ادراک کے لیے بابا کو محسوس کرنا ضروری ہے۔ ان کی شخصیت کے جتنے پہلو اب تک منظر عام پر آچکے ہیں ان سے زیادہ اب تک نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ بہر حال بابا کو محسوس کرنا سب

کے لیے کہاں ممکن؟ اور جس شخصیت کے لیے انھیں اچھی طرح سمجھنا ممکن ہے ان کے نزدیک بابا ہمیشہ اچھن صاحب یا مہدی صاحب ہی رہے ــــ کہ یہاں بابا کی شانِ بابائی شناسا ہے ہمیشہ کچھ خجل سی رہی کہ رشتوں کا تقاضا بھی یہی تھا۔

آج سے تقریباً ۹ سال قبل کا ذکر ہے کہ میرے احباب نے جانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ اگر میں نے اپنا مجموعۂ کلام شائع نہ کرایا تو یہ اردو ادب کا نقصان عظیم ہوگا۔ اپنی تسلی کے لیے شعر کہنا اور بات ہے اور مجموعۂ کلام شائع کرانا اور بات ہے۔ گزشتہ چوتھائی صدی سے وطنِ عزیز میں بات کتاب کی اشاعت پر ہی ختم نہیں ہوتی، اس کی رونمائی بھی کرائی ہوتی ہے اور یہ مرحلہ تمام مراحل سے زیادہ جاں گسل ہے۔ شہر کراچی ــــ "آب" و "ہوا" کے علاوہ تقریباً ہر معاملے میں خود کفیل ہے۔ پانی اندرونِ سندھ سے اور ہوا اندرونِ بلوچستان سے آتی ہے۔ بہر حال کراچی کی اس خود کفالتی کا کرشمہ بابا کے درِ دولت پر بڑی تفصیل سے نظر آتا ہے۔ آپ کو اپنی کتاب کی رونمائی کرانی ہے تو مقررین، والنٹیرز، والنٹیرز کے لیے بیج بلکہ مقررین کے لیے تقاریر اور دیگر تمام انتظام یہاں موجود ملے گا بلکہ اکثر مواقع تو ایسا ہوا ہے کہ کتاب کی رونمائی کا سارا اہتمام ہوگیا صرف کتاب ہی دیکھی جا سکی تو اس آڑے وقت میں بابا نے اکثر مواقع پر کتاب بھی مہیا کر دی ہے۔ ہاں ایسی کتابوں میں شامل "مصنف" کی تصویر جانے کیوں شرمائی شرمائی سی نظر آتی ہے خدا جانے وہ بابا سے شرماتے ہیں یا پڑھنے والوں سے۔

بہر حال جب میری کتاب مخدومی مشفق خواجہ کی رہنمائی اور دعاؤں کے طفیل طبع ہوگئی، واضح ہو کہ خواجہ صاحب کے یہاں کا دستور جداگانہ ہے۔ یہاں طباعت سے قبل کتاب دکھانے والے مصنف کو کم از کم نصف کتاب سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے وہ بھی ایسی صورت میں کہ خواجہ صاحب رعایت دینے پر آمادہ ہوں ورنہ عموماً تمام کی تمام کتاب دریا بُرد ہی ٹھہرتی ہے (بر وزنِ گردن زدنی)۔ آمدم بر سرِ مطلب، جب میری کتاب تیار ہوگئی تو میں اپنے ایک کزن انتصار کریم جنھیں حضرت رئیس امروہوی اپنے کالم میں پیارے لعل کہا کرتے ہیں، کے ساتھ ان کے دربار میں پہنچا ــــ دیکھا تو ایک خلقت جمع ہے، ہم بھی ایک کنارے بیٹھے رہے کہ بابا ذرا فارغ ہوں تو عرض مدعا کریں لیکن وہاں مسائل اتنے متنوع اور کثیر تعداد میں موجود تھے کہ فراغت کا ملنا

محال تھا، پھر بھی میں نے سوچا کہ شادی اور طلاق کے ایک ساتھ بھگتائے جانے والے مسائل ذرا نمٹ لیں تو بات شروع کردں ــــــ لیکن وہاں تو شادی کے بعد منے کی پیدائش کے سلسلے میں ہونے والی تقریب کے لیے اشعار کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اتفاق سے منے کی دادی یا نانی کی رحلت پر قطعہ تاریخ کی باری بھی آگئی ــــــ مجھے پیارے لعل نے کان میں کہا کہ آپ ان سلسلوں کے ختم ہونے کا انتظار چھوڑ دیں یہ اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک حضرت رئیس اپنی گدی پر موجود ہیں ــــــ لہذا جیسے ہی ایک بڑے میاں اپنی پوتی کی رخصتی لکھوا کر ہٹے اور میں آگے بڑھا ــــــ "پیارے لعل" نے میرا تعارف کرایا اور میں نے اپنی کتاب پیش کی، اور کہا کہ اس کتاب کے فلیپ کے لیے آپ کی گراں قدر تحریر اور کتاب کی رسم اجراء کے لیے آپ کی رہنمائی درکار ہے ــــــ بولے آپ پیارے میاں کے ساتھ آئے ہیں لہذا آپ کا کام ضرور ہوگا اور جلد ہوگا ــــــ میں نے سوچا فلیپ کی تحریر ہفتہ عشرہ میں مل جائے گی اور فلیپ تیار ہوا تو تقریب اجراء بھی دو تین ماہ میں منعقد ہو جائے گی، لیکن حضرت رئیس کے یہاں اتنے عرصے میں تو کئی دواوین تیار ہوتے ہیں۔ میں ابھی مزید کچھ عرض کرنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کر رہا تھا کہ فلیپ کی تحریر حضرت نے عنایت فرما دی اور بولے کتاب تیار ہو لے تو پھر تقریب بھی کر لیں گے، مگر تم ایسا کرو کہ شہر میں منعقد ہونے والی ادبی تقاریب میں آئندہ ضرور شرکت کرو کہ ان تقاریب کی تمہیں کچھ شدبد ہو جائے۔ تقاریب کی شدبد تو مجھے خیر کیا ہوتی ہاں حضرت رئیس کے آستانے سے جو شناسائی اور نسبت پیدا ہوئی وہ تا حیات جاری رہے گی۔

حضرت رئیس امروہوی کی شخصیت پر روشنی ڈالنے سے قبل ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ مجھ سے ایک صاحب نے جنھیں مجھ پر دانشوری کا مغالطہ ہے۔ پوچھا کہ یہ جو جنت اور جہنم اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے تو کیا واقعی یہ کوئی جگہ ہوگی یا یہ علامت کے طور پر بنائی گئی ہے۔ ظاہر ہے ہزاروں لاکھوں سال سے دنیا آباد ہے اور اربوں کھربوں انسان پیدا ہو کر مر چکے، آخر یہ جنت و جہنم کتنی بڑی ہوگی کہ سب اس میں سما جائیں ــــــ میں نے عرض کیا اللہ رب العزت نے انسان کی تخلیق کی اور اللہ کی مخلوق انسان نے کمپیوٹر تخلیق کیا جس کی متنوع کارکردگی، وسعت اور کشادگی انسانی ذہن میں مشکل سے سماتی ہے جب اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے انسان نے کمپیوٹر

بنایا ہے تو خود اللہ کیا ایسی جگہیں بنانے پر قادر نہیں ہو سکتا جہاں اربوں کھربوں لوگ سما جائیں ——— بولے ہاں! یہ تو ہے! قارئینِ کرام، اسی احسن الخالقین جس نے اپنے بندوں سے کمپیوٹر بنوایا اس نے خود ایک انسانی کمپیوٹر حضرت رئیس امروہوی کی شکل میں ہمیں عطا کیا ہے۔

آپ یقین کیجیے اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں حضرت سے ابھی اپنی گفتگو شروع بھی نہیں کر پایا ہوں کہ ان کے کوئی ملاقاتی آ گئے اور بولے رئیس بھائی صاحبزادے کی شادی بڑی جلدی میں طے ہو گئی ہے میرا نام تو آپ جانتے ہی ہیں، گھر والی کا نام یہ ہے، لڑکے کا نام یہ ہے، میرے سمدھی سمدھن اور دوسرے لوگوں کے نام بھی اس پرچے میں لکھے ہیں ——— تو حضرت آپ کا بڑا کرم ہوگا اس شادی کے لیے سہرا لکھ دیں، بابا بولے، ہاں ہاں کیوں نہیں ——— بیٹھو اطمینان سے کرسی پر ——— میں نے سمجھا اب گھنٹے دو گھنٹے کے لیے بابا ہاتھ سے گئے ——— میں پاس ہی رکھی صراحی سے پانی پینے لگا۔ سوچا کہ وقت گزارنے کے لیے جناب سید محمد تقی کی طرف چلا جاؤں، لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی جب تک میں پانی پی کر صراحی پر گلاس اوندھاؤں جب تک بابا کے ملاقاتی اپنے سمدھی سمدھن اور ان کے تمام خاندان والوں سے لیس سہرا لے کر جا چکے تھے۔

اکثر بڑے شعراء کی صفت قادر الکلامی بیان کی جاتی ہے۔ حضرت رئیس کے یہاں قادر الکلامی کے جلو میں نادر الکلامی بھی موجزن نظر آتی ہے۔ حضرت ایسے ایسے نادر الفاظ تخلیق کرتے ہیں اور ایسی ایسی نادر تشبیہات استعمال کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے یوں عقل کو دنگ بلکہ تنگ کرنے کے سامان حضرت رئیس کے یہاں اور بھی ہیں، مثلاً حضرت نے ایک مستقل شعبہ نفسیات کا کھول رکھا ہے جس کی اوٹ میں اس کی ایک SUBSIDIARY حویلی بھی قائم ہے جسے عرفِ عام میں جنسیات کہتے ہیں۔ اکثر لوگ اسی حویلی کا کھوج لگانے کے لیے شعبۂ نفسیات کا رخ کرتے ہیں بہرحال ان دونوں شعبوں یا حویلیوں میں انھیں کیا ملتا ہے یہ ہمارا موضوع نہیں! ہمیں صرف اس قدر پتہ لگ سکا ہے کہ یہاں عقل کو دنگ کرنے کے بہت سے سامان موجود ہیں بشرطیکہ عقل انسان کے پاس اس کی ذاتی ہو ——— لوگوں کو عقل کی فراہمی سے حضرت رئیس نے ہمیشہ اجتناب کیا ہے، اس لیے نہیں کہ یہ اس پر قادر نہیں بلکہ شاید اس لیے کہ شعر و شاعری، نفسیات، و جنسیات اور بقول حضرت رئیس

امروہوی مابعد النفسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے پاس اگر عقل نہ بھی ہو تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔

حضرت رئیس سے چونکہ میری شناسائی بلکہ میری رفاقت کی بنیاد شاعری ہے بس اسی سوچتا ہوں کہ ان کی شخصیت پر روشنی ڈالنے کے لیے ان کی شاعری کا سہارا لیا جائے ویسے بھی ہر موزوں بلکہ غیر موزوں طبع شخص بلکہ ادارے نے اپنا مافی الضمیر واضح کرنے کے لیے شاعری کا سہارا لیا ہے، سند کے لیے مندرجہ ذیل مصرعہ معروف حاضر ہے کہ ؎

پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی

اس میں غیر موزونیت بس اسی قدر ہے کہ پولیس پر آپ کی مدد فرض نہیں بلکہ آپ پر پولیس کی دامے، درمے، سخنے بلکہ جانی مدد فرض ہے ———— تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ بابا کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کے لیے بابا کی شاعری کا سہارا لیا جائے۔ اسی غرض سے میں نے اپنے سامنے بابا کی نظموں کا مجموعہ نجم السحر کھول رکھا ہے۔ اس مجموعے سے میری دلچسپی کی جہاں اور دوسری وجوہ ہیں وہاں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں شامل نظموں کی اشاعت پر حضرت رئیس کو تامل تھا، پھر انھیں خیال آیا کہ "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند" سو میری اس کتاب میں دلچسپی کا سبب وہ قصے ہیں جن کا کردار بننے پر میں اب اتنا قادر تو نہیں لیکن ہیرا پھیری کی تو کئی شکلیں ہیں۔

نجم السحر میں شامل پہلا قطعہ جو حضرت رئیس نے ۱۹۳۲ء میں کہا تھا کہ ؎

"جنوں اپنا ہی دلدادہ ہے اب تک
یہ مستی تشنۂ بادہ ہے اب تک
اجازت ہے تمہارا نام لکھ دوں
مرے دل کا ورق سادہ ہے اب تک۔"

روایت ہے کہ حصولِ اجازت کے بعد حضرت نے جو نام لکھنے شروع کیے تو دل میں کئی فاضل اوراق لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس کسی سے بھی حضرت نے اجازت مانگی اس نے آپ کو مایوس نہیں کیا بلکہ اپنے نام کے ساتھ کئی اور نام بھی بتا دیے کہ دلدادہ جنوں کا دل بہلا رہے۔

اس روایت پر یقین نہ کرنے کی کوئی بھی وجہ نہیں کہ حضرت نے خود کہا ہے کہ ؎

تم بھی کوئی دنیا سے نرالی تو نہیں ہو مانا کہ حسین ہو
ہر گام پہ نظروں کو میسّر ہے نظارا، اے انجمن آرا،
واے انجمن آرا،

انجمن آرا نے صورتِ حال کی کیا وضاحت کی اس کی ہمیں خبر نہیں، ہاں ہمارے سامنے حضرت کا ایک اور شعر ہے کہ ؎

حُسنِ خود بیں ترے وجدان و بصیرت کی قسم
میں محبت ہی محبت ہوں محبّت کی قسم

حقیقت یہ ہے کہ حضرت رئیس کے یہاں بجز محبّت کے اور کوئی جذبہ اتنا شدید نہیں۔ یہ محبت ہی کی کارفرمائیاں ہیں جو انھیں بے کل و بے تاب رکھتی ہیں اور شاید یہ جذبۂ محبت کی تپش ہی ہے کہ انھیں اپنی شخصیت اور اپنا آپ سیال سا محسوس ہوتا ہے جو کسی سانچے میں ڈھلنے کا منتظر ہے، کہتے ہیں ؎

نہ جانے کون سے سانچے میں ڈھالیں
ابھی تو صرف پگھلایا گیا ہوں

حضرت رئیس کی شخصیت کو سانچے میں ڈھالنے کے لیے وقت اور ماحول کو کیا کچھ جتن کرنے پڑیں گے اس کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے ماہ و سال کی ستّر سے زائد گردشیں بھی جب کسی سانچے پر متفق نہ ہو سکیں تو اب تو صرف اسی کا انتظار کیا جا سکتا ہے کہ "سیّال" ذرا ٹھنڈا پڑے تو اسے گوندھ کر کوئی شکل دے دی جائے۔

میں نے جب سے حضرت رئیس کو دیکھنا شروع کیا ہے، ان کی شخصیت اور ان کے ظاہری رکھ رکھاؤ میں کسی بھی قسم کی کوئی تبدیلی میں نے محسوس نہیں کی۔ وہی ہنستا مسکراتا چہرہ جس پر تھوڑی سی شکنیں گرچہ چند برسوں سے پڑ گئی ہیں لیکن ان شکنوں سے ان کے چہرے کی دلکشی پر کوئی اثر نہیں پڑا ــــــ سرخ و سفید رنگ کی تابانی جو کبھی بے شمار دلوں کے چراغ روشن کرتی تھی اب بھی کئی ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی لَو کو سہارا دیے رہتی ہے۔ حضرت

رئیس بغیر شیروانی پہنے اور بغیر چھڑی ہاتھ میں لیے گھر سے باہر نہیں نکلتے یہ دونوں چیزیں ان کے لباس کا جزو لاینفک ہیں۔ شام پانچ بجے کے بعد وہ کبھی اپنی مخصوص کرسی پر نہیں ملیں گے جس پر بیٹھ کر وہ سارا دن نفسیاتی و جنسیاتی گرہیں کھولنے کے ساتھ ساتھ شعر وسخن کی گرہیں بھی باندھتے رہتے ہیں۔ اب یہ ان کی چہل قدمی کا وقت ہے۔ آپ حقیقتاً چہل قدمی فرماتے ہیں یعنی بیس قدم جانا اور بیس قدم آنا۔ سید محمد تقی صاحب کے صحن سے ملحق کھلی پختہ جگہ پر آپ اس تیزی سے چہل قدمی کرتے ہیں کہ اگر جائے مذکور تین اطراف سے گھری ہوئی نہ ہو تو وہ یقیناً باہر نکل جائیں۔ چہل قدمی کا تو خیر یہ بہانہ ہے ورنہ وہ اس وقت مطالعہ کرتے ہیں تقریباً نصف گھنٹے کی چہل قدمی کے درمیان ایک درمیانی ضخامت کی کتاب ضرور ختم ہو جاتی ہے۔ صبح کی یوگا آسن سے لے کر شام کی چہل قدمی تک حضرت رئیس کسی نہ کسی طور ضرور مصروف رہتے ہیں اور اس مصروفیت میں ذہنی مشقت کے ساتھ ساتھ جسمانی محنت بھی شامل ہے شاید حضرت رئیس کی اپنے روزانہ پروگرام سے دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ ماہ و سال کی گردشیں حضرت رئیس کی توانائیوں پر اثر انداز نہ ہو سکیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔ حضرت رئیس، اچھن میاں سے سید محمد مہدی پھر رئیس امروہوی اور اب بابا تو بن سکتے ہیں لیکن اوّل روز سے ان کی سرشت میں جو ہما ہمی اور ترنگ و دو کا جذبہ ہے وہ آج بھی توانا ہے، جوان و رعنا ہے۔

قارئینِ محترم، میں حضرت رئیس امروہوی کے خاکے میں اپنی بساط بھر رنگ بھرنے کی سعی کر رہا تھا۔ ان کا قلمی خاکہ سنوارنے اور خاکے کا رنگ نکھارنے کی خاطر اپنی سعی کوشش میں مصروف تھا کہ بابا نے دیکھا کہ اس تہی دست کے پاس نہ ڈھنگ کے رنگ ہیں اور نہ اس کے ہاتھوں میں قلم پکڑنے کی صلاحیت ہے۔ سو انہوں نے اپنے خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے اپنا ہی لہو پیش کیا ——— بابا کا لہو نہ صرف سرخ ہے بلکہ اس کی رنگت ابدی ہے کبھی نہ مٹنے والی ——— یہ ۲۲ ستمبر کی شام ہے۔ میں ساڑھے چار بجے ان کے دربار میں حاضر ہوتا ہوں، وہ مجھے حسبِ دستور چند کتابیں سے نوازتے ہیں۔ کئی سال قبل میں نے ان سے شکایت کی تھی کہ بابا میں کتابیں پڑھنا تو چاہتا ہوں اور اسی خاطر گھر میں ایک مختصر سی لائبریری بنانا چاہتا

ہوں لیکن کتابیں اس قدر گراں ہیں، کیا کروں؟ بابا نے کہا تم اپنی سی کوشش بھی کرتے رہو اور میں بھی تمہیں کتابیں دیتا رہوں گا، سو کوئی مہینہ ایسا نہ گزرا جب انھوں نے مجھے کتابیں نہ دی ہوں ——— میں نے ان سے پوچھا اپنی زندگی اور اپنے فن سے متعلق آپ نے دوسرا مضمون لکھنے کے لیے کہا تھا اس کا کیا ہوا؟ بولے ہاں لکھ رہا ہوں۔ چند اور باتیں ہوئیں اور میں چلا آیا۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد برادرم قمر رضی کا فون آیا، منظر تمہارے استاد انتقال کر گئے۔ میں نے پوچھا کیسے ——! ابھی تو ہنس رہے تھے مسکرا رہے تھے، مجھے کتابیں دے رہے تھے، کچھ مشوروں سے نواز رہے تھے پھر اچانک یہ کیسے ہوا، بولے یہ تو پتہ نہیں، ہاں کمرے میں خون پھیلا ہوا تھا جب انھیں ہسپتال لے گئے۔ میں بابا کے گھر پہنچتا ہوں ——— ایک کہرام مچا ہے، لوگ سسک رہے ہیں، آنکھوں سے آنسو رواں ہیں در و دیوار سے آہ و بکا کی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں چشم تصور سے اس خون کو دیکھتا ہوں جس خون کی سرخی سے بابا کی عظیم و بے مثال شخصیت کے خاکے میں رنگ بھرا جائے گا۔ بابا کا خاکہ۔ بابا کے خون سے ہی سنوارا جائے گا کہ اور دوسرا کوئی رنگ بابا کے خد و خال کو صحیح طور پر اجاگر کر ہی نہیں سکتا۔

حضرت رئیس امروہوی کی شہادت پر کسی نے کہا ایک عظیم دانشور انتقال کر گیا، کسی نے کہا ایک عظیم محب قوم اور محب وطن شہید ہو گیا، کسی نے کہا غریبوں، مسکینوں بیکسوں، بیواؤں، ناداروں اور مظلوموں کا مونس و غمخوار ظالموں کی بربریت کا نشانہ بن گیا۔ بابا کو جس قدر لوگوں نے جس جس روپ میں دیکھا تھا اسی کے مطابق انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت رئیس امروہوی کی ہمہ جہت شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان سب سے آگہی کسی ایک فرد کو ہو ہی نہیں سکتی۔

آپ کو اگر کبھی حضرت رئیس کی بیرونی بیٹھک کی محفلوں میں شرکت کا موقع ملا ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا ادھر حضرت اپنی کرسی پر براجمان حقے کی نے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں ادھر ان کے ملاقاتی ان کی شخصیت کی کرشمہ سازیوں پہ ——! میں نے گزشتہ دس سالوں پر محیط ان کے ساتھ اپنی سیکڑوں نشستوں میں کسی بھی فرد کو ان کے دربار سے خالی

ہاتھ جاتے نہیں دیکھا ۔ وہ کبھی بھی مقتدر نہیں رہے ۔ سارا بابا اقتدار سے ان کی علیک سلیک بھی تھی لیکن ان کی محفلوں میں بابا کا جی کبھی نہ لگا ، اپنے ملاقاتیوں کو نوازنے کے لیے ان کے پاس سیم و زر کے انبار تو کبھی نہیں رہے لیکن اپنی دعاؤں اور نیک تمناؤں پر تو بہرحال انھیں اختیار تھا لہٰذا ہر خورد و کلاں پر وہ ہمیشہ ان کی بارش کرتے رہے ۔ جب کبھی کوئی گمبھیر مسئلہ درپیش ہوتا اور کوئی صورت اس کے حل کی نظر نہ آتی تو وہ کہتے گھبراؤ مت اللہ ضرور مدد کرے گا ۔ جہاں تک میں آگاہ ہوں گرچہ بابا سختی سے صوم وصلوٰۃ کے پابند نہ تھے لیکن اللہ رب العزت کی ذات اقدس پر جو انھیں ایقان تھا اور اللہ کے بندوں کی دستگیری ، ان کی امداد اور دلجوئی کی جو تڑپ ان کے دل میں تھی وہ کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے ۔

اسی لیے کبھی میں سوچتا ہوں کہ ان مظلوموں کا ، بے کسوں کا ، بیواؤں کا ، یتیموں کا سفید پوش فاقہ کشوں کا ، دولہاؤں کے انتظار میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں ، نوکریوں کی تلاش میں سرگرداں لڑکوں کا ، غرضیکہ سماج کے ہر اس فرد کا جس کا اہل ثروت نے سماجی بندھنوں نے اور معاشرے کے کرتا دھرتاؤں نے استحصال کیا ہے ، اب کیا ہوگا ـــــــ !! ان تمام افراد کی دستگیری ۔ ان کی دلداری اور حتی المقدور ان کی امداد جس طرح بابا کیا کرتے تھے اس کا نہ صرف میں نے بارہا مشاہدہ کیا ہے بلکہ بابا کے کہنے پر اکثر لوگوں کو بابا کا ہاتھ بٹاتے اور لوگوں کا دکھ درد بانٹتے بھی دیکھا ہے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ان مفلوک الحال ، پریشان اور دل برداشتہ لوگوں کا کیا ہوگا ؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا ، میں لرزتے ہاتھوں سے قلم تھامے اللہ تعالیٰ سے بس یہی دعا کر رہا ہوں کہ مولائے کائنات بابا کے فنا کو دوام بخشے ، ان کی یادوں کو امر بنائے کہ ہمارے لیے ان کی یادوں کے سوا اب بچا ہی کیا ہے ۔ بابا کی عظیم شخصیت کی یادیں ، جو پرستاران رئیس کے لیے باعث تقویت بھی ہیں اور مشعل راہ بھی ۔

رہی بات بابا کے اس جہان فانی سے رحلت کی ، تو اس کے متعلق بابا نے پہلے ہی کہہ دیا تھا ۔

تم ہماری داستانِ زیست سے گھبرا گئے
موت آجائے گی قصہ مختصر ہو جائے گا
لیکن کیا یہ قصہ مختصر ہو سکے گا؟؟

○

حبیب جالب

جناب رئیس امروہوی کو میں نے پہلی بار دہلی میں سنا تھا۔ دہلی میں شعر و ادب کا بہت چرچا تھا اور مشاعرے اکثر ہوا کرتے تھے۔ سائل و بیخود بھی زندہ تھے۔ انھیں بھی میں نے سُنا ہے۔ سائل و بیخود نے غالب و داغ کو سنا تھا۔ میں دہلی میں واجبی سی شاعری کرنے لگا تھا، اب میں کیا ہوں، رئیس صاحب تو بہت ہی عظیم و باکمال شاعر تھے اور صحافی، ادیب اور بالا تر مفکر بھی تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کی طرح رئیس صاحب بھی اشعار کہنے میں بڑی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی موت سے دنیائے شعر و ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ مصحفی کے بعد انھوں نے امروہے کی عزت میں بہت زیادہ اضافہ کیا۔

ڈاکٹر انور سجاد

۴۵ یا ۵۰ برس تک مسلسل قطعات لکھنا بہت ہی کمال کی بات ہے۔ میں رئیس صاحب سے "جنگ" کے حوالے سے متعارف ہوں۔ مجھے ان کے قطعے بہت پسند ہیں، ان کے قطعوں کا انتخاب چھپنا چاہیے۔

فہمی الہ آبادی

رئیس امروہوی — ایک نابغۂ روزگار شخصیت

عہدِ رفتہ کی چند یادیں

بھائی رئیس امروہوی بھی جرمِ وفا کا شکار ہوگئے۔ کسی کرائے کے قاتل نے ملک سے وہ متاعِ حیات چھین لی جس کا اسے خود بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ رئیس بھائی تو ایسی درویش صفت شخصیت تھے جن سے کبھی کسی کو کوئی گلہ نہیں ہوا۔ کسی نے کبھی اس پیکرِ محبت و شرافت کی پیشانی پر بل تک نہ دیکھے وہ تو انسان کے روپ میں ایک فرشتہ تھے۔ ان کی شخصیت کے اتنے ہمہ جہت پہلو تھے کہ ان کی ادبی شخصیت پر کچھ لکھنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ کام ملک کے دانشور، ادیب، شاعر جن کی تعداد ہزاروں میں ہوگی انجام دے سکتے ہیں۔ میرا ان کا کم و بیش پچاس سال کا ساتھ تھا۔ ۱۹۳۹ء میں مرادآباد سے ماہنامہ "مسافر" کا اجرا ہوا جو کہ رئیس امروہوی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں میرے پاس ریحانہ جمال ہاشمی کے نام سے ایک خط آیا (رسالہ "مسافر" کی شعبۂ خواتین کی وہ انچارج ہوا کرتی تھیں یعنی ان کا نام شعبۂ ادارت میں شامل تھا) اس خط میں مجھ سے افسانے کی فرمائش کی گئی تھی۔ اس طرح میرے افسانے "مسافر" میں شائع ہونے لگے۔ واضح رہے کہ میرے نام رئیس بھائی کا براہ راست خط نہیں آتا تھا۔ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور میں مستقل طور پر "مسافر" میں لکھنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد ریحانہ جمال ہاشمی کی طرف سے ایک خط موصول ہوا کہ رسالہ "مسافر" کی فروخت کا انتظام ہندوستان کے تمام ریلوے بک

استعمال پر کرادوں۔ اس زمانے میں A.H. WHEELER کا صدر دفتر الہ آباد میں ہوا کرتا تھا لہٰذا میں نے ان سے مل کر اس کا انتظام کر دیا اور اس طرح "مسافر" کی ماہانہ اشاعت ہزاروں میں بڑھ گئی کیونکہ ہندوستان کے ہر ریلوے اسٹیشن پر وہیلر کی ایجنسی تھی۔

ماہنامہ "مسافر" اس زمانے میں بہت مقبول ہو چکا تھا اور اس کی مقبولیت کا وہی عالم تھا جو کہ کبھی اختر شیرانی کی ادارت میں شائع ہونے والے "رومان" کی تھی۔ رئیس امروہوی کی اس دور کی نظمیں اور افسانے اس قدر مقبول تھے کہ ایک سال کے اندر "مسافر" گھر گھر کی زینت بن گیا۔ رئیس کی نظمیں خصوصیت سے اسکول اور کالج کی لڑکیوں میں اس قدر مقبول تھیں کہ ان کی نقلیں "مسافر" سے اتار کر رکھی جاتی تھیں۔ ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک میری خط و کتابت کا سلسلہ ریحانہ جمال ہاشمی سے قائم رہا۔ اسی سال یعنی ۱۹۴۲ء میں مجھے مراد آباد آنے کی دعوت دی گئی۔ ہاں یہ بات تو رہ گئی اس تمام عرصے میں جمال ہاشمی صاحبہ نے اپنے کو بھائی رئیس کی بہن ظاہر کیا اور تاکید کی کہ اس خط و کتابت کا علم رئیس بھائی کو نہ ہو کیوں کہ رسمی خط و کتابت نے ایک روحانی شکل اختیار کر لی تھی۔ جوانی کا دور بھی کیسا ہنگامہ خیز اور عقل و خرد سے بیگانہ کر دینے والا ہوتا ہے۔ میں نے "مسافر" کی اشاعت کے فروغ کے لیے اپنے حلقۂ احباب میں لاتعداد خریدار بنائے۔ غالباً اگست یا ستمبر ۱۹۴۲ء میں مراد آباد پہنچا۔ گاڑی رات کے غالباً دو بجے پہنچی اور میں اسٹیشن سے سیدھا مسافر خانے پہنچ گیا۔ میں بغیر کسی اطلاع کے پہنچا تھا اور اپنے ہمراہ اپنی بھتیجی سیدہ جس کی عمر اس وقت سات آٹھ سال تھی، لیتا گیا تھا کیوں کہ مجھے خط میں تاکید کی گئی تھی کہ میں کسی لڑکی کو ہمراہ لاؤں جس کے ذریعے میرا رابطہ ریحانہ جمال ہاشمی سے قائم ہو سکے جو کہ مسافر خانے میں رئیس بھائی کے ساتھ مقیم ہیں۔ مسافر خانے میں مجھے چارپائی دے دی گئی اور میں وہیں بستر لگا کر سو گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ رئیس صاحب اس وقت سو رہے ہیں لہٰذا ملاقات سویرے ہو گی سا گلی صبح جب میں بیدار ہوا تو معلوم ہوا میرے قریب ہی رئیس بھائی بھی سو رہے تھے۔ بستر پر چنبیلی اور گلاب کے پھول بکھرے

ہوئے تھے اور ایک نہایت حسین اور خوبرو شخص محوِ خواب تھا۔ میں نے رئیس بھائی کو اس سے قبل دیکھا نہیں تھا بس غائبانہ سا تصور تھا جو ان کی نظموں اور افسانوں سے ذہن میں قائم ہو گیا تھا اور وہ بالکل وہی تھا جیسا میں نے آنکھوں سے دیکھا۔ اس سے قبل ماہنامہ "رومان" جو کہ لاہور سے شائع ہوتا تھا اس کے مدیرِ اعلیٰ اور اس دور یعنی ۱۹۳۵ء اور اس کے بعد کے شاعرِ رومان اختر شیرانی کے متعلق ان کی شاعری کے حوالے سے قائم ہو گیا تھا۔ میں اس وقت تک کبھی اختر شیرانی سے نہیں ملا تھا مگر ذہن میں ان کی شخصیت کا جو تصور تھا وہ بہت حسین تھا۔ ان سے پہلی ملاقات اور آخری ملاقات کا تذکرہ آگے آئے گا۔

رئیس بھائی جب بیدار ہوئے اور انھیں معلوم ہوا کہ میں ان سے ملنے آیا ہوں تو ان کی خوشی اور مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی۔ سیدہ کو ایک کاتب صاحب جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا اور جو اس وقت بھی اپنے نام کے ساتھ پاکستانی لکھتے تھے کے گھر بھیج دیا گیا۔ رئیس بھائی میرے ہمراہ نیچے اتر آئے اور "مسافر" کے دفتر میں محفل جم گئی۔ عادل ادیب مراد آبادی، شکیل عادل زادہ کے والد بھی آگئے۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دن میں جناب کوثر چاندپوری، ساحر مراد آبادی، ساتبا ہاشمی اور بہت سے دیگر شعرا اور احباب آتے رہے اور ہر ایک سے میرا تعارف کرایا گیا۔ دوسری طرف میں عجیب کش مکش میں مبتلا تھا۔ ریحانہ جمال ہاشمی کا کہیں کوئی تذکرہ نہ تھا۔ سیدہ نے یہی بتایا کہ وہ مجھے جس مکان میں رکھا گیا ہے وہاں تو صرف ایک عورت ہیں جو کہ شاید پاکستانی کاتب صاحب کی بیوی تھیں۔ سارا دن انھیں ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ شام کے وقت ایک مختصر سی نشست محترمہ ذکیہ سلطانہ ذکی مراد آبادی کے مکان پر منعقد ہوئی جو کہ غالباً بعد میں حضرت ساغر نظامی کی بیگم ہو گئی تھیں۔ رات دس بجے کے بعد ہم لوگ واپس آئے اور مسافر خانے کی کھلی چھت پر میرا اور رئیس بھائی کا بستر لگا دیا گیا۔ برسات کی اندھیری رات تھی اور کچھ بارش کے بھی آثار تھے۔ ہم لوگ الگ الگ بستر پر باتیں کر رہے تھے کہ یکایک رئیس بھائی نے کہا۔ بھائی فہمی مجھے معلوم ہوا ہے کہ

تمہارے اور ریحانہ جمال ہاشمی کے درمیان عرصے سے خط و کتابت ہے۔ دراصل میں نے تمہارے کچھ خطوط اس کی میز کی دراز میں دیکھے تھے۔ وہ تمہیں کس عنوان سے خط لکھتی رہی ہے اس کا علم نہیں ہے مگر میں ان معاملات میں بہت آزاد خیال ہوں اگر تم لوگ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو تو یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔ رئیس بھائی تو بڑے اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر یہ باتیں کر رہے تھے اور اپنی یہ حالت گویا کوئی وجود ہی باقی نہیں ہے۔ صرف ندامت اور احساس شرمندگی سے میرے سارے بدن میں ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ بس دل یہی چاہ رہا تھا کہ یا تو مر جاؤں یا کوئی جن مجھے معہ چارپائی یہاں سے کہیں اٹھا کرلے جائے تاکہ میں رئیس بھائی سے نظریں نہ ملا سکوں۔ ان کی گفتگو کا انداز انتہائی دھیما، لہجہ بہت پرسکون اور شفقت آمیز تھا مگر میں تو گویا چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ سوائے خاموشی میں ایک لفظ نہ بول سکا۔ جب کافی دیر تک میری طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے بھائی تمہی ایسی بھی کیا خاموشی۔ تم سے کوئی جرم تو سرزد نہیں ہوا ہے اور پھر میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔ میں نے مناسب خیال کیا کہ تم سے براہ راست اس سلسلے میں بات کرلوں۔ جب انھوں نے خط کے مندرجات بھی بتا دیے تو سوائے اعتراف کے کوئی چارہ کار نہ رہا۔ انھوں نے کہا اب تم آرام سے سو جاؤ اس سلسلے میں باقی باتیں کل ہوں گی۔ ان حالات میں نیند کس شخص کو آسکتی تھی۔ بہت دیر تک یہی سوچتا رہا کہ سویرے رئیس بھائی سے کس طرح آنکھیں چار کرسکوں گا اس وقت تو اندھیری رات ہے کسی بات کو بغیر آنکھ ملائے سننے اور آنکھیں چار کرکے دیکھتے ہوئے سننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بہرحال اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا ــــ ہر چہ بادا باد ــــ کبھی کبھی احساس ندامت بھی حواس معطل کردیتا ہے۔ لہٰذا میں سو گیا، سویرے میرے اٹھنے سے پہلے ہی رئیس بھائی نیچے "مسافر" کے دفتر چلے گئے تھے اور وہاں عادل ادیب مرادآبادی کے ساتھ حقے کا دور چل رہا تھا۔ میں خاموشی سے آکر بیٹھ گیا ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہی دن کی مصروفیات شروع ہو گئیں۔ میں نے دیکھا کہ کئی بار رئیس بھائی اور عادل ادیب چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ شام کے وقت مجھے

رئیس۔ فن و شخصیت

رئیس بھائی ایک فوٹوگرافر کے یہاں لے کر گئے جہاں ہم دونوں کی تصویر اتاری گئی جو کہ بقول رئیس بھائی ان کی جوانی کی واحد تصویر ہے۔ میں نے یہاں اسے انلارج کر کے ایک کاپی انھیں بھی دی ہے جو کہ ان کے کمرے میں لگی ہوئی ہے۔ ایک بار جب رئیس بھائی ٹاور کے ایک فلیٹ میں مقیم تھے اور روزنامہ شیراز نکلتے تھے اس تصویر کا ایک بلاک ان کی فرمائش پر بنا کر دیا تھا جو کہ دفتر سے کہیں گم ہو گیا۔ غالباً تین چار سال قبل جس وقت اس تصویر کو دوبارہ انلارج کیا اس کے بعد دوبارہ بلاک بنوایا جو کہ محفوظ ہے۔ درمیان میں اس تصویر کا تذکرہ یوں آگیا کہ اپنی شہادت سے قبل ۲۰ ستمبر کو ان کا فون میرے دفتر کے پتے پر آیا حالانکہ ان چھ سالوں میں جب سے میں ہوٹل مٹروے میں ملازم ہوں۔ انھوں نے کبھی دفتر کے پتے پر فون نہیں کیا تھا۔ میں گزشتہ چار پانچ ماہ سے ان سے نہیں مل سکا تھا۔ کہنے لگے، کہاں غائب ہو گئے ہو، آنا بھی ترک کر دیا۔ میں نے بہت معذرت کی اور وعدہ کیا کل ضرور حاضر ہوں گا۔ کہنے لگے نہیں! اب جمعہ کے دن شام کے وقت آنا پھر تفصیل سے بات کروں گا اور ہاں اس جوانی والی تصویر کا بلاک ضرور لیتے آنا۔ میں نے جمعہ کے روز آنے کا وعدہ کر لیا۔ مجھے کیا معلوم تھا، جمعہ کے دن میں ان کا آخری دیدار کرنے جاؤں گا۔ اب ساری زندگی اس کا ملال رہے گا بلکہ دل میں ایک مستقل چبھن رہے گی کہ میں جمعہ کے روز ان سے زندگی میں نہ مل سکا۔ ابھی چند روز قبل میں رئیس بھائی کے اس دفتر میں گیا جہاں وہ ایک معصوم امن کی فاختہ کی طرح محبت آشتی اور بھائی چارے کا پیغام اپنی خداداد علمی، ادبی، صحافتی صلاحیتوں کے ساتھ نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیا کو پہنچایا کرتے تھے۔ ان کی کرسی کے عقب میں دیوار پر اس سفاک قاتل کی چلائی ہوئی گولی کا نشان موجود ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ گولی دیوار پر نہیں میرے دل پر لگی ہے اور میں بمشکل اپنے آنسو ضبط کر سکا۔ یہ مضمون کئی دن سے لکھ رہا ہوں مگر شدتِ جذبات سے سلسلہ منقطع کرنا پڑتا ہے۔ میرے ساتھ ان کی بہت سی حسین یادیں وابستہ ہیں اور میں کوشش کروں گا کہ انھیں ضبط تحریر میں لا سکوں۔

۱۹۴۲ء میں میرا قیام تین چار یوم مراد آباد میں رہا۔ جس روز ہم نے ایک ساتھ تصویر اتروائی تھی اسی رات جب ہم لوگ مسافر خانے کی چھت پر لیٹے باتیں کر رہے تھے تو رئیس بھائی نے انتہائی معصومیت کے ساتھ اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا کہ یہ سارا ریحانہ جمال ہاشمی سے خط و کتابت کا سلسلہ صرف ایک مذاق تھا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نام ہی فرضی ہے اور یہ سارے خطوط رئیس بھائی خود ہی لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے ہنستے ہوئے مجھ سے معذرت کی اور کہنے لگے دو روز سے ہم لوگ آپس میں یعنی کوکب مراد آبادی اور عادل ادیب مراد آبادی اسی عنوان سے مشورہ کرتے رہے کہ اب کیا کیا جائے، مذاق کی حد ہو چکی ہے بہتر ہے تمہیں حقیقتِ حال بتا ہی دی جائے اس ساری داستان کا جو کہ ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک خط و کتابت پر محیط تھی، دلچسپ پہلو یہ ہے کہ میرے پاس رئیس بھائی کا کبھی کوئی خط نہیں آیا تھا البتہ ان کا خط افسانے وغیرہ کی فرمائش کے سلسلے میں فہمیدہ شمیم آرا کے نام آیا کرتا تھا جن سے اس وقت میری شادی نہیں ہوئی تھی بلکہ افسانہ نگاری کے سلسلے میں خط و کتابت تھی۔ میں نے ایک بار ریحانہ جمال ہاشمی کے چند خطوط جو کہ عام نوعیت کے تھے فہمیدہ کو روانہ کیے اور انھوں نے مجھے لکھ کر مطلع کیا کہ خطوط تو رئیس امروہوی صاحب کے لکھے ہوئے ہیں اس کے ساتھ ہی انھوں نے رئیس بھائی کے چند خطوط بھی مجھے روانہ کیے مگر میں پھر بھی فریب میں مبتلا رہا کیوں کہ ذہن اس چیز کو قبول نہیں کرتا تھا کہ میرے ساتھ ایسا مذاق بھی کیا جا سکتا ہے پھر دونوں طرف کے خطوط میں واضح فرق بھی تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ "تو نے کھایا ہے مگر رنگین فریب۔ اے پرستارِ جمال" یہ اس زمانے میں میرے ایک افسانے کا عنوان تھا، جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا۔ فہمیدہ شمیم کا خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ اس رات رئیس بھائی نے اس ڈرامے کا ڈراپ سین کر دیا اور بات ختم ہو گئی۔

میں اس کے بعد دو روز مزید مراد آباد میں رہا اور واپس الٰہ آباد چلا گیا۔ اس کے بعد رئیس بھائی سے میری خط و کتابت کا آغاز ہو گیا۔ میرے خطوط ریحانہ جمال ہاشمی کے نام اور ان کے خطوط میرے نام سب ہندوستان میں رہ گئے۔ میں اور رئیس بھائی اس عالم میں

وہاں سے آئے کہ انھیں لانا ممکن نہ ہو سکا۔ رئیس بھائی کو اس کا ہمیشہ ملال رہا کہ اگر وہ خطوط محفوظ ہوتے تو انھیں ضرور شائع کرایا جاتا۔

اس داستان کو ان دو رباعیوں پر ختم کرتا ہوں جو کہ مسافر جولائی و اگست ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھیں۔

تسکین

از ریحانہ جمال ہاشمی

میں کہہ چکی ہوں کہ تم سے نہ منھ چراؤں گی
تمہاری بزم تصوّر کو جگمگاؤں گی
مجھے نہ روک سکے گی سماج کی قوت
بہت قریب ہے ایفائے عہد کی ساعت
تڑپ سے اپنی مجھے تم نہ بے قرار کرو
ابھی خدا کے لیے اور انتظار کرو

جولائی ۱۹۴۰ء

بیقراری

از فہمی الہ آبادی

یقین ہے کہ تم مجھ سے نہ منھ چراؤ گی
مرے خیال کی دنیا کو جگمگاؤ گی
مگر سماج سے ممکن نہیں ہے چھٹکارا
کسی طرح سے یہ وعدہ نہ ہو سکے گا وفا
اسی وجہ سے بہت بے قرار رہتا ہوں
تمہاری یاد میں بس اشک بار رہتا ہوں

اگست ۱۹۴۰ء

۱۹۴۲ء کے بعد دوسری بار غالباً ۱۹۴۳ء میں چند روز کے لیے مراد آباد گیا۔ اس زمانے میں رئیس بھائی اخبار "جدت" مراد آباد جو کہ غالباً ہفتہ وار یا سہ روزہ شائع ہوتا تھا منسلک تھے جس کے مالک حافظ محمد تقی ہوا کرتے تھے۔ میرا قیام رئیس بھائی کے یہاں تقریباً ایک ہفتہ رہا۔ اس دوران میرے روپے خرچ ہو چکے تھے اور واپسی کے لیے کرایہ بھی نہیں رہا تھا۔ رئیس بھائی نے ایک اسکیم تیار کی اور مجھ سے کہا کہ تمہیں یہاں کوئی جانتا نہیں ہے لہٰذا تم میری سیاہ شیروانی اور سیاہ ٹوپی پہن کر جمعہ کے روز جامع مسجد جاؤ اور سیدھے پیش امام سے جا کر ملو اور کہو کہ میں شیعہ عقیدے سے توبہ کرتا ہوں اور سنی مذہب اختیار کرتا ہوں مگر میرے خاندان والے مجھے عاق کر دیں گے۔ میں امروہہ کا رہنے والا ہوں اور رئیس امروہوی کے خاندان سے میرا تعلق ہے۔ یہ مذہبی ملا بڑے جذباتی ہوتے ہیں بلکہ ساری قوم ان معاملات میں جذباتی ہو جاتی ہے، اگر تم اپنے گھر سے نکال دیے جانے کی داستان بتانے میں کامیاب ہو گئے تو کافی چندہ جمع ہو جائے گا اور یہی ہوا۔ دو چار نعرۂ تکبیر لگے گویا شیعہ مذہب سے سنی مذہب (اگر دونوں مذہب الگ ہیں) اختیار کرنا بہت بڑا جہاد ہے۔ بہرکیف پیش امام صاحب کی اپیل پر دو دو آنے اور چار چار آنے جمع ہوئے اور یہ رقم تقریباً ساٹھ روپے سے اوپر ہو گئی۔ میں نے پیسے رومال میں جمع کیے مسجد سے باہر آ گیا اور بقول نمازیوں کے میں کافر آیا تھا اور اب مسلمان ہو کر واپس جا رہا ہوں۔ رئیس بھائی مسجد سے باہر ایک موڑ پر موجود تھے، ہم لوگ جلدی سے "جدت" کے دفتر پہنچ گئے اور کافی دیر تک اس شرارت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس زمانے میں اتنے روپے بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ میں مزید دو چار یوم وہاں رہا اور واپس آ گیا۔ رقم کا ہم نے آپس میں بٹوارہ کر لیا تھا۔ آج یہ سب باتیں یاد آتی ہیں تو رئیس بھائی کے ساتھ گزارے ہوئے دن بڑی اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ انھیں دنوں میں ایک ایسا واقعہ بھی ہوا جس کا میں چشم دید گواہ ہوں اور شاید لوگ مشکل سے یقین کریں کہ رئیس بھائی دوسروں کے لیے بھی مرثیہ، نظم اور غزلیں لکھ دیا کرتے تھے۔ ایک روز ان کے نام پورے ایک سو روپے کا منی آرڈر آیا اس کے ساتھ ایک خط

بھی آیا جس میں مرثیہ فلسفۂ غم جلد سے جلد مکمل کر کے روانہ کرنے کی فرمائش تھی۔ یہ روپے اور خط ایک بہت بڑے مرثیہ گو کی طرف سے آئے تھے جن کا اس زمانے میں تو نہیں بلکہ بعد میں اور قیام پاکستان کے بعد بہت بڑا نام شمار کیا جاتا ہے۔ میں نے رئیس بھائی کی اس حرکت پر شدید احتجاج کیا تھا کہ اس طرح تو دوسرے صاحب دیوان بن جائیں گے مگر رئیس بھائی نے جواب دیا کہ بھائی میں اپنے لیے اس سے بڑھ کر کہہ سکتا ہوں۔ کافی عرصے کے بعد خود رئیس بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ میں نے جو مرثیہ فلسفۂ غم لکھ کر دیا تھا اس کی بڑی شہرت ہوئی ہے اور لوگوں نے مسدس حالی سے بڑھ کر اس کی ادبی حیثیت کو تسلیم کیا ہے مگر میں اس سے بھی زیادہ شاندار چیز اپنے لیے لکھ رہا ہوں۔ بہر حال کچھ بھی ہو یہ حقیقت اپنی جگہ رہی کہ رئیس بھائی کی ذہن و فکر کی کاوش سے وہ صاحب فن مرثیہ گوئی میں ایک ایسا مقام اپنے لیے بنا گئے جو آج بھی موجود ہے اور صرف ایک سو روپے میں انھوں نے یہ مقام حاصل کر لیا۔ بات صرف روپے کی نہ تھی بلکہ انھوں نے رئیس بھائی کی طرف سے تاخیر کی وجہ سے یہ حرکت کی تھی ورنہ ممکن تھا کہ وہ پیکر مروت و شرافت انھیں یونہی لکھ کر دے دیتا۔ بہر کیف اس سلسلے میں میرا ان سے ہمیشہ اختلاف رہا اور وہ صرف ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے ان کی ایسے مواقع پر مسکراہٹ بڑی دلفریب اور معصوم ہوا کرتی تھی۔ الٰہ آباد واپس آنے کے بعد ہماری خط و کتابت برابر جاری رہی اور میرے افسانے پابندی سے "مسافر" میں شائع ہوتے رہے۔ اس زمانے کی نظمیں اور افسانے رئیس بھائی کے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے پاس "مسافر" کی چند جلدیں آج بھی محفوظ ہیں جو کہ میری بیگم ساتھ لیتی آئی تھیں ورنہ میرا سارا ادبی اثاثہ تو ہندوستان ہی میں رہ گیا۔

۱۹۴۷ء میں ہم لوگوں کا پروگرام لاہور جانے کا بنا۔ میں الٰہ آباد سے روانہ ہوا اور رئیس بھائی اور مرحوم قائم رضا نسیم امروہوی مرادآباد سے اس ٹرین میں سوار ہوئے اور ہم تینوں لاہور میں ڈاکٹر پرتھی سنگھ ایڈیٹر ماہنامہ "مست قلندر" کے یہاں مقیم ہوئے یہ دعوت انھیں کی طرف سے آئی تھی اور وہاں پنچولی آرٹ پکچر والوں سے بھی کہانی، منظرنامہ اور گانے لکھنے کی بات چل رہی تھی۔ پنچولی پکچر کے سیٹھ خان بہادر دل سکھ پنچولی تھے۔

ان سے معاملات طے نہ ہو سکے کیوں کہ وہ اسکرین پر اپنا نام دینا چاہتے تھے اور ہمیں صرف رقم دینے پر تیار تھے گویا کہانی، گانے اور منظر نامہ سب ان کے نام سے اسکرین پر آتا اور ہم لوگ "ادبی مزدور" کی حیثیت سے کام کرتے۔ یہ شرائط ہمیں منظور نہ تھیں لہٰذا کچھ دنوں کے قیام کے بعد جناب نسیم امروہوی اور رئیس بھائی واپس چلے گئے اور میں لاہور میں ٹھہر گیا۔ اس زمانے میں راز ہاشمی لاہور سے "اسٹوڈیو" نکالتے تھے غالباً وہ صرف اس کے ایڈیٹر تھے۔ ان کا قیام نسبت روڈ کے کسی ہوٹل میں تھا جس کا نام اب یاد نہیں رہا۔ میں بھی انھیں کے ساتھ ٹھہر گیا اور "مست قلندر" اور یزدانی جالندھری کے ہفت روزہ میں پارٹ ٹائم کام کرنے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد جناب حکیم یوسف حسن صاحب کے مشہور زمانہ رسالہ "نیرنگِ خیال" میں بھی مجھے پارٹ ٹائم کام مل گیا اور اس طرح میں لاہور میں رہ گیا۔ ایک روز میں "نیرنگِ خیال" کے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ قریب ہی حکیم صاحب چارپائی پر لیٹے حقہ پی رہے تھے کہ یکایک سیڑھیوں سے چڑھ کر ایک صاحب دفتر میں آئے اور سیدھے حکیم صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے سرسری طور پر انھیں دیکھا۔ میلی سی شیروانی پہنے تھے اور ان کی جیب میں ایک بوتل ٹھنسی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب سے آتے ہی انھوں نے صرف آٹھ آنے طلب کیے اور انھوں نے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے بٹوے سے نکال کر فوراً دے دیے۔ وہ صاحب شکریہ ادا کرتے ہوئے فوراً ہی واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس بار میں نے انھیں اچھی طرح دیکھا کہ یہ کون شخص ہے جس نے صرف آٹھ آنے طلب کیے، حالانکہ اس زمانے میں اتنی رقم کی بھی اہمیت تھی۔ ان کی عمر کوئی چالیس پینتالیس سال کی رہی ہوگی، چہرے پر موٹے موٹے دھبے تھے جیسے کرنٹ اچھل جانے پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ رنگ گورا تھا مگر لباس سے ایک مفلوک الحال شخص نظر آتے تھے کیوں کہ سفید شیروانی کافی میلی تھی اور اس کی جیب میں ایک بوتل رکھی ہوئی تھی جو کہ غالباً شراب کی معلوم ہوتی تھی۔ ذرا ہی دیر میں وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ حکیم صاحب نے مجھ سے کہا "فہمی میاں تمہیں معلوم ہے یہ کون صاحب تھے۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو انھوں نے فرمایا۔ یہ حضرت ساغر نظامی

تھے۔ میرے ذہن پر ایسا شدید جھٹکا لگا کہ میں لرز کر رہ گیا۔ تقریباً دس سال سے میں جس شخصیت کی دل سے پرستش کر رہا تھا جو میرے ذہن وفکر میں ایک حسین وجمیل رومانی شاعر کی حیثیت سے چھایا ہوا تھا، مت پوچھیے کہ اسے ایسے حال میں اور اس اخلاق گراوٹ میں دیکھ کر میرے سارے رنگین خیالات منتشر ہو گئے اور آج تک اس احساس کی شدت کو میرا ذہن فراموش نہیں کر سکا۔ اس کے بعد حکیم یوسف حسن صاحب نے ان کے متعلق بہت ساری باتیں بتائیں جن کا اس موقع پر تذکرہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ میں لاہور میں تقریباً تین چار ماہ مزید قیام کے بعد الہ آباد واپس چلا گیا کیوں کہ میری والدہ شدید علیل تھیں اور اس کے بعد میری واپسی نہیں ہوئی اور ۱۹۴۵ء میں محکمہ سنٹرل ایکسائز میں میری تقرری ہوگئی۔ اس زمانے میں الہ آباد سے ماہنامہ "انیس"۔ ہفت روزہ "منفعت" اور اس کے بعد روزنامہ "شفق" سے بھی میں وابستہ رہا۔ رئیس بھائی سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد رئیس بھائی مرادآباد سے دہلی منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں پاکستان کی تحریک بہت زور شور سے جاری تھی اور رئیس بھائی کی سیاسی نظموں اور ترانوں سے اکثر اخبار اور رسالے مزین ہوا کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں الہ آباد سے میں بڑی بے سروسامانی کی حالت میں کراچی آیا یہ اکتوبر ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ میں کینٹ اسٹیشن کے قریب مہاجر کیمپ میں پڑا ہوا تھا اور غالباً دو روز کے بعد اخبار جنگ کے ایک رپورٹر وہاں تشریف لائے اور آنے والے مہاجروں کے کوائف جمع کر رہے تھے۔ میری بھی ان سے ملاقات ہوگئی اور دوسرے روز اخبار میں میرے متعلق چھوٹی سی خبر شائع ہوئی جسے پڑھ کر رئیس بھائی اور میرے ایک دوست مہاجر کیمپ آگئے۔ رئیس بھائی ان دنوں کھارادر کے ایک فلیٹ میں مقیم تھے اور میرے دوست جو کہ سرکاری ملازم تھے جیکب لائن میں ایک کوارٹر میں مقیم تھے۔ چونکہ میرے دوست مرحوم معشوق احمد صدیقی صرف اپنی بیوی کے ہمراہ اس سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے اور ان کے پاس جگہ بھی کافی تھی اور میرا قیام عارضی طور پر کراچی میں تھا اور مجھے لاہور جا کر ڈیوٹی جوائن کرنی تھی لہٰذا میں ان کے ہمراہ چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد میں لاہور چلا گیا اور اس کے چند

ماہ کے بعد میرا ۱۹۴۸ء میں کراچی تبادلہ ہوگیا اور میں ماری پور رسالٹ ورکس میں اپنی ڈیوٹی پر آگیا۔ رئیس بھائی اکثر دو ایک یوم کے لیے ماری پور آجایا کرتے تھے ان کے ہمراہ مقبول جلیس بھی ہوا کرتے تھے۔ ماری پور بہت پرسکون جگہ تھی اور بھائی رئیس کراچی کے ہنگاموں سے گھبرا کر وہاں بہت سکون سے ٹھہرتے تھے۔ رفتہ رفتہ میری بیگم اور بیگم رئیس امروہوی سے گھریلو تعلقات ہوگئے اور ہمارا آنا جانا ان کے گھر ہوگیا جس کا سلسلہ ان کی ناگہانی موت تک جاری رہا۔ اس وقت مجھے مراد آباد کے دوران قیام کا واقعہ بھی یاد آگیا۔ اکثر رات ہم لوگ یعنی رئیس بھائی، کوکب مراد آبادی، عادل ادیب مراد آبادی، راز ہاشمی وغیرہ ایک جگہ رئیس بھائی کے گھر میں باتیں کیا کرتے اور رئیس بھائی میز پر رکھے ہوئے متعدد رائٹنگ پیڈ پر نظم، غزل، افسانہ، ڈرامہ، مرثیہ بیک وقت لکھا کرتے اور دو تین گھنٹے کے بعد جب مجلس برخاست ہوتی تو ہر پیڈ پر الگ نظم، غزل، ڈرامہ، مرثیہ اور افسانہ مکمل ہوتا۔ اس شخص کی قابلیت اور زود گوئی اور صنعت ادب پر اتنا عبور حاصل تھا کہ انسانی ذہن اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ اس زمانے میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ جناب تنزیل الرحمان صاحب موجودہ جسٹس بھی وہاں آیا کرتے تھے اور ان کے بڑے مداحوں میں شمار ہوتے تھے اور یقیناً اب بھی ہوں گے۔ آج رئیس بھائی ہم میں نہیں ہیں۔ کسی ظالم کرائے کے قاتل نے ان کی شمعِ حیات گل کردی۔ اسے کیا پتہ کہ اس نے دنیا سے کس انمول شخص کو چھین لیا۔ لوگ جن کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں اکثر کہا کرتے ہیں کہ مرنے والے بڑے ظالم ہوتے ہیں اور دوسروں کو جی جی کر مرتے اور تڑپ تڑپ کر زندہ رہنے کے لیے چھوڑ جاتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کہوں گا۔ ان کو ظالم ہونے کا کسی عنوان بھی الزام نہیں دیا جاسکتا۔ ظالم، جابر اور سنگدل تو وہ ہے جس نے ہم سے ایسی متاعِ حیات چھین لی۔ جس کے ماتم کے لیے لغت میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ ہم کن الفاظ میں اپنے محسوسات بیان کرسکتے ہیں۔ کم از کم میں تو رئیس بھائی کی کسی بھی بات کو زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھلا سکتا۔ پاکستان کے قیام کے بعد میں اکثر کراچی سے دور بھی چمن، کوئٹہ، کھوکھراپار وغیرہ ملازمت کے سلسلے میں مقیم رہا مگر رئیس بھائی سے کبھی رابطہ منقطع نہیں ہوا۔

جب بھی کراچی آتا ان سے ضرور ملتا اور ان میں وہی شفقت، محبت اور اپنائیت پاتا۔
۱۹۷۰ء میں میری پوسٹنگ صادق آباد میں تھی۔ وہاں میر زاہد حسین مشہور مسلم لیگی رہنما اور زمیندار اور انیس جیلانی محمد پور، صادق آباد بڑے مداحوں میں تھے۔ میر زاہد حسین صاحب مسلم لیگی تھے اور انیس جیلانی صاحب پیپلز پارٹی کے ہمنوا تھے اور رئیس بھائی کے دونوں سے قریبی تعلقات تھے۔ ایک بار میرے اصرار پر وہ صادق آباد آئے ان کے ہمراہ سراج الدین ظفر مرحوم تھے۔ تین چار یوم قیام رہا۔ ادبی محفلیں بھی منعقد ہوئیں۔ ایک روز رات میں میر زاہد حسین صاحب کے یہاں دعوت تھی جس میں مقامی ادب نواز ہستیاں اور زمیندار مدعو تھے۔ میر زاہد حسین صاحب نے دس پندرہ سرکردہ لوگوں سے ان کا تعارف کرایا اور ہر ایک کا نام بتاکر قطعہ کہنے کی فرمائش کی۔ وہاں موجود سارے لوگ حیران رہ گئے جب رئیس بھائی نے ہر ایک کے نام کی مناسبت سے ایک ایک قطعہ فی البدیہہ کہہ دیا۔ اس کے بعد سراج الدین ظفر صاحب سے بھی فرمائش ہوئی مگر انھوں نے کان پکڑ کر معذرت کرلی اور کہا حضرات میں تو اس طرح ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتا یہ تو صرف اللہ نے رئیس صاحب کو قدرت بخشی ہے کہ وہ ہر وقت، ہر حال میں شعر کہہ سکتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء کے بعد میں مستقلاً کراچی آگیا اور اس کے بعد پھر کبھی کراچی سے باہر میرا تبادلہ نہیں ہوا۔ یہاں بھی وہ دو بار میرے گھر آئے۔ اور صبح سے شام تک قیام کیا۔ اس زمانے کی ان کے ساتھ تصاویر اب زندگی کی یادگار بن گئی ہیں۔ میری نواسی غزالہ رحمان اس وقت ان کی گود میں بیٹھی ہے، اب تو ماشاء اللہ سولہ سال کی ہوگئی ہے۔ میں ان کی کن کن باتوں کو یاد کروں۔ رئیس بھائی تم جس ابتلا میں ہمیں مبتلا کر گئے ہو یقیناً تمھیں اس کا اندازہ ہوگا۔ کاش تم کبھی خواب ہی میں اس ظالم کا نام بتادیتے یا ان محرکات کا سبب بتاسکتے جس نے تمھیں ہم سے جدا کردیا۔ آج رئیسِ غزل، رئیسِ نظم، رئیسِ ادب، رئیسِ علم، رئیسِ فن، رئیسِ نفسیات، رئیسِ انسانیت ہم میں موجود نہیں ہے۔ اتنے اصنافِ سخن پر عبور رکھنے والا شخص اب کہاں پیدا ہوگا۔ ان کا ذہن تو ایک کمپیوٹر تھا جس میں قدرت نے سب کچھ FEED کردیا تھا اور علم و ادب کی ارفع و اعلیٰ تخلیقات پلک جھپکتے صفحۂ قرطاس

پر منتقل ہو جاتی تھیں۔ اب تو اگر نرگس لاکھوں سال تک بھی روئے تو ایسا دیدہ ور پیدا نہیں ہو سکتا۔

مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں۔

رئیس امروہوی کی ہستی بھی کیا ہستی ارفع تھی۔ کہ امروہہ امر ہو گیا اس دارِ فانی میں۔

رئیس بھائی کم از کم اتنا ہی کر دو کہ ہمیں تمہاری موت کا یقین آجائے۔ تم تو جنت میں حور و غلماں کے ساتھ محفلیں جمائے ہو گے اور ہم اس جہنم کدے میں تمہارے لیے اشک فشاں ہیں۔

○

امجد اسلام امجد

رئیس امروہوی اردو ادب کے ان معتبر ناموں میں سے تھے جنھوں نے بہت زیادہ لکھا اور پھر بھی ہمیشہ اچھا لکھا۔ اس اعتبار سے وہ نظیر اکبرآبادی، میرانیسؔ اور جوش ملیح آبادی کے قبیلے کے آدمی تھے۔ ذاتی سطح پر وہ اپنے چھوٹوں کے لیے ایک انتہائی شفیق سینئر تھے اور جب بھی ملتے ایسی محبت اور چاہت سے ملتے کہ جی خوش ہو جاتا۔ ان کی ایک غزل مجھے بہت ہی پسند ہے۔ اس غزل کے دو شعر ان کی فنی عظمت کے نمائندہ ہیں سہ

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم
ہم اپنی زندگی تو بسر کر چکے رئیسؔ
یہ کس کی زیست ہے جو بسر کر رہے ہیں ہم

ڈاکٹر عالیہ امام

اپنا لہو تلاش کروں

رابرٹ فراسٹ نے لکھا ہے کہ "میں اس شاعری کا قائل ہوں جو پہلے مسرت اور پھر بصیرت عطا کرے"۔ میر تقی میر نے اس کا سراغ یوں لگایا کہ:

اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر کسی کا نشانہ ہو

کعبے کی بڑائی اینڈتے ہوئے آہوانِ کعبے کی رہینِ منت نہیں ہے بلکہ اس کی بزرگی کے ضامن تو وہ ہیں جو شمع سے ماتم خانے روشن کرتے ہیں اور یونانی دیوتا کی طرح اپنے سینے کے ناسور چھپا کر دوسروں کے دکھوں میں پھول بن کھلاتے ہیں۔

رئیس صاحب حسن و محبت اور انقلاب کے نقیب تھے۔ وہ تمام زندگی تاریکی کے سامنے شعلہ اور درد کے لیے شبنم بنے رہے۔ ان کے یہاں محبت اور انقلاب میں بُعد نہیں تھا۔ اس لیے وہ نظریے کی صداقت کو فن کی تمام رعنائیوں کے ساتھ سنگیت کی سرحدوں تک پہنچاتے رہے اور ظلمت کدے میں سحر کا ورق کھولتے رہے۔

رئیس صاحب امن و محبت کو مجرد شے تسلیم نہیں کرتے تھے، بلکہ اسے سماجی انصاف کے نظام سے جڑا ہوا تصور کرتے تھے۔ اس لیے وہ حسن و محبت اور امن کی قوتوں کے ساتھ جڑ کر اپنی ناتوانی سے توانائی کی کلائی مروڑ دینا چاہتے تھے تاکہ نفرت و عصبیت کی دھوپ چلچلاتی دھوپ چاندنی میں بدل جائے۔

رئیس صاحب نے آئین کی دھجیاں بکھیریں۔ مریم کے بند قبا دریدہ کیے۔ ملک کی عصمت کا بیوپار کیا۔ ملک دشمن قوتوں سے جڑ کر اس کے سینے کو دو پارہ کیا۔۔۔۔۔۔ فرد جرم میں اس کا ذکر نہیں۔ ان کا جرم تو بس یہ تھا کہ جھلسے ہوئے ہونٹوں کے لیے آبشار بنے ہوئے تھے۔ تپتی ہوئی نگاہوں میں چاندنی گھول رہے تھے، لیکن نفرت کے سرکش نلقے، جہل کے بلبلاتے اونٹ اپنی مجموعی طاقت کے نشے میں محبت کے سامنے ٹاپیں مارنے لگتے ہیں۔ حسن کے مطرب کے سامنے جہل کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ رئیس صاحب قتل کر دیے گئے۔۔۔۔۔۔ دستانے پہنے ہوئے شہر میں لہو بہانے والے کا سراغ نہیں ملا۔۔۔۔۔۔ رئیس صاحب تو پیلو زرد اور جولیس فیوچک کے ساتھ کٹہرے میں کھڑے ہو گئے۔

کسی بھی شاعر کی عظمت یہی تو ہے کہ اس کی دانش اپنے عہد کے شعور میں چاندنی کی طرح گھل جائے، لیکن بصیرت سے دوسرے چراغ جل اٹھیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو فنکار کے قتل ہو جانے کے باوجود اس کے ماتھے پر فاتحانہ بکھر جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ ملک میں جو آج شرمیلی چاندنی نکلی ہے اس میں رئیس صاحب کی قندیل صفت فکر پھولوں سے پٹے ہوئے تخیل کا بھی حسن شامل ہے۔

رئیس صاحب ان عظیم فن کاروں میں شامل ہیں جو شاعری اور ادب کو محض حالات و واقعات کا عکاس نہیں بلکہ اسے تنقید نگار گردانتے ہیں۔ ان کا پورا کلام خواہ وہ غزل ہو یا نظم، رباعی ہو یا قطعات شعلگیٔ فکر اور پختگیٔ نظر سے مرتب ہیں۔ انھوں نے اندھیرے اور اجالے کو دکھایا نہیں بلکہ اس کی درستگی اور نادرستگی کا تجزیہ بھی کیا۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے عہد کے امام بھی تھے۔۔۔۔۔۔ اور مجتہد بھی۔۔۔۔۔۔ رئیس صاحب کا کلام امن، محبت اور حسن کی قوتوں کے ہاتھ میں ہتھیار رہے جس سے وہ تاریکی پر وار کرتی اور اجالا پھیلاتی رہیں گی ؎

ذہنِ ملّت پہ ہے صدیوں سے قیامت کا جمود
ذوقِ ایجاد عطا کر، روشِ نقل بھی دے

عشق بے عقل فقط جوشِ جنوں ہے یارب
عشق جس قوم کو بخشا ہے اُسے عقل بھی دے

یا

نہ کہہ قومی زباں اردو کو اے دوست
یہ کچھ گم راہ لوگوں کا بیاں ہے
مہذّب لوگ انگلش بولتے ہیں
یہ لالو کھیت والوں کی زباں ہے

کارِ نیک

تسلیم ہے کہ نیک کمائی نہ تھی مگر
کیوں کر رئیس داد نہ دوں کارِ نیک کی
مسجد تو سیٹھ جی نے بنا دی خلوص سے
یہ اور بات ہے کہ رقم تھی بلیک کی

بر سرِ کرسی

فرمانے لگے میرے سیاسی استاد
رکھ سطحِ جماعت پہ نہ اپنی بنیاد
جو فائزِ عہدہ ہے وہی قابلِ داد
جو برسرِ کرسی ہے وہی زندہ باد

عرشِ سیاست

ہم سے پوچھے نہ کوئی قصرِ حکومت کے رموز
اہلِ گردوں کا مزاج اہلِ زمیں کیا جانیں

خاکساروں کو کہاں عرشِ سیاست کی خبر
حال افلاک کا فٹ پاتھ نشیں کیا جانیں

خوشی سے مر جائیں

پس ماندوں کو سرکار وظیفہ دے گی
فن کار اگر فاقہ کشی سے مر جائیں
افلاس میں جینے سے ہے مرنا بہتر
فن کاروں سے کہہ دو کہ خوشی سے مر جائیں

جب تک دنیا میں امن، محبت اور پیار کی قوتیں زندہ ہیں۔ رئیس صاحب زمانے کو جھکا کر اپنا خراج وصول کرتے رہیں گے۔

○

منوّر سعید

یوں تو ادیبوں کی اور شاعروں کی برادری ایک نہایت حسین اور خوبصورت برادری ہے، لیکن اگر حسن و خوبصورتی کے ساتھ ساتھ سنگھار بھی شامل ہو جائے تو اس خوب صورتی اور حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور اس کی جاذبیت دوبالا ہو جاتی ہے۔
اس حوالے سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ رئیس صاحب ادب اور شاعروں کی اس حسین برادری کا سنگھار تھے، جس کے بغیر اس کا حسن اجڑا اجڑا دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

رئیس بھائی

آج ہم سب جس شخص کی یاد میں یہاں جمع ہوئے ہیں وہ اپنی دلآویز شخصیت ندرتِ فکر، عظمتِ فن، سادگی اور معصومیت کی وجہ سے ہمارے عہد کا انتہائی مقبول، معروف اور ممتاز انسان تھا ـــــ رئیس امروہوی ـــــ یہ نام ادب صحافت، معاشرتی اصلاح و فلاح، انسان دوستی اور وضع داری کے صحیفے کا معتبر نام ہے۔ مستند نام ہے۔ اس نام میں کتنے بہت نام سوچتے، بولتے، عمل پیرا ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہ نام گزشتہ اکتالیس برس کے حالات و واقعات کی تاریخ ہے۔ مستند، مفید اور مقبول خاص و عام سیاسی، معاشرتی، ادبی، ملکی، بین الاقوامی کوئی مسئلہ ہو، کوئی معاملہ ہو، رئیس امروہوی کے مرقعِ شعر میں اس کا رنگین عکس ضرور موجود ہوگا۔ اس بزرگ فن کار کا یہی شرف کیا کم ہے کہ وہ حالات و واقعات کی مرقع نگاری کرتے کرتے خود ایسا مرقع بن گیا ہے جس کی ہر تصویر اپنی جگہ بے مثال حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ رئیس امروہوی ہمارے عہد ہی کا نہیں، ہر عہد کا بڑا نام ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم نے اس بڑے نام کی کوئی قدر نہیں کی ؎

لکھ کر کسی کا نام زمیں پر مٹا دیا
ان کا تو کھیل، خاک میں ہم کو ملا دیا

مجھے بے اختیار استاد داغ کا مصرع یاد آتا ہے۔

رئیس، فن و شخصیت

نظر ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے

رئیس امروہوی انسان دوست تھے۔ ہر کسی سے دل سے ملتے تھے، شاید یہی دل سے ملنا انھیں لہولہان کر گیا۔

میں نے رئیس بھائی کو (کہ ہر شخص انھیں رئیس بھائی ہی کہتا تھا) پہلے پہل ۱۹۴۶ء میں دیکھا تھا۔ موہنی مورت، ہنستی صورت، مسکراتی آنکھیں، روشن پیشانی، گورا رنگ، لمبا قد، نفیس شیروانی، کراری آواز ـــــ جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی۔ دلی کے سارے اخبارات جنگ، انجام، الامان بڑے زور و شور سے پاکستان کے حق میں لکھ رہے تھے۔ رئیس بھائی اس عہد میں بھی صحافتی برادری میں ممتاز تھے۔ ان کی شاعری، قطعہ نگاری اور اخبار نویسی کا بڑا چرچا تھا۔ صحافتی قطعہ نگاری انھیں کے ذریعے سے مقبول ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے اخبارات میں قومی نظموں کی اشاعت کا رواج تھا۔ رئیس بھائی نے جنگ میں قطعات لکھنا شروع کیے تو دوسرے شاعروں کو بھی اس صنف کے امکانات کا اندازہ ہوا۔ رئیس بھائی کو اس زمانے میں بھی مابعد الطبیعیاتی موضوعات سے دلچسپی تھی۔ غالباً افسانے بھی لکھتے تھے لیکن بعد میں افسانہ نگاری ترک کر دی۔

پاکستان وجود میں آیا تو رئیس بھائی بھی کراچی آ گئے۔ یہاں بھی جنگ سے ان کی وابستگی برقرار رہی۔ اگرچہ انھوں نے شام کا ایک روزنامہ "شیراز" خود بھی جاری کیا تھا لیکن جنگ سے تعلق قائم رہا۔ ان دنوں جنگ کا دفتر میکلوڈ روڈ پر اخباری بلڈنگ میں تھا۔ شام کو یہیں رئیس بھائی کا اجلاس ہوتا۔ بے شمار شاعر اور ادیب جمع ہوتے۔ اچھی خاصی محفل ہو جاتی۔ یہ دور بڑی افراتفری اور پریشانی کا تھا۔ سر چھپانے کے ٹھکانے محدود، مل بیٹھنے کی جگہیں برائے نام، مالی وسائل پریشان کن لیکن ان ساری پریشانیوں کے باوجود دلوں میں ایک امنگ اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ تھا۔ رئیس بھائی کے یہاں شام کی محفل میں شکوہ کوئی نہ کرتا۔ بہتر مستقبل کا خواب سب دیکھتے۔ اکثر یہیں سے اٹھ کر ہم لوگ کسی شعری نشست یا مشاعرے میں چلے جاتے۔ اگرچہ حالات ناگفتہ بہ تھے لیکن شعری نشستوں کی بہتات تھی۔ رئیس بھائی بغیر کسی حیل و حجت کے ان محفلوں

میں شریک ہوتے تھے۔ میری دانست میں وہ مشاعرے کے شاعر نہیں تھے ۔ ان کا کلام فکر انگیز اور معنی خیز ہے۔ ان کی غزل بیسویں صدی کے انسان کا المیہ ہے۔ ایسے پر فوراً داد و تحسین ممکن نہیں ۔ رئیس بھائی خوشی خوشی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے کسی کی دعوت رد نہیں کی ۔ ایک دفعہ ان سے مشاعرے کی روایت پر طویل گفتگو بھی ہوئی ۔ وہ اس روایت کے حق میں تھے ۔ انھوں نے مشاعروں کی تاریخ، اس کی قیمتی افادیت، معنویت، سبھی پر اظہار خیال کیا۔ میرا موقف یہ تھا آپ جو کچھ فرماتے ہیں درست ہے لیکن یہ سب اس زمانے کی باتیں ہیں جب مشاعرے تہذیبی اور شعری تربیت کا وسیلہ ہوتے تھے۔ اب وہ صورت حال تو رہی نہیں ۔ حاضرین صرف تفریح طبع کے لیے آتے ہیں۔ ہوحق ہوتا ہے، ترنم کی داد ہوتی ہے اور بس۔ مگر رئیس بھائی نے میری یہ بات نہیں مانی ۔ کہنے لگے، معنوی تربیت ہو یا نہ ہو، یہ کیا کم ہے کہ لوگ آتے ہیں ۔ شعر و شاعری کا چرچا ہوتا ہے۔ کچھ نئے خیالات سے آشنا ہوتے ہیں ۔ اردو زبان و ادب سے دلچسپی بڑھتی ہے ۔ یہ کچھ کم ہے ۔ آپ اور کیا چاہتے ہیں ۔ آپ کا کلام سنا تو جاتا ہے۔

رئیس بھائی بڑے سادہ اور معصوم انسان تھے ۔ ان کے گرد مداحوں، شاگردوں اور فیض اٹھانے والوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا ۔ ایسے لوگ بھی تھے جو ان کے نام اور شہرت سے فائدہ اٹھاتے تھے مگر ان کا بڑاپن یہ تھا کہ انھوں نے ایسے تمام لوگوں کو خوش دلی سے برداشت کیا اور ان سے کبھی کوئی تعرض نہیں کیا۔

رئیس بھائی اپنے شاگردوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور بڑی توجہ سے ان کے کلام پر اصلاح دیتے تھے ۔ میرے ایک مرحوم دوست رئیس بھائی سے مشورہ کرتے تھے ۔ ایک دفعہ مجھے ان کی بیاض دیکھنے کا موقع ملا ۔ اس میں جو کلام درج تھا ۔ اسے رئیس بھائی نے دیکھا تھا اور جابجا اصلاح دی تھی ۔ اصلاح کا ایک آسان طریقہ تو یہ ہے کہ شعر صحیح نہیں ہے، اسے کاٹا دوسرا شعر لکھ دیا۔ مگر اس سے شعر میں شاگرد کی انفرادیت بھی مجروح ہوتی ہے اور اسے کلام کے عیب و صواب سے آگاہی نہیں ہوتی۔

دوسرا اور مشکل طریقہ یہ ہے کہ شعر میں جو خرابی ہے شاگرد کو اس سے آگاہ کیجیے اور اس کی اصلاح کیجیے۔

رئیس بھائی یہی طریقہ اختیار کرتے تھے۔ جس بیاض کا ذکر کر رہا ہوں اس میں یہی کیفیت تھی۔ جا بجا اشعار مختلف لفظوں کے بارے میں اظہار خیال تھا۔ کہیں کسی بندش پر گرفت تھی، کہیں کسی مضمون کے سلسلے میں اشارہ تھا۔ بڑی محنت کی تھی رئیس بھائی نے۔ ان کے لیے شعر کاٹ کر نئے شعر لکھ دینا بہت معمولی بات تھی مگر انھوں نے صحیح معنوں میں اصلاح کی تھی۔

رئیس بھائی کی زود گوئی کے بارے میں کیا کہوں۔ آب حیات میں ایک اور امروہوی میاں مصحفی کے بارے میں پڑھا تھا کہ شعر ایسے کہتے تھے جیسے لوگ باتیں کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک دوست سے ملنے گئے۔ دیکھا میاں مصحفی تیزی سے کچھ لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا خیر تو ہے۔ کیا کسی کو خط لکھ رہے ہو۔ بولے نہیں۔ ایک مہربان نے ایک مثنوی کی فرمائش کی تھی۔ بہت دن ہو گئے آج خیال آیا تو سوچا کہ لاؤ مثنوی لکھ دوں۔ وہی لکھ رہا تھا۔ یہ تو کانوں سنی تھی، آنکھوں دیکھی یہ ہے کہ رئیس بھائی بھی اسی طرح شعر کہتے تھے۔ ارباب فن کہتے ہیں، ایک آمد ہوتی ہے، ایک آورد ہوتی ہے۔ رئیس بھائی کے یہاں آمد ہی آمد تھی۔ آورد کہیں نظر نہ آئی۔

ایک دفعہ غالباً ۵۸ء کی بات ہے کراچی پورٹ ٹرسٹ کے عملے اور انتظامیہ میں کچھ چپقلش سی ہوئی۔ انتظامیہ اپنے کیے ہوئے وعدوں سے پھر گئی۔ عملے کے لوگ چاہتے تھے کہ اخباروں میں انتظامیہ کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا جائے۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا اگر رئیس صاحب ایک قطعہ لکھ دیں تو بہت اچھا ہو۔ میں نے رئیس بھائی کی خدمت میں عرض کیا۔ ادھر میں نے کہا، اُدھر انھوں نے کہا لکھو۔ افسوس یہ ہے کہ پہلے دو مصرعے ذہن سے محو ہو گئے۔ تیسرا اور چوتھا مصرع یہ تھا ؎

صدا یہ دیتے ہیں غم دیدگانِ پورٹ ٹرسٹ:
یہ پورٹ ہے مگر اس پر ٹرسٹ ناممکن

کیا التزام اور رعایت ہے اور یہ سارا التزام اور رعایت ایک لمحے کی بات ہے۔ ادھر میں نے کہا اور اُدھر قطعہ تیار ہو گیا۔ رئیس بھائی کیا تھے۔ شعری کمپیوٹر تھے۔ ادھر کسی نے فرمائش کی اور ادھر شعر ڈھلنے لگے۔ بے شمار لوگ آتے رہتے تھے۔ کسی کو سہرا لکھوانا ہے، کوئی قطعۂ تاریخ کا خواہش مند ہے۔ کسی کو قطعۂ تہنیت چاہیے۔ رئیس بھائی ہیں کہ خوشی خوشی سب کی فرمائشیں پوری کر رہے ہیں۔ انکار کسی سے نہیں، بس لکھوائے جا رہے ہیں۔ ایک دریا ہے کہ اُمنڈ رہا ہے۔ سب سیراب ہو رہے ہیں۔

میں یہاں رئیس بھائی کی شاعری، شاعرانہ کمالات، نثر نگاری اور صحافت پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ اس کے لیے دفتر درکار ہیں مگر بعض باتیں ایسی ہیں جن کے سلسلے میں مختصر اشارے کرنا ضروری ہیں۔ میری دانست میں رئیس بھائی وہ پہلے مجاہد تھے جنھوں نے اپنے قلم اور فکر سے استحصالی قوتوں کے خلاف جہاد کیا، حق خود ارادیت کا احساس عام کیا اور نوجوانوں میں ایک نیا شعور پیدا کیا۔ انھوں نے یہ خدمت بڑی سنجیدگی، خلوص اور دردمندی کے ساتھ انجام دی۔ ان کے ہم نوا اور ہم خیال کم تھے۔ بعض لوگوں نے ان پر تنگ نظری اور تعصب کے نام نہاد الزام عائد کیے مگر وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے اور نوجوانوں میں ایک نیا اعتماد، ایک نیا جذبہ، ایک نئی ہمت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مستقبل کا مورّخ جب ہماری قومی تاریخ مرتب کرے گا تو وہ رئیس بھائی کے اس کارنامے کو نظر انداز نہیں کر سکے گا کیوں کہ اس کارنامے نے ایک اُبھرتی ہوئی قوت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

رئیس بھائی دوسروں کی امداد و اعانت کا ایک مستقل ادارہ تھے۔ نہ جانے کتنے مستحقین کو ان کی وجہ سے امداد حاصل ہوئی اور ان کے مسائل حل ہوئے۔ انھوں نے یہ خدمت بڑی خوش دلی اور خلوص سے انجام دی۔ بڑے بڑے لوگ ٹرسٹ بناتے ہیں۔ فاؤنڈیشن قائم کرتے ہیں۔ امداد بھی ہوتی ہے، نام و نمود کا سلسلہ بھی ہوتا ہے ان میں مخلص اور دردمند بھی ہیں۔ حکام کو خوش کرنے والے بھی ہیں۔

رئیس بھائی شاعر اور صحافی تھے - ان کے پاس الفاظ، خیالات اور جذبات و تاثرات کا خزانہ تو تھا لیکن دنیاوی ثروت نہیں تھی مگر انھوں نے اپنے الفاظ، خیالات، اور جذبات و تاثرات سے لوگوں کی بھرپور امداد کی - دامے درمے سخنے قدمے کا فقرہ سنتے آئے ہیں - رئیس بھائی کے یہاں اس کی عملی تفسیر دیکھی - وہ امداد و اعانت کا ایک مرکز تھے - کسی کو امتحان کے لیے فیس چاہیئے تو رئیس بھائی کوشاں، کسی بیوہ کو لڑکی کی شادی کرنا ہے تو رئیس بھائی اپیل کر رہے ہیں، کوئی بیمار ہے، نادار ہے، ان کا قلم اور زبان دونوں امداد کے لیے کمربستہ۔

علوم شرقیہ سے ہماری دل چسپی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے - ہمیں اپنے اس تہذیبی ورثے کے زیاں پر کوئی افسوس بھی نہیں - اچھی زندگی گزارنے کی ہوس میں اعلیٰ تہذیبی قدروں سے ہاتھ دھو لینے میں بظاہر کیا مضائقہ ہے - رئیس بھائی کو اس صورتِ حال کا اندازہ تھا - چناں چہ عربی فارسی کا شوق زندہ رکھنے اور نوجوانوں کو تعلیم کی جانب راغب کرنے کے لیے انھوں نے ایک اورینٹل کالج قائم کیا تھا - اس ادارے نے کسی تشہیر اور دھوم دھام کے بغیر بے شمار طلبہ کی دست گیری اور رہنمائی کی ہے - یہ بھی رئیس بھائی کا ایک بڑا اہم کارنامہ ہے۔

حضرات، کہنے کو تو بہت کچھ ہے - شخصیت پہلو دار ہو تو بات کے ہزار پہلو مگر مجھے احساس ہے کہ میں ایک پہلو کی وضاحت بھی نہیں کر سکوں گا اس لیے صرف ایک آخری تاثر پیش کر کے آپ سے اجازت چاہوں گا۔

آج اور اس وقت مجھے سولہ برس پہلے کا جشنِ رئیس بڑی شدت سے یاد آ رہا ہے - پرل کانٹی نینٹل کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا - منتظمین پریشان اور سراسیمہ تھے - کرسیاں رکھوائی جا رہی تھیں مگر آنے والوں کا سلسلہ تھا کہ ختم ہی نہیں ہونے میں آتا تھا - شہ نشیں کے گرداگرد بھی کرسیاں بچھا دی گئیں - بے شمار آدمی کھڑے تھے - خوش اور مطمئن - خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں میں جسٹس قدیر الدین بھی تھے - میر علی احمد تالپور بھی تھے - بہت سے سیاسی رہنما تھے - ادیب اور شاعر تھے - میں نے بے شمار ادبی

جلسے دیکھے ہیں مگر ایسا بھرپور، شاندار اور کامیاب جلسہ نہیں دیکھا۔ ہر مکتبۂ خیال کے لوگ تھے۔ کیا شاندار اور پُر اثر اجتماع تھا اور اسی کے ساتھ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کا وہ دن بھی اور مجمع بھی آنکھوں میں پھر رہا ہے جو جشنِ رئیس ہی کا ایک منظر تھا۔ مگر آخری بقول غالب ؎

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ تھے
پڑتی تھی آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

اللہ باقی من کلِ فانی

○

پروفیسر پریشان خان خٹک

میری نظر میں رئیس امروہوی مرحوم ایک فرد نہیں بلکہ وہ ایک انجمن تھے۔ شاعری تو رہی ایک طرف، ان کی علمی بصیرت سے ہمیشہ مرعوب رہا اور قادر الکلامی کا یہ حال کہ آج تک میں روزانہ ان کے قطعات پڑھ کر ایک عجیب و غریب کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ ان کو اپنا استاد تسلیم کیا اور اتنا احترام کیا جتنا کہ کسی بہت عظیم و پرکشش شخصیت کا احترام کیا جاتا ہے ان کا ہم سے بچھڑ جانا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

نصیر ترابی

یہ مرگِ رئیس قدم جم ہے نصیرم
فریاد کی حسرت دلِ مغموم سے نکلے
میخانۂ اردو میں بچھی ہے صفِ ماتم
ساقی کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

مختار زمن

ایک رئیس القلم چلا گیا

(ایک تاثر)

آج کل اچھا انسان ہونا اچھے خاصے خطرے کو دعوت دینا ہے۔ یہ بات حضرت رئیس امروہوی کے قتلِ ناحق سے اچھی طرح ثابت ہو گئی۔ رئیس بھائی طبل و علم اور تخت و تاج کے مالک نہیں تھے کہ ورثا انھیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں۔ وہ کوئی ایسے امیر کبیر، صاحبِ جائداد بھی نہ تھے کہ ان کے قتل کے بعد کسی کی جھولی بھر جائے۔ ان کے مزاج میں تشدّد، عصبیت، مذہبی جنون اور انتہا پسندی بھی نہ تھی کہ کسی کی دل آزاری کریں اور اس حد تک کریں کہ مخالفین ان کی جان کے درپے ہو جائیں۔ وہ گالی گفتار بدزبانی اور دوسروں کی توہین و تضحیک سے پرہیز کرتے تھے بلکہ مخالفوں کا ذکر بھی شائستہ الفاظ میں کرتے تھے۔ کبھی کسی پارلیمان کے رکن نہیں رہے مگر ان کی زبان و قلم سے غیر پارلیمانی الفاظ نہیں نکلتے تھے ——— بس زمانے کو دیکھتے ہوئے ان میں ایک ہی کمزوری تھی کہ وہ ایک اچھے انسان تھے۔ اچھے اس لیے کہ وہ کھری بات کہتے تھے۔ عربی کا مقولہ ہے "الحق مُرٌّ" ۔ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ وہ متوازن لبرل مزاج کے آدمی تھے۔ کرتوں کو تھام لینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ لٹے پٹے، کچلے، پسے ہوئے لوگوں کے لیے وہ بڑے بڑوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ کلمۂ حق کہنے کے قائل تھے۔ اپنے ملک، اپنی ثقافت و تہذیب کی اعلیٰ اقدار کے طرف دار تھے ——— لیکن بدقسمتی سے ہمارا

سماج اس قدر تلپٹ ہو چکا ہے کہ یہی مثبت اقدار بعض لوگوں کی نظروں میں کھٹکتی ہیں۔ البتہ ہمیں یہ گمان نہیں تھا کہ اس حد تک کھٹکتی ہیں کہ ان کے ماننے والوں کو جان کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔

ہمارے معاشرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں گتھیاں تو زیادہ سے زیادہ الجھتی رہتی ہیں مگر سلجھتی مشکل سے ہیں۔ جرم و قتل تو دن رات ہوتے رہتے ہیں مگر مجرم و قاتل شاذ و نادر ہی کیفر کردار کو پہنچتے ہیں۔ یہاں پرامن شہری سر جھکا کر، نظر بچا کر، جسم و جاں چرا کر چلتے ہیں مگر قاتل و مجرم کھلے خزانے دندناتے پھرتے ہیں ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ سنگ را بستند و سگ را کشادند، اسی کو کہتے ہیں۔ جرم و قتل اور پھر کمیشن و کمیٹیاں بہت دیکھنے میں آتی ہیں مگر مجرموں کے چہرے اور کمیشنوں کی رپورٹیں ایسی پردے کی بیبیاں ہیں کہ انھیں چاند سورج نے بھی نہیں دیکھا۔ قتلِ لیاقت سے لے کر قتلِ رئیس تک تقریباً یہی صورت رہی ہے کہ زبانِ خنجر تو چپ ہے۔ آستیں کا لہو بھی نہیں پکار سکتا۔

قاتل نے رئیس امروہوی کو ہلاک کر کے ایک عہد، ایک کلچر، ایک روایت کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے —— مگر کیا اسے کامیابی ہوئی؟ جی نہیں۔ رئیس امروہوی کا جسم فانی تھا، وہ جسے ہم منوں مٹی کے نیچے دبا کر، ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے —— لیکن ان کے کارنامے تو باقی ہیں اور رہیں گے —— بلکہ خود رئیس صاحب بھی ہماری نظروں کے سامنے پھر رہے ہیں۔ وہ چاہنے والوں کی نظروں میں سمائے ہوئے ہیں، اور یہ نظریں ان گنت ہیں۔ دیکھیے وہی شیروانی، چوڑی مہری کا سفید لٹھے کا پاجامہ، ناگرہ جوتا، ہاتھ میں چھڑی، چھریرا بدن جو وقت کے ساتھ قدرے خمیدہ ہو رہا تھا، پیچھے کی طرف الٹے ہوئے سفید بال، بالوں کی ایک لٹ کان پر لہراتی ہوئی، سلیقے سے تراشیدہ ستواں ناک، بھرے بھرے ہونٹ، کشادہ دہانہ، چہرے پر گزرتے ہوئے ماہ و سال کے نشانات، تپاک سے ملتے، مسکراتے، لوگوں سے مصافحہ کرتے اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔

رئیس القلم تھے، لکھنے کے معاملے میں لکھ لٹ۔ اُن کے نوکِ قلم سے الفاظ کا دریا ہر دم رواں

رہتا تھا ـــــــ لیکن میں نے اکثر یہ نوٹ کیا کہ محفلوں اور مشاعروں میں وہ مختصر مضامین پڑھتے اور حسبِ ضرورت تھوڑا سا کلام سُناتے، یوں بھی وہ دریا کو کوزے میں بند کرنا جانتے تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ جلسوں میں ہر قسم اور ہر مذاق کے لوگ ہوتے ہیں۔ لمبی تقریریں اور طویل مقالے سننا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس لیے ہرچہ گیرید مختصر گیرید۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ جتنا کچھ کہتے غور سے سُنا جاتا ـــــــ رئیس بھائی کی آواز آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ اے لیجیے، وہ اُٹھے۔ نہایت سنجیدگی سے مائیک پر آئے۔ اپنی صاف اور واضح آواز میں تحت اللفظ غزل سُنائی یا مقالہ پڑھا اور پھر واپس اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ لہجہ مہذب، اندازِ بیان تربیت یافتہ، آواز نہ بہت بھاری، نہ بیٹھی ہوئی، نہ باریک بلکہ اصل چاندی کے سکے کی طرح کھنکتی ہوئی۔

رئیس صاحب کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ وہ قدیم و جدید علوم کے چشموں سے خوب سیراب ہوئے تھے۔ عربی، فارسی اور انگریزی سے واقف تھے۔ اردو گھر کی لونڈی تھی۔ ذخیرۂ الفاظ، جدید و قدیم اصطلاحات نوکِ زبان تھیں۔ صحافت ان کا پیشہ اور شعر و شاعری ان کی زندگی تھی۔ نفسیات اور مابعد الطبیعات قسم کے مضامین ان کا ذوق، اور سماجی خدمت ان کا شوق تھا ـــــــ سب جانتے ہیں کہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ان کے قطعات تھے جو جنگ میں روزانہ شائع ہوتے تھے۔ یہ قطعات اس وقت شروع ہوئے جب گاندھی جی کو قتل کیا گیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ دلّی میں ایک گولی گاندھی جی کے سینے میں پیوست ہوئی تو قطعات کا سلسلہ چل نکلا۔ دوسری گولی کراچی میں رئیس امروہوی کے دماغ عالی میں داخل ہوئی تب جا کر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ یہ قطعات ہماری چالیس برس کی سیاسی و سماجی تاریخ کا پرتو ہیں۔ اگر ہر قطعے کے ساتھ دو دو چار لائنوں کی تشریح دے دی جائے تو چالیس سالہ تاریخ تفصیل کے ساتھ مرتب ہو سکتی ہے۔ ان قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے چالیس برسوں میں اس عظیم ملک اور مظلوم سماج پر کیا گذری۔ ان چار چار لائنوں میں افراد اور قوم کی نفسیات، حالات پر تنقید و تبصرہ، نوک جھونک، طنز و مزاح کی ملاحت، فلسفیانہ نکات سبھی کچھ شامل

ہیں۔ یہ ہماری شاعری کے سرمائے میں دلچسپ اور شعری صحافت میں انوکھا اضافہ ہیں۔
رئیس امروہوی مرحوم کو قلم پر جو قدرت حاصل تھی وہ محتاجِ بیان نہیں وہ موضوع کے لحاظ سے الفاظ و اسلوب کا انتخاب کرتے تھے۔ ایک طرف انھوں نے نہایت سادہ نثر میں سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور جنسی مسائل پر مضامین لکھے۔ دوسری طرف اچھے مرزا کے نام سے سلسلۂ مضامین شروع کیا اور اودھ پنچ کے زمانے کی یاد تازہ کردی۔ اچھے مرزا کا کردار ان کی تخلیق ہے جیسے خوجی سرشار کی تخلیق تھا۔ مرزا کا انداز بیان اور زبان اس لکھنؤ کی یاد دلاتا ہے جو اب صرف کتابوں میں باقی ہے۔ لیکن اچھے مرزا کی زبان سے رئیس امروہوی تے بچے کی باتیں کہلوا دی ہیں جن میں معاشرے پر، حکومت پر، برائیوں اور خامیوں پر کہیں تبصرہ، کہیں تنقید، کہیں چٹکیاں، کہیں ہجو ملیح ہے ـــــــ اور ایسے بھولے بھالے انداز میں کہ آپ مسکرا سکتے ہیں، ناراض نہیں ہو سکتے ـــــــ میں نے یہ باتیں بر سبیلِ تذکرہ عرض کر دی ہیں۔ رئیس امروہوی کے شعری و نثری ورثے کو پرکھنا میرا منصب نہیں۔ یہ کام نقادوں اور عالموں کا ہے ـــــــ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ قادر الکلام تھے، بسیار نویس تھے، زبان و ادب کے ہر پہلو سے آشنا تھے۔ بہت سے موضوعات پر کتابیں پڑھتے اور لکھتے تھے۔ معاشرے کے نباض تھے۔ مختلف النوع دلچسپیاں رکھتے تھے۔ اپنے گرد و پیش پھیلے ہوئے معاملات و مسائل کو دیکھتے، سمجھتے اور سلجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ضرورت مندوں کی امداد کے لیے کمر بستہ رہتے تھے ـــــــ وہ اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھتے تھے۔ معاشرے سے کٹ کر الگ تھلگ رہنے والوں میں سے نہیں تھے یہ طریقہ تو اکثر ادیب اور دانشور اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور صحافت کے میدان میں تو یہ رویّہ یوں بھی ناگزیر ہے ـــــــ مگر رئیس صاحب کو ایک اور سہولت بھی حاصل تھی جو ان کے لیے دوربینی اور خوردبینی کے اسباب مہیا کرتی تھی ـــــــ یہ سہولت ملاقاتیوں کے علاوہ ان ہزارہا خطوط کی بدولت تھی جو رئیس صاحب کو موصول ہوتے تھے۔ مشاہیر اور دوستوں کے خطوط ہی نہیں ـــــــ مریضوں، زمانے

کے ستائے ہوئے مردوں، عورتوں، نوجوانوں، ضرورت مندوں کے خطوط جو ان کے سامنے بلا کم و کاست اپنے مسائل بیان کرتے اور ان کی رائے یا امداد طلب کرتے تھے۔ بعض مسائل ایسے بھی تھے جو پبلک کی نگاہوں سے اوجھل خالص نجی نوعیت کے ہوتے تھے۔ یہ خطوط معاشرے کا آئینہ تھے ——— اور ان کے ذریعے سے رئیس صاحب کا عوام سے رشتہ اور رابطہ اٹوٹ ہو گیا تھا ——— ان کے بعد اب اس خلا کو کون پُر کرے گا۔

؎ کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

ذرا غور تو کیجیے کہ پچھلے تقریباً ہزار سال سے ایران، توران، عرب، ترکستان وغیرہ سے برِ صغیر میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی تو یہاں کی دنیا بدلنی شروع ہو گئی۔ یہاں ایک نئی تہذیب یا ثقافت اور زبان کی بنا ڈالی گئی جس نے جنوبی ایشیا کے وسیع علاقے پر پھیل کر تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ یہ وسیع تہذیب ایک کل ہے۔ اس کے اپنے جز و بھی ہیں اور مقامی رنگ بھی۔ اسی کی حفاظت کے لیے یہ ملک وجود میں آیا۔ یہ ہماری تہذیب، ہماری ثقافت ہے اور اس کا ایک نہایت سجیل، نہایت کامیاب، نہایت دلکش و دلچسپ نمائندہ سیّد محمد مہدی رئیس امروہوی تھا ——— وہ چلا گیا ——— لیکن جانے سے پہلے اس نے ہماری تہذیب اور ہماری زبان کو کچھ اور چمکا دیا، کچھ اور جلا بخش دی، کچھ اور مستحکم کر دیا، خیال و عمل کے کچھ اور بیج بکھیر دیئے ——— اسی لیے ہمارے دل سے دعا نکلتی ہے کہ رئیس امروہوی کی ریاست جنّت الفردوس میں بھی قائم و دائم رہے۔ ہم جو پسماندگان ہیں ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ؎

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

○

ایم۔ یوسف القادری

شہیدِ انسانیت

۲۲ ر ستمبر کی منحوس شام جب ایک سفاک اور بے رحم قاتل نے نہ معلوم کیا سوچ کر اس عظیم انسان کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا جسے لوگ بحیثیت ایک شاعر، مفکر، دانشور، ماہرِ نفسیات، ماہر روحانیات اور ایک کہنہ مشق صحافی کی حیثیت سے جانتے تھے لیکن بقول مرحوم ؎

توڑ ڈالے ہیں اس طرح میں نے
شخصیت کے تمام پیمانے

کہ میری ذات کے دھندلکے میں
کوئی جھانکے تو کچھ نہ پہچانے

لیکن میرا معاملہ دوسرا ہی ہے۔ مجھے اس عظیم انسان کی زندگی کے آخری سولہ سال ایک شاگرد اور ان کے رفیقِ کار کی حیثیت سے ساتھ رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ شاعر، دانشور، مفکر، صحافی، ماہر نفسیات و روحانیات کی صفات کے حامل بہت سے ہوں گے، لیکن ایک کامل مجسمۂ انسانیت جسے انسانیت کے مدارج کا بخوبی ادراک ہو، جو احترام انسانیت کا قائل ہو، جس کی عملی زندگی کا محور انسانیت کے گرد

بوقتِ شہادت آخری مضمون لکھتے ہوئے تحریر کے اوراق خون میں لت پت ملے۔

گھومتا ہو، ایسا انسان اس دور میں ملنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ یہ مرتبہ تو حضرت رئیس امروہوی نے حاصل کیا ہے ؂

پڑھے کیوں کر کوئی اس دفترِ تہذیبِ انساں کو
ورق اکثر کتابوں کے لہو میں تر نکلتے ہیں

اس بے حس قاتل نے ان کی پانچ بیٹیوں کو ہی یتیم نہیں کیا بلکہ نہ معلوم کتنی بیٹیاں اور بیٹے یتیم ہوئے ہیں وہ اپنے تین بھائیوں سے ہی جدا نہیں ہوئے۔ نہ معلوم کتنے بھائی اشکبار ہیں ؂

غروبِ مہر کا ماتم ہے گلستانوں میں
نسیمِ صبح بھی شامل ہے نوحہ خوانوں میں

ان کی شہادت کے بعد کئی ایک مشاہدات سامنے آئے ہیں کہ انھیں منکشف ہو چلا تھا کہ سال ۱۹۸۸ء ان کا دنیا میں آخری سال ہے۔ جب گولی کا نشانہ بنے تو اپنے بارے میں مضمون لکھتے ہوئے یہ تحریر کرنا "ممکن ہے کہ پھر لکھنے لکھانے کا موقع نہ ملے۔ امکان قوی یہی ہے کہ نہ ملے گا" اور اس مضمون کے آخری صفحات پہ پھیلے خون کے چھینٹے اس امر کی صداقت کی گواہی دے رہے ہیں کہ ان کی یہ تحریر واقعی آخری ثابت ہوئی۔ اسی طرح سانحے سے دو ماہ پیشتر اپنے ماموں زاد بھائی جو کہ ان کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے، کے سوئم کے موقع پر اپنے اعزا سے یہ کہنا کہ "میری موت پر اتنا سوگ نہیں منانا"، اپنی نواسی عینی سے یہ کہنا کہ "بیٹا تمہارے نانا کا یہ آخری سال ہے"۔ اسی ضمن میں راقم سے انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اسٹوڈیو چل کر فوٹو کھنچوا آئیں۔ راقم نے بتایا کہ حضرت آج گاڑی کا انتظام نہیں ہے۔ کل آپ کے دیرینہ رفیق بزم انصاری کی گاڑی منگوا کر چلیں گے۔ لیکن انھوں نے اصرار کیا کہ ابھی میری اسکوٹر پر ہی چلیں گے۔ آخر ان کی بات مان کر اسکوٹر پر ہی گارڈن پر واقع اسٹوڈیو لے گیا انھوں نے میرے ساتھ فوٹو کھنچوائے۔ دو دن بعد جب فوٹو آئے تو فوٹو کی پشت پر آپ نے چند یادگاری کلمات تحریر کیے اور اس پر ۱۶ دسمبر ۱۹۸۸ء لکھ دیا۔ جب میں

نے ان کی توجہ تاریخ کی طرف مبذول کرائی کہ حضرت آج ۶ جنوری ۱۹۸۸ء ہے اور آپ ۶ دسمبر ۱۹۸۸ء لکھ رہے ہیں۔ تو فوراً تصحیح کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ ہاں ۶ دسمبر ۱۹۸۸ء کہاں آئے گی۔

آہ ایسے ہی کہا تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۸۸ء ان کی نہ آسکی ہے

اس سال ہیں کچھ اور ہی قسمت کے اشارے

کچھ رنگ نیا اب کی برس دیکھ رہے ہیں

حضرت رئیس امروہوی دوستوں کے دوست تو تھے ہی لیکن وہ دشمنوں کے بھی بہترین دوست تھے۔ اس معاملے میں وہ عجیب و غریب انسان تھے۔ انھیں معلوم ہونے کے باوجود کہ فلاں فلاں صاحب ان سے بغض و کینہ رکھتے ہیں اور انھیں نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ انھیں اپنی عنایات و کرم سے محروم رکھیں اور دربار رئیس سے کوئی شخص مایوس و محروم جائے۔ مرحوم کی زندگی کے آخری سولہ سال اپنی وابستگی کے دوران میں نے کئی ایک ایسی شخصیات کو دیکھا ہے جو اُن سے بغض و کینہ رکھتے تھے لیکن فیض حاصل کرتے تھے۔ وہ فقیر صفت انسان تھے۔ قلندرانہ سادگی تھی ان میں نمائشی جاہ و حشمت بالکل نہ تھی۔ طمع و لالچ، حرص زر کے قریب سے بھی نہ گزرے، حالانکہ کئی ایک مواقع ایسے بھی آئے اگر یہ چاہتے تو لاکھوں روپے حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن ایسی پیش کشوں کو کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا۔ خدمت انسانیت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ روز کا معمول تھا ہر کسی کے کام کے لیے سفارشی خطوط لکھا کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر فون بھی کرتے تھے۔ عموماً کہا کرتے تھے کہ میری زیادہ سے زیادہ کوشش ہوتی ہے کہ میری ذات سے لوگوں کو فیض پہنچے اور میں کسی کے کام آسکوں تو میرے لیے یہ راحت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے جب وہ منحوس قاتل آپ کو شہید کرنے پہنچا ہو گا۔ آپ نے اپنی ان ہی اعلیٰ صفات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس ناہنجار سے کہا ہو گا " میاں آؤ۔ کیسے آنا ہوا ؟ " اور جب قاتل نے اپنا ارادہ ظاہر کیا ہو گا تو آپ نے کہا ہو گا " گولی مارنی ہے۔ بھئی ضرور مارو، شاید میرا خون تمہارے لیے سودمند

ثابت ہو۔ بس یہ مضمون ذرا مکمل کر لوں" لیکن وہ بے حس درندہ صبر نہ کر سکا ہوگا ؎

ابھی تدفین باقی ہے ابھی تو
لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں

جہاں ہے رسم قتلِ انبیار کی
وہاں مبعوث فرمایا گیا ہوں

○

ملک معراج خالد

رئیس امروہوی صاحب کے بارے میں مجھے اتنا ہی کہنا ہے کہ مجھے ان سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کا احترام اور ان سے محبت میرے لیے ایک سرمایہ تھی۔ علمی، ادبی اور فکری لحاظ سے تو ان کا مقام بہت عظیم و منفرد تھا ہی لیکن بطور انسان بھی وہ بہت ہی بلند اور عظیم تھے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میری ان سے بے شمار ملاقاتیں بھی تھیں۔

مجید نظامی

میں نے "جنگ" اخبار شاید کم پڑھا ہو لیکن رئیس امروہوی مرحوم و مغفور کا قطعہ ضرور پڑھا ہے اور وہ اس اخبار میں واقعی پڑھنے کی چیز ہوتی تھی اور اب بھی ہے کہ اس اخبار میں قندِ مکرر کے طور پر روزانہ رئیس صاحب کا قطعہ شائع ہو رہا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اس اخبار کے لیے کس قدر ناگزیر ہو چکے ہیں۔

کوثر رضوی

عظیم ادبی شخصیت رئیس امروہوی مرحوم

ادبی اور عوامی حلقوں میں یہ خبر انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ملک کے عظیم دانشور نامور صحافی ممتاز شاعر اور مایہ ناز ادیب رئیس امروہوی ۲۲ رستمبر کو انتقال کر گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جس خلوص و محبّت، لگن اور رواداری کے ساتھ فکر و فن کے چراغ روشن رکھے، اردو زبان کی شاندار خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی، نصف صدی سے زائد عرصے تک شعری اور نثری ادب کی تخلیقات کی بنا پر ادبی اور عوامی حلقوں میں اپنی شناخت کروائی، روزنامہ جنگ کے حوالے سے وہ جانے پہچانے گئے ان کی فن کارانہ مہارت اور قدرت کلامی نے عزّت اور شہرت کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ جنگ ہی ان کی غیر معمولی قابلیت کا وسیلہ بن سکا، ان کی دلی وابستگی اور ربط و تعلق جنگ سے ایسا ہی رہا جیسے صدف اور گہر یا جسم و جاں کا سا۔

سیّد محمد مہدی اپنے ادبی نام رئیس امروہوی سے مشہور اور مقبول ہوئے ۱۲ رستمبر ۱۹۱۴ء کو سادات امروہہ کے معزز گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام علّامہ سیّد شفیق حسین ایلیا تھا جو خود بھی اپنے عہد کے جید عالم، ممتاز شاعر و ادیب تھے انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن امروہہ ہی میں حاصل کی اور علمی و ادبی گھرانے کے اس ماحول میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ اچھے اشعار کہنے پر عبور

حاصل ہوگیا، ان کے یہاں زود گوئی، روانی اور سلاست اس بلا کی تھی کہ حیات امروہوی کے بعد وہی واحد فن کار تھے جو بیک وقت اپنے کئی کئی شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے، گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور یہ سعادت بہت ہی کم فنکاروں کو نصیب ہوتی ہے انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز صبا عرفانی کے نام سے کیا لیکن والد کے مشورے پر وہ صبا عرفانی سے رئیس امروہوی ہو گئے۔ شاعری کا آغاز نظم سے کیا لیکن بعد کو غزل کہنے پر توجہ دی اور پھر مشق سخن زود گوئی کا وسیلہ بن سکی ان کا باقاعدہ صحافتی سفر کا آغاز ۱۹۳۲ء میں اس وقت ہوا جب وہ مراد آباد سے شائع ہونے والے پہلے ادبی ماہنامہ "مسافر" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اس کے بعد روزنامہ "جدت" مراد آباد کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ صحافت میں مزید تجربہ حاصل کرنے کے لیے دلی پہنچے، روزنامہ "انصاری" سے وابستہ ہوئے ماہنامہ "مشہور" سے بھی ان کا تعلق رہا۔ قدرشناسی کی اعلیٰ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ایڈیٹر انچیف میر خلیل الرحمٰن نے انھیں روزنامہ "جنگ" میں شمولیت کی دعوت دی۔ اس طرح قیام پاکستان کے موقع پر ستمبر ۱۹۴۷ء میں روزنامہ "جنگ" کے دفاتر جب دارالحکومت کراچی منتقل ہوئے تو کچھ عرصہ "جنگ" کے مدیر بنا دیے گئے، یہاں آ کر انھوں نے روزانہ ایک قطعہ لکھنا شروع کیا جو سیاسی سماجی حالات کا آئینہ دار ہوتا، اس کے علاوہ مستقل کالم نگاری میں مختلف علوم و فنون پر مضامین لکھے جن میں فلسفہ، سماجیات، سیاسیات، اخلاقیات، نفسیات اور مابعد الطبیعات کے علاوہ یوگا علم نجوم، علم فلکیات، ہپناٹزم، روحانیات، جنسیات اور جنات شامل تھے۔ غرض کہ ہر موضوع پر انھوں نے دل کھول کر لکھا۔ انھوں نے روزانہ قطعہ کے حوالے سے ایسی نشتر زنی کی کہ کوئی بھی موضوع ان کی زد سے نہیں بچ سکا اس کے علاوہ نثری کالم میں وقت کے تقاضے حالات کے نشیب و فراز اور خاص طور سے قارئین کی دلچسپی کو بھی ملحوظ رکھا ان میں بقراط سقراط اور نواب اچھے مرزا کے مکالمات کو قلم بند کیا اس کے بعد انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھا جن میں حیات بعد الموت، عالم آخرت، عالم برزخ، طریقت، و تصوف

حالات حاضرہ سے متعلق اہم مسائل، ادبی جمود اور سیاسی گھٹن کا جائزہ ہوتا، مختلف گتھیوں کو سلجھاتے، جمہوری عمل کو متحرک، زیادہ پائیدار اور فعال بنانے، سیاسی تحریک، سیاسی عدم استحکام، احساس محرومی، مسائل کی یلغار، معاشرتی برائیوں کرب مسلسل کے اظہار کے علاوہ خدمت خلق سے متعلق گذارشات ہوتیں، کتابوں پر مختصر تبصرے ہوتے، نوجوانوں کی بے راہ روی کو دور کرنے اور نئی نسل سے متعلق خطوں کے جواب بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے لوگ حل طلب مسائل کے لیے ان کی آرار، کالمے بے چینی سے انتظار کرتے۔

کوہ ہمالہ کے وسیع و عریض دامن میں آموں کے گھنے درختوں، سرسبز و شاداب اور لہلہاتے کھیتوں کے درمیان امروہہ روہیلکھنڈ کی وہ مردم خیز بستی ہے جس نے صدیوں کے عروج و زوال کو دیکھا اور وقت کی سلوٹوں کو اپنی پیشانی پر شدت کے ساتھ محسوس کیا جس نے اطبائے باکمال دانشور ادبا، شعرا محدث علما اور صوفیائے کرام کو جنم دیا اور اسی حوالے سے حکیم حسن عسکری، کمال امروہوی، صادقین، مصحفی امروہوی، حیات امروہوی، علامہ سعید احمد کاظمی، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور مفتی نسیم احمد فریدی مشہور و معروف ہوئے اور یہاں حضرت شاہ ولایتؒ، حضرت مخدوم شاہ ابن بدر چشتیؒ، جھنڈا شہیدؒ، بھورے خان شہیدؒ، شیخ چاند فاروقیؒ، جیسے مشہور بزرگانِ دین ابدی نیند سو رہے ہیں اور جن کے فیوض و برکات آج بھی اسی طرح جاری و ساری ہیں۔

رئیس امروہوی مشرقی قدروں کے علمبردار تھے ان کا تعلق اس ادبی علمی مذہبی اور معزز گھرانے سے تھا جہاں دوسروں کے ساتھ دکھ درد بانٹنے، اخلاقی اقدار ادب و احترام کو قدر اول کی نگاہ سے دیکھا جاتا، وضع داری، خلوص و محبت اور رواداری جس کا شیوہ و شعار تھا سادگی پسند اس گھرانے میں جہاں علم کے چراغ روشن تھے۔ معاشرتی آداب اور نظام اقدار کو اولیت حاصل رہی، بزرگوں کا احترام چھوٹوں پر شفقت اور سماج کے روندے ہوئے لوگوں سے محبت کرنا ایک مقدس فریضہ

سمجھا جاتا تھا۔ ابتدائی دور میں شعر گوئی کے حوالے سے مشاعروں میں وہ بڑی پابندی سے شرکت کرتے، رات رات بھر یہ محفلیں جاری رہتیں، مشاعروں میں مصرع طرح دیے جاتے، شعرا ان پر طبع آزمائی کرتے، اس عمل سے آگے بڑھنے کے لیے راہیں ہموار ہوتیں، اور اچھا کہنے کا شوق پروان چڑھتا، ان کا شعری ذوق اور وجدان دراصل اس عہد کی پیداوار ہے جب قدروں کا احترام اور ادبی روایات کا بھرم برقرار تھا ابتدائے عمر انھیں اردو اور فارسی ادب میں عبور حاصل ہوا، گلستان و بوستان سعدی، انوارِ سہیلی، دیوانِ حافظ، دیوانِ غالب وغیرہ ان کے زیرِ مطالعہ رہیں جس کی بنا پر ان کے ادبی ذوق میں نکھار پیدا ہوا۔ وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے تحریکِ پاکستان کے پرجوش اور زبردست حامی تھے، انھوں نے اپنے متعدد شاگردوں کو مسلم لیگ اور پاکستان کے حوالے سے جوشیلی نظمیں کہہ کر بھی دیں، جو اس زمانے میں بڑی مقبول ہوئیں۔

انھوں نے ...... اپنے معاصرین میں بہت جلد نمایاں مقام حاصل کر لیا، اکثر مشاعروں کی صدارت کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔ وہ اپنی سادہ مزاجی اور وضع داری کی بنا پر بڑی محترم اور بزرگ شخصیت تھے: اردو کی ہر صنفِ سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد تھی وہ ادیب بھی تھے شاعر بھی صحافی بھی تھے مورخ بھی، مقرر بھی تھے ماہرِ نفسیات بھی، مفکر بھی تھے محقق بھی، نقاد بھی تھے اور فلسفی بھی، وہ اخلاقی قدروں اور اعلیٰ روایات کے دلدادہ، اور خلوص و اخلاق کا مجسم پیکر تھے ان میں وضع داری بھی تھی اور رکھ رکھاؤ بھی: سادہ لباس اور سادگی ان کا شعار تھا، وضع قطع میں پرانے بزرگوں کی سی شان و شوکت تھی۔ ان کی بات کرنے کا انداز انتہائی مشفقانہ ہوتا، وہ مشرقی اقدار و روایات کے سختی سے پابند رہے اس طرح ان کی شخصیت ایک کھلی ہوئی کتاب کی مانند تھی۔

"جنگ" کے مستقل کالم نگار اور روزانہ قطعہ لکھنے پر انھیں اتنی دسترس تھی کہ باتوں ہی باتوں میں حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے قطعہ لکھ دیتے۔ ان کے قطعہ کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ قارئین میں اگلے دن دوسرا قطعہ پڑھنے کے لیے ایک تجسس برقرار رہتا یا ان

کے ہفت روزہ کالم بھی جو مختلف علوم و فنون اور موضوعات پر ہوتے ۔ ۔ ۔ بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے، ہر چند کہ وہ نام و نمود اور شہرت سے بے نیاز رہے لیکن عوامی مقبولیت ان سے بے نیاز نہ رہ سکی انھوں نے ہمیشہ سچائی کی تلاش کی اور جو کچھ کہا وہ دو ٹوک، برجستہ اور برملا کہا۔ انھوں نے اپنے فنی سفر میں ذاتی مفاد کو کبھی ترجیح نہ دی وہ اشارے کنائے میں سیاسی حالات پر نشتر زنی کرتے، دل کی بات کو ایسے برجستہ انداز میں زبان پر لے آتے جس کو پڑھ کر لوگ دنگ اور حیران رہ جاتے گویا ان کے یہاں طنز و مزاح کی ایسی لطیف چاشنی تھی جس نے قطعہ کو عوامی دلچسپی سے ہم آہنگ کر کے انھیں مقبولیت عطا کی اور یہی اندرونی احساسات، جذبات اور تاثرات ان کے برملا اظہار بیان کا وسیلہ بن سکے۔

انھوں نے اردو کی ترویج و ترقی، اس کی اشاعت کے لیے لوگوں کے دلوں پر برابر دستک دی اس کے لیے ہر دم کوشاں رہے اور اس کی خدمت کو عبادت کا درجہ دیا۔ انھیں اپنے معاصرین کے مقابلے میں ایک منفرد و ممتاز مقام حاصل تھا۔ لوگوں نے انھیں بے انتہا چاہا، ان سے ٹوٹ کر پیار کیا، عزت دی۔ مشاہیر اہل ادب بھی ان کا بے حد احترام کرتے، ان کے شعری اور نثری ادب سے کسی نے کبھی اختلاف نہ کیا۔

فنی نقطۂ نظر سے ان کے یہاں اثر و تاثیر ہے گہرائی و گیرائی ہے، سادگی بھی ہے دلکشی بھی، طنز بھی ہے مزاح بھی، آپ بیتی بھی ہے جگ بیتی بھی، درد و غم بھی ہے خوشیوں کا اظہار بھی، حالات کا تجزیہ بھی ہے مردانہ وار مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی، وہ اپنے عہد کے کرب سے بھی گزرے، بے شمار دکھوں کو اپنی جھولیوں میں سمیٹا، مسائل کی یلغار سے بھی نبرد آزما ہوئے، انھوں نے اپنی ذات کے حصار سے نکل کر اپنے فنی سفر کو نئی راہوں سے ہمکنار کیا، حالات کے نشیب و فراز سے بہت کچھ حاصل کیا اور وقت نے ہی ان کو آگے بڑھنے کا بھرپور حوصلہ عطا کیا، پیرانہ سالی کے باوجود انھوں نے ادب اور صحافت سے رشتہ استوار رکھا، وقت کے نئے تقاضوں کو اپنے فکری انداز اور شعوری احساس میں سمویا۔ ادب کو زبان و بیان کی سادگی کا حسن بخشا، وہ قادر الکلام تھے ان

کی زبان سادہ اور عام فہم ہے، ان کے یہاں الفاظ کی بندش ہے محاورے کا برمحل اور برجستہ استعمال ہے، سچائی کا اظہار ہے، ادراک و شعور ہے، صوفیانہ خیالات میں فلسفیانہ چھاپ ہے، جدت پسندی ہے، نت نئے تجربات ہیں۔ انھوں نے زندگی کے حقائق کو منکشف کیا۔ سربستہ اسرار و رموز بیان کیے، ان کے یہاں فن کارانہ نظم و ضبط ہے، فکری شعور ہے، قومی جذبہ ہے، وطنیت کا احساس ہے، بلا کی روانی ہے، جاذبیت ہے، سادگی اور دلکشی ہے اور یہی وہ خوبیاں تھیں جنھوں نے ان کو رئیس القلم ہونے کا اعزاز بخشا اور عزت و احترام کے ساتھ استادی کی مسند پر لے جا بٹھایا، انھوں نے کئی لاکھ اشعار کہے۔ ہزاروں مضامین لکھے جس میں ان کے پانچ شعری مجموعے اور نثری ادب پارے شامل ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ الف کے نام سے شائع ہوا جس نے عوام سے زبردست خراج تحسین حاصل کیا، پذیرائی ہوئی، اور مقبول ہوا، ان کی قادر الکلامی، ان کی فن کارانہ مہارت، ان کا انداز بیان، ان کا تغزل، ان کا نثری ادب اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

روزنامہ "جنگ" میں رئیس امروہوی کے روزانہ ایک قطعہ کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی انھوں نے معاشرے میں پائے جانے والے کرب مسلسل پیچیدگیوں، سماجی نابرابری، سیاسی عدم استحکام کی بنا پر ایسے معرکۃ الآرا اردو اشعار پر مبنی قطعہ کو اپنے جذبۂ اظہار کا وسیلہ بنایا۔ حالات حاضرہ کے حوالے سے ان کے روزانہ قطعہ کی بڑی اہمیت تھی۔ ملک کی سیاسی زندگی، احساس محرومی، انتشار، غیر یقینی کیفیت، اضطراب اور جبر و تشدد پر نشتر زنی کی، اور یہ اعزاز و افتخار برصغیر میں جنگ کو ہی حاصل رہا کہ ان کا قطعہ روزنامہ "جنگ" کا ایک مستقل حصہ بن گیا۔

رئیس امروہوی بلاشبہ ہماری ادبی تاریخ کی وہ قدآور شخصیت تھے جو بیک وقت کئی خصوصیات کے حامل تھے، انھوں نے فن کو نئے موڑ دیے، نئے تیور عطا کیے ہر چند کہ وہ ذہنی کرب سے گزرے ان کی پوری زندگی کشمکش اور استقلال سے عبارت تھی لیکن مصائب و آلام سے کبھی نہ گھبرائے انھوں نے صحافت کے سفر کو عزم و حوصلے کے ساتھ

جاری رکھا ۔ ادبی حلقوں اور علمی مجلسوں میں ان کی بڑی عزت اور احترام تھا اس طرح وہ ایک اسکول تھے، ادارہ تھے، ایک انجمن تھے ۔ ان کی موت سے ادبی دنیا اور صحافتی تاریخ کا روشن اور درخشندہ باب ختم ہوگیا وہ اپنی روشن اور زندہ تحریروں سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے ان کے فکر و فن کی چاندنی ہر طرف پھیلی رہے گی ۔

○

ایس ایم ظفر

ایک حساس انسان جب شاعری کرتا ہے تو وہ رئیس امروہوی بن جاتا ہے ۔ معاشرے کے ہر اہم پہلو پر ان کی نظر تھی ۔ الفاظ کو سلیقہ پہنانا قدرت نے انھیں تحفے میں دیا ہوا تھا ۔ ان کے قطعات ایک رجحان اور نشان دہی کی وجہ سے بنا کرتے تھے اور ابھی ہمارے ملک کے حالات ایسے ہیں کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ بار بار ان قطعات کو شائع کیا جانا چاہیے ۔

وہ اپنے دور کے ایک عجیب ناقد تھے، جو چھوٹی چھوٹی کنکریاں پھینک کر بھٹک جانے والوں کو سیدھا راستہ دکھاتے تھے ۔ بہتر ہوگا کہ ان کے تمام کام کو تاریخ کے پس منظر میں اکٹھا کیا جائے ۔

rekhta.org

پروفیسر ضیا علیگ

رئیس امروہوی کینیڈا میں

جناب ظفر عمر زبیری نے حال ہی میں ایک کتاب "شعرائے لندن" پر "افکار" میں تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "پہلے اردو زبان کے مراکز دہلی۔ لکھنؤ۔ پھر علی گڑھ حیدرآباد دکن کو وہ نظرانداز کر گئے) ان میں شامل ہوا، اس کے بعد لاہور اور کراچی کو یہ اہمیت حاصل ہوئی اور اب لندن اور ٹورنٹو بھی اردو علم و ادب کی اہم فتوحات میں شامل ہو چکے ہیں۔"

ٹورنٹو کے بارے میں زبیری صاحب کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔

کینیڈا غالباً واحد ایسا ملک ہے جہاں دنیا کے ہر علاقے کے لوگ آکر آباد ہوئے ہیں۔ جب یہ لوگ ترک وطن کر کے یہاں آئے تو اپنے مذہبی اعتقادات، اپنی سماجی اور معاشرتی روایات اور اپنی تہذیبی اور تمدنی اقدار کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئے اور اس ملک میں اپنے قدم جما لینے کے بعد ان تارکین وطن نے اپنے وطن مالوف سے رشتہ توڑا نہیں بلکہ اس کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش کی۔

اس کوشش میں ان کو یہاں کی مرکزی، صوبائی اور علاقائی حکومتوں سے بھی پوری اعانت ملی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف النوع تہذیبوں کے ایک جگہ جمع ہو جانے کے بعد جو تصادم کا خدشہ ہوتا ہے وہ جاتا رہا اور ہر ملک سے آئے ہوئے لوگوں کو اپنی ثقافتی اقدار کی حفاظت کرنے کا موقع مل گیا۔ اسے آپ یہاں کی حکومت کی

وسیع النظری بھی کہہ سکتے ہیں اور تارکانِ ملک و ملّت کی سلیقہ مندی بھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بہت جلد یہ ملک مختلف سماجی، ثقافتی، تمدنی اور مذہبی اقدار کا ایک خوشنما مرقع اور ایک حسین MOSAIC بن گیا۔ آج اس ملک کی سرزمین میں نہ جانے کتنی تہذیبوں کے رنگ برنگے خوب صورت پتھر نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں اور اس ملک کی دل فریبی اور دیدہ زیبی میں ہر روز کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

پچھلی تین دہائیوں میں یہاں ہجرت کر کے آنے والوں میں ایک خاصی تعداد ہندوستانی اور پاکستانی مہاجرین کی بھی ہے۔ یہ لوگ جہاں اپنے ساتھ اور بہت سی خصوصیات لائے وہاں اردو زبان اور ادب سے اپنی والہانہ محبت بھی ساتھ لے کر آئے۔

اردو کا چرچا امریکہ میں تو بہت دنوں سے تھا اور یہ زبان اس ملک کی تو مختلف یونیورسٹیوں میں گریجویٹ پروگرام کے تحت پڑھائی جاتی تھی اور پھر میرے ہوائی پہنچنے کے بعد یونیورسٹی آف ہوائی کے الحاق شدہ ادارے ایسٹ ویسٹ سنٹر میں بھی اس کی لائبریری قائم ہوئی اور اس کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، مگر کینیڈا میں اس زبان کو ایک عرصے تک کوئی اہمیت حاصل نہیں ہونے پائی اور اس کی تعلیم یہاں کی صرف دو یونیورسٹیوں میں دی جاتی تھی۔ ایک تو سنٹر آف مڈل ایسٹ اور اورینٹل اسٹڈیز۔ میکگل یونیورسٹی۔ مانٹریال (کیوبک) اور دوسرے سنٹر فار ایسٹ ایشین اسٹڈیز۔ یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا۔ وینکوور۔ مگر ان دونوں اداروں میں بھی اردو کی کوئی CHAIR قائم نہیں تھی۔ اب صرف میکگل یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہاں اردو داخل نصاب ہے اور اس کی چیر قائم ہے اور ڈاکٹر ساجدہ علوی اردو پڑھانے پر مامور ہوئی ہیں۔

ٹورنٹو میں اردو کا چرچا پروفیسر عزیز احمد کی آمد کے بعد سے شروع ہوا اور پھر جیسے جیسے اردو بولنے والے حضرات اس شہر میں آتے گئے اور اس کے اطراف و جوانب آباد ہوتے گئے ویسے ویسے اس زبان کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ رفتہ رفتہ یہاں سے اردو کے اخبارات بھی نکلنے لگے، رسالے بھی شائع ہوئے، ٹی وی اور ریڈیو پر بھی اردو کے پروگرام

نشر ہوتے گئے، بہت سی انجمنوں کا قیام بھی عمل میں آیا جنھوں نے مقامی اور بین الاقوامی مشاعروں اور کانفرنسوں کا بھی اہتمام کیا۔ قصّہ مختصر کچھ ہی عرصے میں سارے جہاں کی طرح یہاں بھی اردو کی دھوم مچنے لگی۔

اس شہر میں اردو کو قبولیتِ عام کے درجے تک پہنچانے میں میرے علاوہ اشفاق حسین اور ان کے بعض رفقا، کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اوائل ۱۹۸۵ء میں رائٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈینز کا قیام عمل میں آیا اور رضا بد جعفری مدیر" امروز" اس کے پہلے صدر چنے گئے۔ اس کے بعد پاکستان ایمبیسی فورم کی بنیاد پڑی اور پھر ان دونوں اداروں نے مل کر اس سال ستمبر میں پہلی اردو کانفرنس اور مشاعرے کے انعقاد کا اعلان کیا جس میں شرکت کے لیے جناب رئیس امروہوی پہلی بار کینیڈا تشریف لائے۔

رئیس امروہوی کا شمار اردو کے منفرد اور ممتاز صحافیوں، ادیبوں، اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان سے میری پہلی ملاقات نواب شاہ (سندھ) کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۵۸ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت اس ضلع کے کلکٹر جناب اکبر عادل تھے (جو آگرہ کے ممتاز خاندان کے فرزند انور عادل کے فرزند ارجمند تھے)۔ رئیس صاحب کی ملاقات نے جو خوشگوار اثرات میرے دل پر چھوڑے وہ انمٹ تھے۔ اس مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے کراچی کے علاوہ دوسرے کئی شہروں سے بھی شعرائے کرام تشریف لائے تھے، مگر آج مجھے ان کے نام بھی یاد نہیں ہیں۔ البتہ رئیس صاحب کی صورت اس وقت بھی نظروں کے سامنے گھوم رہی ہے۔

رئیس صاحب سادات امروہہ کی اخلاق، تمدنی اور مذہبی روایات کے وارث ایک مخصوص تہذیب اور ثقافت کی پیداوار تھے۔ کینیڈا میں وہ جس کسی سے ملے اس پر بھی انھوں نے یہی اثر چھوڑا کہ وہ بہت ہی وضع دار، شگفتہ مزاج، حلیم الطبع قسم کے انسان ہیں۔ نیک طینتی، انسان دوستی، دوست نوازی ان کی فطرت کا خاصّہ ہے۔ محبت، شفقت، اخلاق اور اخلاص ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ذرا ان کا ایک قطعہ ملاحظہ فرمایئے ؎

وہی نفرت سے اُبل پڑتے ہیں
جو محبت سے بھرے ہوتے ہیں
میری تلخی کا سبب ہے اخلاص
کھردرے لوگ کھرے ہوتے ہیں

وہ کھرے ضرور تھے۔ کھردرے بالکل نہیں تھے۔ میں نے ان کے منہ سے کبھی کوئی کڑوی کسیلی بات نہیں سنی، کبھی ان کو تیز لہجے میں گفتگو کرتے نہیں پایا، کبھی کسی پر ناراض ہوتے نہیں دیکھا۔ خواتین سے جب مخاطب ہوتے بلا امتیاز عمر اسے بی بی کہہ کر پکارتے۔ اپنے ہم عمروں یا دوستوں سے بات کرتے تو دھیمے لہجے میں، بڑے پیار کے ساتھ مخاطب ہوتے۔ نہ کسی کی برائی کرتے نہ کسی کی برائی سنتے، اور نہ کسی کی بیخ کنی پر ہی آمادہ ہوتے گویا ان کا غیب و شہود حقیقت پسندی کا آئینہ دار تھا، ان کا ظاہر باطن یکساں نظر آتا تھا، ان کے اظہارِ ذات اور اظہارِ فن کی حدیں ایک دوسرے سے دور دور نہیں بلکہ باہم بغل گیر ہوتی نظر آتی تھیں۔ وہ صرف شاعر، ادیب یا دانشور ہی نہ تھے بلکہ ماہر علم نفسیات بھی تھے اور انسانی نفسیات اور کردار کے مختلف قسم کے عمل اور ردِ عمل کے تقاضوں سے آگاہی رکھتے تھے۔ اس موضوع پر انھوں نے تیس سے زیادہ کتابیں یا کتابچے لکھے ہیں۔ اس دور کے معروف ماہرینِ نفسیات مثلاً سگمنڈ فرائڈ، ایڈلر، کارل جنگ، ایلائی وٹزل اور جان راجنس کی نفسیات اور نظریات سے بھی وہ روشناس تھے اور اس کا عکس جابجا ان کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے دورانِ حیات کچھ نہیں تو پچاس ہزار سے زائد نفوس کو جو کسی نہ کسی نفسیاتی خلش یا الجھن میں مبتلا تھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور ان کی الجھنیں کسی نہ کسی عنوان دور کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح ان کی شاعری بھی کسی مخصوص سیاسی نقطۂ نظر یا شعوری نظریے کی تابع نظر نہیں آتی۔ بلکہ زندگی سے گہرے روابط کا اظہار کرتی ہے۔ ان کے قطعات آئے دن رونما ہونے والے کسی نہ کسی حادثے یا واقعے سے متعلق ہوتے تھے اور اس طرح ان کا ہر قطعہ ہماری تاریخ کا ایک ورق بن جاتا تھا۔ ایک قطعہ دیکھیے ۔

سرِ بازار چل رہی ہیں بسیں
بس کسی کا ذرا نہیں چلتا
نظر آتے ہیں ہر طرف مقتول
قاتلوں کا پتہ نہیں چلتا

غزل ہو یا نظم یا قطعہ رئیس صاحب ان سب کے ذریعے زندگی کے واقعات حادثات اور مسائل کا تجزیہ کرنا بخوبی جانتے تھے اور اس طرح علم نفسیات کی واقفیت نے ان کی پوری شاعری کو حقیقت افروز بنا دیا تھا۔

رائٹرز فورم کے زیر اہتمام پہلی اردو کانفرنس ٹورنٹو میں ۱۹ ستمبر کو منعقد ہونے والی تھی مگر رئیس صاحب دوسرے شرکائے کانفرنس کے ساتھ انگلستان ہوتے ہوئے ستمبر کے شروع میں نیویارک پہنچ گئے جہاں ان کا قیام ڈاکٹر سیفی کے یہاں تھا۔ وہاں کے ادبی جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کرنے کے بعد یہ قافلہ ۵ ستمبر کو مانٹریال پہنچا جو ان کے کینیڈا کے سفر کی پہلی منزل تھی۔ وہاں اس وقت نیشنل فیڈریشن آف پاکستانی کنیڈینز کا سالانہ کنونشن منعقد ہو رہا تھا۔ فیڈریشن اور باہر سے آنے والے شعراء کرام کی میزبانی مقامی پاکستانی انجمن کے سپرد تھی جس کے سربراہ اس وقت علی عباس حسنی تھے۔ پروگرام میں ایک شام موسیقی تھی اور ٹورنٹو کے معروف موسیقار شمیم خاں اپنے پورے گروپ کے ساتھ اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ دوسرے دن ایک مختصر سا سمپوزیم تھا جس میں جگن ناتھ آزاد، رئیس امروہوی، صہبا لکھنوی، محمد علی صدیقی اور پروفیسر حسن عابد مقررین کی صف میں شامل تھے اور شام کو محفل مشاعرہ تھی جس میں شریک ہونے کے لیے ٹورنٹو سے اعجاز بزمی، اشفاق حسین، عابد جعفری، اختر آصف، اطہر رضوی اور دو ایک اور صاحبان بھی پہنچ گئے تھے۔ فیڈریشن اور انجمن پاکستان کیوبک کی تقریبات میں شریک ہونے کے لیے اور مزید برآں اپنے عزیز دوست صہبا لکھنوی سے ملنے کے لیے میں بھی سڈبری سے وہاں پہنچ گیا تھا۔ ہر چند کہ اس وقت میری ایک آنکھ کا آپریشن ہوا تھا چنانچہ وہیں رئیس صاحب سے میری

تجدید ملاقات ہوئی۔

مانٹریال میں مشاعرہ ایک ہائی اسکول کے شاندار ہال میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت جگن ناتھ آزاد نے فرمائی اور نظامت کے فرائض انجمن کے سکریٹری ضمیر احمد نے انجام دیے۔ ابھی مشاعرہ شروع ہی ہوا تھا کہ اعلان ہوا کہ اوٹاوا سے شاہین بھی تشریف لے آئے ہیں۔ اس طرح اس بزم میں بین الاقوامی شہرت کے مالک شعراء کے علاوہ کینیڈا کی بھی نمائندگی بھرپور تھی۔ رئیس صاحب جو سب سے آخر میں مائیکروفون کے سامنے آئے تو مجمع کا تقاضہ تھا کہ قطعات سنائیں چنانچہ انھوں نے جی بھر کے اس رات مختلف واقعات اور حالات حاضرہ سے متعلق قطعات سنائے اور پھر جب تھک گئے تو دو ایک غزلیں سنا کر معذرت طلب کی۔ مجمع نے دل کھول کر داد دی اور واہ واہ کے نعروں سے بڑی دیر تک ہال گونجتا رہا۔ یہ حسنِ اتفاق تھا کہ اس محفل مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے عزیز حامد مدنی بھی تشریف لے آئے تھے جو خوش قسمتی سے ان دنوں کینیڈا میں اپنے چند دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

مشاعرے کے دوسرے دن میں واپس سڈبری چلا آیا۔ رئیس صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ چند دن اور مانٹریال میں ٹھیرے رہے اور پھر شاہین صاحب خود جاکر ان سب کو اپنے ساتھ اوٹاوا لے آئے اور جب تک ان حضرات کا قیام شاہین کے یہاں رہا ان کی بیگم روشن نے مجھے بتایا کہ ایسا لگتا تھا کہ میلہ لگا ہوا ہے۔ ہر وقت آنے جانے اور ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

اوٹاوا میں ابرار حسن کے مجموعے کی رونمائی ہوئی۔ اس کے علاوہ چند اور نشستیں منعقد ہوئیں پھر ایک بڑے پیمانے پر مشاعرے کا انعقاد ہوا اور اس کے بعد یہ قافلہ ٹورنٹو پہنچ گیا جہاں رئیس صاحب، صبیح الدین منصور مدیر "پاکیزہ انٹرنیشنل" کے یہاں مقیم ہوئے۔ صہبا لکھنوی مجھ سے ملنے کی غرض سے چند دن کے لیے سڈبری تشریف لے آئے اور پھر میں ان کو لے کر ۶ ستمبر ۱۹۸۰ء کو ٹورنٹو پہنچا۔ وہاں اسی شام کو ایک لائبریری کے ہال میں اختر احسن نے جو جوش اکیڈمی کے صدر ہیں اپنے ایک تالیف کردہ کتابچے "بیادِ جوش"

کی رونمائی کا انتظام کیا تھا اس کی صدارت صہبا لکھنوی نے کی اور بعد میں ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں مقامی شعرا کے علاوہ مہمان شعرا نے بھی اپنا کلام سنایا۔ اس کی صدارت رئیس صاحب نے فرمائی۔

دوسرے دن ۷؍ ستمبر کو سینیکا کالج (SENECA COLLEGE) کے ایک ہال میں بین الاقوامی مشاعرے کا اہتمام تھا جس میں شرکت کے لیے امریکہ سے بھی کئی شاعر اور شاعرات مثلاً ڈاکٹر اختر حسن، افتخار سحر، حمیرا رحمان، طلعت اشارت وغیرہم نے شرکت کی۔ یہ مشاعرہ ساڑھے نو بجے شروع ہو کر دو بجے رات تک جاری رہا۔ نظامت کے فرائض اشفاق حسین نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔

۸؍ ستمبر کو شہر کے مرکزی علاقے میں جو ہالی ڈے اِن ہے اس کے کنونشن ہال میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا اور وہیں رائٹرز فورم کی طرف سے دوپہر کے کھانے کا انتظام بھی تھا۔ اس کانفرنس میں رئیس صاحب نے جو مقالہ پیش کیا تھا، اس کا عنوان تھا "اردو اور بین الاقوامی زبانیں"۔ فاضل مصنف نے اس مضمون میں (جو بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوا) اردو اور دوسری زبانوں میں کس نوعیت کا رشتہ اور رابطہ ہے اس کی تشریح کی تھی اور یہ کہ اردو نے اپنے اصنافِ سخن اور اقسامِ ادب کی ترتیب و تدوین میں دوسری زبانوں کے ادبی اور فکری سرمائے سے کیا کیا فوائد اور کون کون سی مراعات حاصل کی ہیں ان کی بھی وضاحت کی تھی۔ مقالہ چونکہ نہایت بصیرت افروز اور معلوماتی تھا اس لیے بے حد پسند کیا گیا۔

ٹورنٹو کے بعد رئیس صاحب دوسرے مہمان شعرا اور ادبا کے ساتھ میڈ منٹن، ونی پیگ، وینکوور، لاس اینجلز، ہوسٹن (ٹیکساس)، بوسٹن، میامی، فلوریڈا، شکاگو، اور نیویارک ہوتے ہوئے کراچی لوٹ گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے اپنے سفر کی روداد سفرنامے کی صورت میں نہیں بلکہ نظرنامہ[1] کے عنوان سے قلمبند کی۔ ہر چند کہ اس "نظرنامے"

---

[1] یہ نظرنامہ "جائزہ" میں شائع ہوا۔ جائزہ اس وقت نیشنل فیڈریشن آف پاکستانی کینیڈینز کا خبرنامہ تھا۔
ملاحظہ ہو جائزہ، ۲ : ۳ (جون وجولائی ۱۹۹۶ء) صفحہ ۱۶-۱۷، ٹورنٹو، کینیڈا۔

میں سفرنامے کا شکوہ بھی ہے، مشاہدے کی وسعت بھی اور بیان کی لطافت بھی، مگر اس میں کہیں خود پسندی نظر آتی ہے نہ تنگ دلی یا تنگ نظری۔ نہ اپنے بارے میں رئیس صاحب نے مبالغے سے کام لیا ہے اور نہ اپنی بڑائی یا مقبولیت کی ڈینگیں ماری ہیں۔ سفرنامہ لکھنے کے لیے جو ایک علمی تبحر اور فکری بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ان کے پاس موجود تھی اس کے باوجود وہ محض سفرنامہ نہیں ہے بلکہ حقیقتاً نظرنامہ ہے۔ اس لیے کہ اس میں لائق مصنف نے دو مختلف اور متضاد تہذیبوں کا جائزہ لیا ہے اور ان کا موازنہ بھی کیا ہے۔ مشرقی اور مغربی طرزِ معاشرت میں جو فرق ہے اس کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ دونوں تمدنوں کے معاشی اور سیاسی نظام میں جو اختلاف ہے اس پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور اپنی ذات کے بارے میں بات کرنے کے بجائے اپنے دوستوں کا ذکر جو اس سفر میں ان کے ساتھ تھے نہایت فراخ دلی سے کیا ہے۔

سفیرِ پاکستان جناب الطاف شیخ نے باتوں باتوں میں رئیس صاحب کو بتلایا کہ اس وقت پینتالیس سے پچاس ہزار پاکستانی کینیڈا میں مقیم ہیں۔ یہ سن کر ان کو خوشی بھی ہوئی اور ملال بھی۔ چنانچہ اپنے جذبات کا اظہار "نظرنامے" میں اس انداز سے کرتے ہیں۔

"ان پاکستانیوں کے رہنے سہنے کا ڈھنگ، ان کے گھروں کی صفائی، ان کی بلند ہمتی اور سلیقہ مندی دیکھ کر جی خوش ہوگیا، مگر آنکھ سے آنسو بھی نکل پڑے۔ آہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ کاش پاکستان کو ایسے وسائل میسّر ہوتے کہ اپنے پردیسیوں کے لیے ترقّی اور خوشی کے مواقع فراہم کرسکتا۔ مڈل ایسٹ کی ریاستوں میں، جو پاکستانی گئے ہیں ان میں بیشتر تعداد محنت کش افراد کی ہے۔ وہ روزی کمانے گئے ہیں۔ جب تک ان کا رزق وہاں اُترا ہے وہیں رہیں گے، پھر واپس چلے آئیں گے، لیکن امریکہ اور کینیڈا کی

سرزمینوں کو پاکستان کے اعلیٰ تربیت یافتہ افراد۔ ڈاکٹرز
مختلف علوم کے پروفیسرز، ماہرین ٹیکنالوجی اور چنے ہوئے
نوجوانوں نے اپنا وطن ثانی قرار دے دیا ہے۔ بہت سوں
نے امریکی اور کینیڈین شہریت بھی حاصل کرلی ہے۔ یوں
کہنا چاہیے کہ ہماری فنّی مہارت، ہماری سائنسی بصیرت،
ہماری تحقیقاتی صلاحیت اور تخلیقی استعداد سے ہم نہیں
دوسرے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

یہ صدمہ تو ان کو تھا ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ دکھ بھی کھائے جا رہا تھا کہ "یاروں نے ان خوش حال، خوب صورت اور خرّم و خورسند زمینوں کو اپنی اقامت گاہ کے لیے منتخب تو کرلیا ہے، مگر ہمارے لوگ کس طرح ان سرزمینوں پر اپنی سماجی پہچان اور تہذیبی تشخّص کو برقرار رکھ سکیں گے۔ خیر یہ نسل تو کسی نہ کسی حد تک اپنی اصلیت کو برقرار رکھ سکے گی، لیکن جن بچّوں اور بچّیوں نے اس معاشرے میں آنکھیں کھولی ہیں۔ یہیں بچپن گزارا ہے۔ انھیں ملکوں میں تعلیم پائی ہے وہ اس طوفان میں کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے رہ سکیں گے۔"

ان کو یہ مستقل کوفت تھی اور یہ سوال برابر ان کے شعور اور لاشعور میں ابھرتا رہتا تھا کہ پاکستانیوں کے بچّے پل بڑھ کر کس حد تک پاکستانی رہ سکیں گے۔ اس سوال کا جواب نہ وہ خود دے پاتے تھے، اور نہ ہی دوسروں کے پاس اس کا کوئی تسلّی بخش جواب تھا" معاشی اور اقتصادی بہبودی اور بہتری کے لیے یہ مفارقت، یہ مسافرت کیوں؟"

وہ بار بار یہی سوچتے تھے۔ ان کا دماغ، ان کا دل، ان کی روح اس صورتحال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی اور سچ پوچھیے تو ہم میں کوئی بھی اس صورتِ حال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں اپنی شناخت کس طرح قائم رکھ سکیں گی۔ جس طرح رئیس صاحب اپنے جگر گوشوں کی جدائی پر تیار نہ تھے خصوصاً

وہ جو شمالی امریکہ میں آ کر بس گئے تھے۔ اسی طرح شاید ہم میں سے کوئی بھی تیار نہ ہو سکے گا، مگر ہمارے نزدیک اس ہجرت اور مسافرت کا ایک دوسرا سبب، ایک مختلف رُخ بھی ہے۔ ایک صحت مند رُخ، اک خوشنما رُخ اور خود رئیس صاحب کو بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں، چنانچہ آگے چل کر وہ خود ہی نظر نامے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

"واقعہ یہ ہے کہ ہمارے عزیزوں، دوستوں، ساتھیوں نے جس لگن، لگاؤ اور ذوق و شوق کے ساتھ اپنے تہذیبی نقوش، اپنے ادب، اپنی زبان، اپنی مذہبی اقدار اور اپنے سماجی کردار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اس کو دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ یہاں پاکستانیوں کے بہت سے ادبی، سماجی اور مذہبی ادارے اپنے اپنے دائروں میں جو کام کر رہے ہیں، کراچی، لاہور، پشاور، دلی، لکھنؤ، حیدرآباد دکن اور بمبئی میں بیٹھ کر اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ ان دوستوں کی جدوجہد، جہاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے ادبی اجتماعات، ان کے مشاعرے، ان کی سماجی سرگرمیاں، ان کی مذہبی تقاریب، ان کے میلے ٹھیلے، ان کے تہذیبی ہنگامے، غرض کہ ان کا ہر قدم اور ہر اقدام ہماری اجتماعی تاریخ کی شاہراہ پر سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے بہت سے تعلیم یافتہ اور ماہرینِ فن و علوم جو امریکہ اور کینیڈا میں امتیازی خدمات انجام دے رہے ہیں، انھوں نے اپنی انفرادی ضروریات کی تکمیل کے لیے جو کچھ ان ملکوں سے حاصل کیا ہے اس کا بیش بہا معاوضہ فنی خدمات کی صورت میں ادا کر دیا۔ یہ چیز ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔"

ہندوستان، پاکستان اور برطانیہ سے متعدد بار اور مختلف اوقات میں بہت سے ادیب، شاعر اور نقاد تشریف لائے مگر کسی نے کینیڈا یا امریکہ میں ہندوستانی اور پاکستانی خاندان کے لوگوں کی ضروریات، حالات اور مشکلات کا جائزہ اس طور پر نہیں لیا جیسا کہ رئیس صاحب نے لیا۔ اس لحاظ سے ہم کینیڈا میں بسنے والوں کے لیے ان کی شخصیت مختلف تھی۔ ان کی علمی بصیرت اور قوت مشاہدہ مختلف تھی اور ان کے احساسات کی شدت مختلف تھی۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ امریکہ اور کینیڈا کے تارکین وطن کی پہلی نسل اب تک کسی نہ کسی حد تک اپنے طرزِ زندگی کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہی ہے جو قابلِ ستائش ہے۔ ان کے مشاعروں، ادبی اجتماعات اور مذہبی تقاریب کا انعقاد اس گہرے پُرخلوص اور جذبات انگیز قوم پرستانہ رجحان کا ایک عظیم مظاہرہ ہے جس کو وہ اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔

یہ بات ذرا تکلیف دہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے آنے والے خاصے شعرا اور ادبا یہ تصور ساتھ لے کر آتے ہیں کہ کینیڈا یا امریکہ کے درختوں میں پھل یا پتوں کے بجائے ڈالر لگے ہوتے ہیں جن کو وہاں کے رہنے والے صبح اٹھ کر توڑ لیتے ہیں اور پھر بغیر کسی کام کاج کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کتنے ہی اصحاب برِصغیر سے آئے جنھوں نے آتے ہی ایک بھاری رقم نذرانے کی صورت میں طلب کی اور اگر وہ نہیں ملی تو ناراضگی کا اظہار کیا۔ بعض نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ان کو نذرانہ امریکی ڈالر کی شکل میں ادا کیا جائے، اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی شراب مہیا کی جائے، سگریٹ کا انبار لگا رہے، امریکی سامان کی ڈھیر سی خریداری کی جائے، سواری ہر وقت ان کے لیے موجود رہے اور ان کے میزبان اپنی تمام منصبی ذمے داریوں کو بالائے طاق رکھ کر ان کی خدمت میں لگے رہیں، کچھ اصحاب تو جب تک روزانہ ایک LONG DISTANCE CALL پاکستان نہ کرلیں ان کو کھانا ہی ہضم نہ ہوتا تھا، مگر رئیس صاحب ان تمام باتوں سے بے نیاز تھے۔ لالچ ان کی فطرت کا خاصہ نہ تھا۔ وہ صوفی منش اور فقیرانہ طبیعت کے مالک تھے۔ جہاں ٹھہرتے تھے میزبان پر بار نہ بنتے تھے۔

نہ کسی چیز کا جا یا بے جا مطالبہ کرتے تھے ۔ ٹورنٹو میں وہ اپنے دوست کے بیٹے صبیح الدین منصور کے پاس قیام فرما تھے اور اس گھر میں ان کو محل کی سی آسائش مہیا تھی ۔ ان کے مزاج کی سادگی نے سبھی کو متاثر کیا تھا ۔ ان کی جیسی خصوصیات مجھے صہبا لکھنوی، شاعر لکھنوی، ممتاز حسین اور دوسرے چند اور صاحبان میں بھی نظر آئیں ورنہ آنے والوں میں بیشتر تعداد ان لوگوں کی تھی جو رئیس صاحب کی ضد تھے ۔ ان کو یہ غم بھی نہ تھا کہ ان ممالک میں ان کی ملاقات کسی خالص امریکی یا کنیڈین سے نہیں ہوئی۔ جو ادیب اور شاعر اس سفر میں ان کے ساتھ تھے انھیں کا قرب ان کے لیے کافی تھا اور ان کا ذکر بار بار انھوں نے بڑی محبت کے ساتھ اس سفرنامے میں کیا ہے ۔ ان کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ان کے علاوہ صہبا بڑے التزام کے ساتھ قومی لباس پہنتے ہیں ۔ دو چار بار شان الحق حقی نے بھی یہی تکلف برتا پھر وہ کوٹ سوٹ میں آ گئے۔ کشور ناہید کا دوپٹہ پورے سفر میں ان کے سر پر رہا ۔ کئی بار انھوں نے زنانہ سوٹ بھی استعمال کیا۔ منیر نیازی شلوار، گھٹنوں تک کی قمیص اور کوٹ میں خوب بجتے تھے ۔ جب کبھی سیاہ رنگ کا سوٹ پہنتے تو اجنبی سے لگتے ۔ مجیب خیر آبادی سیاہ شیروانی میں جچتے تھے اور ان کی بیگم پاکستانی تہذیب کا نمونہ تھیں۔ حسن عابد باری باری شلوار قمیص اور کوٹ پتلون میں ملبوس رہے۔ لیکن صہبا اختر نے بڑے سے بڑے مجمع کا مقابلہ قمیص، پائجامہ اور شال جو کندھوں پر پڑی رہتی تھی اس سے کیا اور بقول رئیس صاحب ہر بار میدان ان کے ہاتھ رہا ۔ محمد علی صدیقی کی سادگی اور خوش طبعی ان کو بہت پسند آئی ۔ جگن ناتھ آزاد نے بھی لباس کی سادگی قائم رکھی ۔ احمد فراز اور افتخار عارف جو بعد میں شریکِ محفل ہوئے ہمیشہ قومی لباس یا شیروانی، پائجامے میں ملبوس نظر آئے اور اچھے لگے ۔ ان سب کا ذکر اس خوب صورتی اور فراخ دلی سے کرنے کے بعد خود اپنے بارے میں یہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"میرا حلیہ دیکھیے یعنی علی گڑھ تراش کی چھوٹی مہری کا پائجامہ
کڑھا ہوا کرتا، کالے رنگ کی شیروانی، سیاہ رنگ کا گلوبند

(مقلر) دیکھ کر بعض بلکہ اکثر لوگوں نے یہ رائے قائم
کی کہ یا تو یہ بزرگ ہندوستان کے کسی بڑے کلیسا
کے پادری ہیں یا کسی ٹوٹے پھوٹے رجواڑے کے آوارہ گرد
راجہ ہیں"

رئیس صاحب کا یہ سفر جو شبِ ہجر کی طرح دراز تھا اُن کو نہ جانے کہاں کہاں لے گیا، مگر دورانِ سفر جن ادب دوست حضرات کی مہمانی کی سعادت انھیں نصیب ہوئی ان کی گرمجوشانہ میزبانی کے نقوش اُن کے قلب پر ایک عرصے تک تاباں اور روح میں درخشاں رہے چنانچہ جو لوگ کینیڈا میں ان سے ملے ان کو رئیس صاحب کو سمجھنے اور پرکھنے میں دیر نہیں لگی۔ ان کے اندر کس قدر محبت چھپی ہوئی تھی، اور دل و نظر میں کس حد تک وسعت پوشیدہ تھی اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل امر نہ تھا اور یہی سبب ہے کہ یہاں کے لوگ آج بھی انھیں بڑی محبت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

رئیس صاحب دو سال بعد ۱۹۸۵ء میں دوبارہ جوش لٹریری سوسائٹی۔ کیلگری البرٹا کی دعوت پر بزم انصاری کے ساتھ تشریف لائے تھے اس کے سربراہ اقبال حیدر ہیں جنھوں نے جوش پر ایک گرانقدر کتاب "جوش اس صدی کا شاعر" مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں جن حضرات کے مضامین شامل ہیں ان میں راقم الحروف کے علاوہ ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر قمر رئیس، رئیس امروہوی، ڈاکٹر ڈیوڈ کارڈ، رائے نارن ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال حیدر کیلگری سے ایک پندرہ روزہ اخبار "آواز" بھی نکالتے ہیں۔ جوش لٹریری سوسائٹی کے علاوہ رائٹرز فورم نے فیض سمپوزیم کا بھی انتظام کیا تھا لہذا ان تقریبات میں انھوں نے شرکت کی۔

رئیس صاحب اور بزم انصاری ۵ ستمبر ۱۹۸۵ء کی سہ پہر کو وینکوور سے کیلگری پہنچے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ پچھلی بار وہ جب یہاں آئے تھے تو ستمبر ہی کا مہینہ تھا اور لگ بھگ وہی تاریخیں تھیں جو اس بار تھیں۔ البتہ جس دن وہ کیلگری پہنچے وہاں

برفباری ہوگئی اور سردی بھی شدت اختیار کرگئی۔ رئیس صاحب کا خیر مقدم کرنے کے لیے اقبال حیدر اور ان کے رفیق ارشد صاحب ایرپورٹ پر موجود تھے۔ اسی شام کو پانچ بجے میرا جہاز بھی وہاں پہنچنا تھا۔ اقبال حیدر کا خیال تھا کہ رئیس صاحب کو ساتھ لے کر وہ تھوڑی دیر کے لیے کسی چائے خانے میں بیٹھ جائیں گے اور گپ شپ کریں گے اور میرے وہاں پہنچنے کے بعد ایک ساتھ گھر کی جانب روانہ ہوں گے اس طرح وہ دوبارہ ایرپورٹ آنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔ مگر رئیس صاحب نے جو باہر برف کی سفید چادر کو بچھے دیکھا اور سردی کی شدت محسوس کی تو پریشان ہو کر کہنے لگے کہ "بھئی مجھے تو گھر لے چلو، ایک تو میں تھکا ہوا ہوں دوسرے سردی محسوس ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرلوں" چنانچہ اقبال حیدر ان دونوں صاحبان کو لے کر گھر پہنچ گئے، مگر جب وہاں سامان اتارنے لگے تو رئیس صاحب گھبرا کر بولے "ارے میرا بریف کیس کہاں ہے؟" پتہ چلا کہ وہ بستہ جس میں ان کی بیاضیں، کتابیں، پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات تھے وہ وہیں ایرپورٹ پر چھوڑ آئے۔ اقبال حیدر الٹے پیر ایرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر LOST AND FOUND کے دفتر جا کر معلوم کیا کہ کوئی بریف کیس تو کسی نے آکر جمع نہیں کرایا ہے۔ پتہ چلا کہ ہاں، ایک بریف کیس کوئی صاحب آکر دے گئے ہیں۔ پہچان کرانے کے بعد متعلقہ افسر نے وہ بستہ اقبال حیدر کے سپرد کر دیا۔ صرف یہ دریافت کیا کہ اس کے اندر جو کتابیں ہیں وہ کس زبان میں لکھی گئی ہیں اور ان کے مصنف متمنی سے کون صاحب ہیں۔ جن کی تصویر کتابوں کے سرورق پر موجود ہے۔ اقبال حیدر نے ساری تفصیل بتائی اور رئیس صاحب کے کیلگری آنے کی وجہ تسمیہ بھی بتائی۔ جب رئیس صاحب کو سارے واقعے کا پتہ چلا تو ان کے دل پر یہاں کے لوگوں کی دیانت داری اور احساس ذمے داری کا بڑا اثر ہوا اور ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ کاش پاکستان کے لوگ بھی ایسی ذمے داری کا مظاہرہ کر سکیں۔ تھوڑی دیر بعد جب میں بھی وہاں پہنچ گیا تو اقبال حیدر مجھے ساتھ لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے

رئیس صاحب ابھی سو رہے تھے ۔ تھوڑی دیر بعد منھ ہاتھ دھو کر بیٹھک میں آ گئے تو میں نے اس مرتبہ صحت کے اعتبار سے ان کو کسی قدر کمزور پایا ۔ وہ نحیف و نزار نظر آ رہے تھے ۔ نقاہت ان کے چہرے سے ٹپک رہی تھی ۔ انھیں دیکھ کر مجھے حمایت علی شاعر کے یہ شعر بے ساختہ یاد آ گئے ؎

اس بار وہ ملا تو عجب اس کا رنگ تھا
الفاظ میں ترنگ ، نہ لہجہ دبنگ تھا
اک سوچ تھی کہ بکھری ہوئی خال و خط میں تھی
اک درد تھا کہ جس کا شہید انگ انگ تھا

اس کمزوری کے باوجود رئیس صاحب کی گفتگو میں وہی تاب و توانائی تھی ۔ مزاج میں وہی شگفتگی ، طبیعت میں وہی زندہ دلی ، پہلے کی طرح وہ اب بھی باغ و بہار نظر آ رہے تھے ۔ اس بار انھوں نے اپنے پورے سفر کا حال سفرنامے کی صورت میں لکھا جو " پاکیزہ انٹرنیشنل " ٹورنٹو میں پندرہ قسطوں میں چھپا ۔ مجھے یقین ہے پاکستان میں بھی متعدد جگہ شائع ہوا ہو گا ۔

اس سفرنامے کی پانچ قسطوں میں انھوں نے کراچی سے انگلستان تک کے سفر کی روداد بیان کی ہے ۔ چھٹی قسط سے شمالی امریکہ کا تذکرہ شروع ہوا ہے ۔ لندن سے نیویارک وہ ۳۰ ؍ اگست ۱۹۸۵ء کو پہنچے تھے ۔ دوسرے دن پہلا مشاعرہ ظفر زیدی مرحوم کی یاد میں منعقد ہوا جس کی صدارت انھوں نے ہی کی ۔ ناظم مشاعرہ مامون ایمن سے وہ بہت متاثر نظر آتے تھے ۔ بیان کرتے ہیں کہ " وہ (مامون ایمن) انتہائی خوش گفتار اور غضب کے لفظ شناس ہیں ۔ ہلکی پھلکی زبان میں ایسی باتیں کر جاتے ہیں کہ ان پر سامعین کو پیار آنے لگتا ہے ۔ یہ باتیں وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں ہر انسان کے لیے محبت اور شفقت کوٹ کوٹ کر بھری ہو ۔ رئیس صاحب بلاشبہ سراپا محبت اور سرتاپا اخلاص تھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ مردم شناس بھی ۔

یکم ستمبر کو رئیس صاحب اور بزم انصاری دونوں صاحبان وینکوور کے لیے

روانہ ہوگئے اور یہیں سے کینیڈا کے سفر کا آغاز ہوا۔

وینکور میں رئیس صاحب کے بعض اعزا نے ایک رئیس اکیڈمی قائم کر رکھی ہے جو اکثر و بیشتر علمی اور ادبی تقریبات کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔ اس ادارے میں ان کو خیر کا ایک پہلو یہ بھی نظر آیا کہ "اب ہمارا کلچر، ہمارے رسم و رواج، ہمارا ادب، ہماری زبان ہماری مذہبی تقاریب جو پہلے صرف پاک و ہند تک محدود تھیں۔ اب یورپ، آسٹریلیا امریکہ اور کینیڈا تک پہنچ چکی ہیں۔ پہلے اردو کے مشاعرے ہمارے ملک تک محدود تھے، اب یہ مشاعرے نیویارک، ناروے[1]، بلجیم اور سویڈن میں بھی ہوتے ہیں۔" اردو کی ادبی محفلیں برِاعظم افریقہ، مارشس، چین، ہانگ کانگ، سیام اور خدا جانے کہاں کہاں منعقد ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ چین سے ایک پرچہ "آہنگِ نو" نکلتا ہے تو آسٹریلیا سے غالب۔

رئیس صاحب وینکور میں جب اپنے عزیزوں سے ملے تو مارے خوشی کے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ان سب کی جدائی ان کے لیے انتہائی غم انگیز تھی اور ان کی یادوں سے ان کا دل مستقل آباد تھا۔ جو لوگ ان سے بچھڑ گئے یا عارضی طور پر جدا ہوگئے ان کا صدمہ ان کو بری طرح کھائے جاتا تھا، مگر وہ پھر یہ سوچ کر دل کو بہلا لیتے تھے کہ اگر ان کے عزیزوں، دوستوں اور اردو کے پرستاروں نے ان دور دراز علاقوں میں اپنا ایک نیا گھر نہ بنایا ہوتا تو پھر کہاں کے مشاعرے، کہاں کے مذاکرے اور کہاں کی دینی تقریبیں۔ انھیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ شمالی امریکہ کے تقریباً ایک یا ایک سے زائد مسجدیں اور بعض جگہ امام باڑے بھی تعمیر ہو چکے ہیں۔ بہت سے شہروں میں ریڈیو

---

[1] ناروے سے اردو اخبار "کاروان" شائع ہوتا ہے۔ برطانیہ سے "نصرت"، "راوی"، "افکار" "فرشتل" اور کتنے ہی دوسرے پرچے نکلتے ہیں۔ سویڈن میں اردو کا پریس قائم ہے جو کئی کتابیں شائع کر چکا ہے۔ ٹورنٹو سے تو اتنے اردو کے اخبارات اور رسائل شائع ہوتے ہیں جتنے کراچی سے بھی نہیں شائع ہوتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ شمالی امریکہ کے متعدد شہروں سے کوئی نہ کوئی اردو کا پرچہ یا انگریزی کا جرنل اردو زبان میں نکلتا ہے۔

یا ٹی۔وی سے اسلامی پروگرام بھی نشر ہوتا ہے اور محرم کی تقاریب بھی اسی طرح منائی جاتی ہیں جس طرح ہندوستان یا پاکستان میں۔ رہ گیا یہ مسئلہ کہ آنے والی نسلیں بھی اسی نوعیت کی سرگرمیاں قائم رکھ سکیں گی یہ ایک بالکل جداگانہ سوال ہے اور جس کا کوئی تسلی بخش جواب فوری طور پر نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن پہلی نسل کے ہجرت کرنے والوں نے اپنی پہچان اور شناخت کے لیے جو اتنی ساری سرگرمیاں اور محفلوں کا انتظام کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں۔ اس سے رئیس صاحب پوری طرح متاثر نظر آتے تھے اور دوسرے اصحاب بھی۔

جوش لٹریری سوسائٹی کی جانب سے بین الاقوامی کانفرنس، ستمبر ۱۹۸۵ء کی شام کو البرٹا ووکیشنل سنٹر کے ایک شاندار آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت ڈاکٹر ڈیویڈ کارٹر (DR. DAVID CARTER) جو اس وقت البرٹا کے ایم۔ ایل۔ اے تھے اور ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں ان کا شمار رہتا تھا۔ وہاں کے اٹارنی جنرل رائے فارن بھی مقررین میں شامل تھے۔ دوسرے حصہ لینے والوں میں ماسوا پروفیسر ممتاز حسین وہ سارے اصحاب تھے جن کا ذکر اوپر کہیں آچکا ہے اور جن کے مضامین "JOSH! THE POET OF THIS CENTURY" میں شامل ہیں۔ البتہ شبیہ الحسن محمدی بدایونی جو اتفاق سے اس زمانے میں پاکستان سے آئے ہوئے تھے انھوں نے جوش کی مرثیہ نگاری پر روشنی ڈالی اور رئیس صاحب کے چونکہ جوش صاحب سے دیرینہ تعلقات اور شناسائی تھی لہذا انھوں نے عظیم المرتبت شاعر کی شخصیت کے حوالے سے بہت سی معلومات فراہم کیں اور ان کی بعض ایسی خوبیوں کے بارے میں اظہار خیال کیا جن کا علم اکثر لوگوں کو نہیں تھا۔

ڈاکٹر ڈیویڈ کارٹر کی تقریر کا عنوان "شاعری کی زبان" تھا جو انتہائی بصیرت افروز اور فکر انگیز تھا۔ ان کے علاوہ رائے فارن نے جوش کی عظمت کا اعتراف اپنی تقریر میں کیا اور پاکستانیوں کی تنظیمی اور تمدنی کاوشوں کو بھی بے حد سراہا۔ پاکستانیوں کی موجودگی نے کینیڈا کی ثقافتی زندگی میں کس قدر تنوع پیدا کر دیا ہے اس کا بھی اظہار کیا غرض کہ مجموعی طور پر جوش ملیح آبادی پر یہ سمپوزیم انتہائی کامیاب رہا۔

دوسرے دن محفل مشاعرہ تھی جس کے شرکا میں مقامی شعرا کے علاوہ کلثوم محمدی، جوش مندوزئی، جمال زبیری، عابد جعفری ٹورنٹو سے تشریف لے آئے تھے۔ پاکستان سے آنے والوں میں رضا ہمدانی، بزم انصاری اور رئیس صاحب تھے جو اس مشاعرے کے صدر بھی تھے۔ ہندوستان سے آنے والوں میں ڈاکٹر قمر رئیس ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ راقم الحروف نے بحیثیت شاعر اور مقرر دونوں پروگراموں میں حصہ لیا۔ رئیس صاحب نے جو غزل اس محفل میں سنائی وہ ان کی زندہ دلی اور خوش مزاجی کی عکاس تھی۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں ۔

من نگر جس کی جوت سے روشن
اے سکھی، چاند، ناسکھی چندن

بدلیاں کس طرف ہیں آج رواں
گوپیوں کا ہے دیس ہندرا بن

اک تصور سہی۔ مگر ہے تو
چاند کا روپ، چاندنی کا بدن

صبح چمکی، چمک اٹھا سورج
رات دمکی، دمک اٹھے ساجن

دونوں محفلیں بڑی پر لطف اور پرکشش تھیں اس کے بعد کیلگری کا پروگرام اختتام کو پہنچا۔ لیکن ابھی ان محفلوں کا خمار پوری طرح اترا بھی نہیں تھا کہ دوسرے دن ہم سب لوگ ڈاکٹر محمد تقی کی قیادت میں اقبال حیدر کے ساتھ ایڈمنٹن کے لیے روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر محمد تقی ان دنوں پاکستان کینیڈا ایسوسی ایشن، ایڈمنٹن کے صدر اور بعد میں نیشنل فیڈریشن آف پاکستانی کینیڈینز کے صدر دو سال کے لیے چنے گئے۔ صدر ایوب کے زمانے میں وہ کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج کے چیف ایڈمنسٹریٹر بھی رہ چکے تھے۔ وہ ایک علم دوست اور خوش طبع انسان ہیں اور بطور خاص ایڈمنٹن سے تشریف لائے تھے۔

کیلگری سے ایڈمنٹن کا فاصلہ تقریباً تین سو کلو میٹر ہے یہ سارا علاقہ انتہائی سرسبز اور سدا بہار قسم کا ہے۔ چند گھنٹوں کا یہ سفر خوش گپیوں میں گزر گیا۔ رئیس صاحب ایڈمنٹن پہلے بھی دو بار تشریف لا چکے تھے اور ان کا قیام بیگم پنڈت کے یہاں تھا۔ اس بار وہ ہم سب کے ساتھ اصغر علی صاحب کے یہاں ٹھہرے جو وہاں کسی اسکول میں ٹیچر ہیں نہانے دھونے کے بعد کھانا کھایا اور پھر ہم سب مشاعرہ گاہ کی طرف چل دیے۔

مشاعرے کا آغاز ڈاکٹر محمد نقی کی تقریر سے ہوا جنھوں نے مشاعرے کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی اور مشاعروں نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں جو رول ادا کیا ہے اس کی بھی وضاحت کی۔ ان کے بعد ڈاکٹر محمد حسن نے اردو زبان کی مقبولیت کا ذکر کیا جو روز بروز شمالی امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے بعد حسب معمول مشاعرے کا آغاز مقامی شعرا کے کلام سے ہوا اور باہر سے آئے ہوئے شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس مشاعرے کی صدارت رئیس صاحب نے کی اور نظامت کی خدمات محترمہ کشور قریشی نے انجام دیں جو خود بھی ایک اچھی شاعرہ ہیں۔

مشاعرے کے بعد میں اور ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر عبدالخالق کے مہمان ہوئے اور شب ان کے دولت کدے پر گزاری۔ ڈاکٹر خالق کینسر کے ماہر ہیں اور ایڈمنٹن میں انھوں نے پاکستانیوں کی تنظیم، اردو کی ترویج اور اسلامی تعلیمات کے انتظام میں جتنا حصہ لیا ہے اتنا کسی اور نے نہیں لیا۔

اس پورے سفر میں میں نے بزم انصاری اور رضا ہمدانی دونوں صاحبان کو بہت خاموش اور عزلت پسند پایا۔ دونوں بہت کم بولتے تھے، بہت کم گفتگو میں حصہ لیتے تھے، اور اگر کوئی سوال پوچھو تو اس کا مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتے تھے۔

دوسرے دن میں اور ڈاکٹر محمد حسن سڈبری کے لیے ہوائی جہاز سے روانہ ہو گئے اور رئیس صاحب دوسرے ساتھیوں کے ساتھ واپس کیلگری گئے اور پھر ایک دن قیام کے بعد وہاں کے سب سے خوب صورت علاقہ بینف (BANFF) دیکھنے چلے گئے۔ JASPER اور BANFF سے ROCKY MOUNTAIN کی سرحد شروع ہو جاتی

ہے اور نیاگرا فالز کے بعد یہ دوسرا حسین ترین کینیڈا کا علاقہ ہے۔ ڈاکٹر ژواگو (ZHIVAGO) کی زیادہ تر شوٹنگ اسی علاقے میں ہوئی۔ کوئی شخص کیلگری جائے اور پھر بینف جاکر نہ دیکھے تو یہ ایسی بات ہوگی جیسے کوئی مصر جائے اور اہرام نہ دیکھے۔

رئیس صاحب بینف دیکھنے کے بعد ونی پیگ میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں شرکت کی غرض سے چلے گئے۔ ایک مزے کی بات یہ تھی کہ جس دن وہ ونی پیگ پہنچے وہ ان کے اکہترویں سال کا آخری دن تھا اور دوسرے دن سے بہترواں سال شروع ہونے والا تھا۔ یاروں کو اس کی بھنک پڑ گئی لہٰذا دوست محمد مغل جو پاکستانی انجمن کے صدر تھے اور رئیس صاحب کے میزبان انھوں نے ایک SURPRISE PARTY کا انتظام کیا اور رئیس صاحب کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ اس قسم کی پارٹیاں کینیڈا کی تہذیب کا ایک خاص جزو ہیں۔ جس کی سالگرہ یا WEDDING ANNIVERSARY ہوتی ہے اس کو بے خبر رکھتے ہیں اور تمام دوست، احباب اور اعزا مل کر دعوت کا انتظام چپکے چپکے چھپ چھپ کر کرتے ہیں۔ جس گھر میں اس کا انتظام ہوتا ہے اس کے سارے کمروں کی روشنیاں گل کر دی جاتی ہیں اور جب مہمان خصوصی وہاں پہنچتا ہے تو پھر ساری روشنیاں جلاکر کمروں کو بقعۂ نور بنا دیا جاتا ہے اور شرکائے محفل SURPRISE - SURPRISE کا نعرہ لگاتے ہیں اور ہیپی برتھ ڈے کا گیت گاتے ہیں۔ یہی سب کچھ مغل صاحب نے رئیس صاحب کے ساتھ کیا۔ کمرے کو تاریک کر دیا گیا تھا اور رئیس صاحب کو خریداری کے لیے بازار بھیج دیا گیا تھا۔ شمعوں کا معقول انتظام تھا۔ میزیں سجا دی گئی تھیں۔ کیک خاص طور پر بنایا گیا تھا جس پر HAPPY BURTHDAY RAEES لکھا ہوا تھا اور بہتّر سال لکھا ہوا تھا۔ رئیس صاحب نے جو اپنی سالگرہ کا ایسا مخلصانہ اہتمام دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس سالگرہ کی خوشی میں شریک ہونے والوں میں عرفانہ عزیز بھی تھیں جو ونی پیگ میں اپنے شوہر لئیق صاحب کے ساتھ رہتی ہیں۔ لئیق صاحب خود ایک کالج کے پرنسپل ہیں اور عرفانہ

بقول رئیس صاحب ان کی پرانی شاگردہ ہیں۔ احمد فراز بھی آگئے تھے۔ رئیس صاحب نے رقت آمیز لہجے میں اپنے میزبان اور تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ غرض کہ خاصا جشن رہا۔

ونی پیگ میں مشاعرے سے قبل ایک مذاکرہ فیض احمد فیض پر منعقد ہوا جس میں رئیس صاحب نے ان کی جلاوطنی کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر قمر رئیس، احمد فراز اور رضا ہمدانی نے بھی فیض کی شخصیت اور شاعری کے تعلق سے پُرمغز تقاریر کیں۔ مقامی ریڈیو اسٹیشن سے فیض سمپوزیم کے لیے وقت کا تعین (معاوضے) پر کرلیا گیا تھا۔ اس طرح سارا PROGRAMME LIVE ریڈیو سے نشر ہوا۔ اس مذاکرے کی MODERATOR عرفانہ تھیں اور تقاریر کے بعد شعرخوانی کا سلسلہ شروع ہوا جو دو بجے رات تک جاری رہا۔

ونی پیگ کے بعد یہ سارا قافلہ ٹورنٹو کے لیے روانہ ہوگیا۔ کینیڈا کے تمام شہروں کے مقابلے میں ٹورنٹو رئیس صاحب کو بہت عزیز تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو وہ خود لکھتے ہیں "ایسا لگا جیسے گھر آگئے ہیں" اس شہر میں ان کو بالکل اجنبیت نہیں لگتی تھی اور سارا ماحول کراچی جیسا نظر آتا تھا۔ منصور صاحب کے گھر میں ان کو اتنا ہی سکون و آرام ملتا تھا جتنا کہ خود اپنے گھر میں۔ سفرنامے میں وہ رقمطراز ہیں "جس طرح منزلیں مارتا ہوا اونٹ سرائے کے دروازے پر پہنچ کر نڈھال ہوجاتا ہے اسی طرح میرا اور بزم تھصاری کا حال صبیح الدین منصور کی قیام گاہ پر پہنچ کر ہوا۔"

۱۴ ستمبر کی شام کو فیض صاحب کی یاد میں محفل مشاعرہ ONTARIO INSTITUTE OF STUDIES IN EDUCATION کے ہال میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت اختر الایمان صاحب نے فرمائی۔ ناظم مشاعرہ اشفاق حسین تھے۔ میں اور ڈاکٹر محمد حسن سڈبری سے ٹورنٹو کے لیے چونکہ اسی دن روانہ ہوئے تھے لہٰذا مشاعرے میں ذرا تاخیر سے پہنچے۔ احمد فراز کے علاوہ زہرہ نگاہ لندن سے تشریف لائی تھیں۔ بانو قدسیہ، اشفاق احمد پاکستان سے اور ڈاکٹر شارب ردولوی ہندوستان

سے آکر شریک محفل ہوئے تھے۔ اتنے بہت سے شاعروں کی موجودگی نے اس محفل شعر و سخن میں چار چاند لگا دیے تھے۔

دوسرے دن رائل پارک ہوٹل میں فیض سمپوزیم کا اہتمام رائٹرز فورم کے اراکین نے کیا تھا۔ افسوس ہے کہ اس محفل میں اختر الایمان، رئیس اور بزم انصاری شریک نہ ہو سکے کیوں کہ ان کو صبح ہی صبح شکاگو کے لیے روانہ ہونا تھا جہاں اختر الایمان کی سالگرہ منانے کا انتظام تھا اور امیر خسرو کے تعلق سے کئی اور تقاریب کا بھی اہتمام امیر خسرو سوسائٹی نے کیا تھا۔

فیض سمپوزیم دو نشستوں پر مشتمل تھا۔ پہلی نشست کی صدارت احمد فراز نے کی۔ مقررین میں ڈاکٹر محمد حسن، زہرہ نگاہ، ڈاکٹر شارب ردولوی اور اشفاق احمد شامل تھے۔ دوسری نشست کی صدارت ڈاکٹر محمد حسن کے سپرد تھی اور مقررین میں ڈاکٹر قمر رئیس، بانو قدسیہ اور راقم الحروف شامل تھے۔ آغاز سید خورشید عالم کی تقریر سے ہوا جنھوں نے مقررین اور سامعین کو خوش آمدید کہا اور فیض صاحب کی ٹریڈ یونینسٹ سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔

مذاکرے کے بعد بزم مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر شارب ردولوی نے کی اور نظامت خورشید عالم صاحب نے۔ شعرا میں مقامی حضرات بھی شامل تھے۔

دوسرے دن محمد حسن بھی شکاگو کے لیے روانہ ہو گئے اور میں واپس سڈبری چلا آیا باقی حضرات ٹورنٹو ہی میں رک گئے اور نیاگرا فالز وغیرہ دیکھنے کے پروگرام بنانے لگے۔

شکاگو میں رئیس صاحب کے کئی عزیز و اقارب سکونت پذیر ہو چکے ہیں۔ ان سب سے مل کر ان کا دل پھر بھر آیا اور ایک بار پھر مغموم و ملول ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ خاندانوں کے شیرازے اس طرح منتشر ہو جائیں گے یہ تصور کتنا دردناک ہے۔

شکاگو میں اختر عالم صاحب نے جو ایک معروف جرنلسٹ اور کالم نگار ہیں۔ رئیس اور بزم انصاری صاحبان کا انٹرویو لیا اور دوران گفتگو ایک سوال یہ بھی پوچھا کہ رئیس

صاحب آپ نے قطعہ کہنا کب سے شروع کیا اور اس کا آغاز کیوں کر ہوا ؟ رئیس صاحب کا جواب سادہ سا تھا: صحافت میں آنے کے بعد اپنے جذبات کے اظہار کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہ تھا لہٰذا ۱۵ جنوری ۱۹۵۴ء سے قطعات لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا اور سینتیس سال سے جاری ہے۔ دورانِ گفتگو بزم انصاری صاحب نے اس بات کا انکشاف کیا کہ پاکستان میں منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے اور اس وقت پندرہ سے بیس لاکھ افراد اس کے عادی ہو چکے ہیں، ان میں زیادہ تر نوجوان نسل کے افراد ہیں۔

شکاگو کے قیام کے دوران محرم کا مہینہ شروع ہو گیا۔ رئیس صاحب کی بھتیجی نے عزاداری کا انتظام کیا کیوں کہ عزاداری ان کے خاندان کی روایت ہے اور اس روایت کی تکمیل میں ان کے خاندان کے سارے افراد بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں اتفاق دیکھیے کہ پہلی محرم کی شام کو ایک ہوٹل میں اختر الایمان کی سترویں سالگرہ منائی گئی جس میں ماسوا چودھری محمد نعیم صدر شعبۂ اردو شکاگو یونیورسٹی اور ڈاکٹر اسد حسین پروفیسر سیاسیات، الے نوائے یونیورسٹی (ILLINOIS UNIVERSITY)۔ چالیس پینتالیس حضرات نے شرکت کی۔ ڈاکٹر محمد حسن اور رئیس صاحب نے اختر الایمان کی زندگی کے کئی ورق الٹے اور ان کی شاعری اور زندگی کے بارے میں اظہار رائے کیا۔

دوسرے دن ڈاکٹر حبیب احمد صدر امیر خسرو سوسائٹی نے خسرو سیمینار کا انتظام کیا۔ اس میں ایک مضمون بزم انصاری صاحب نے بھی پیش کیا۔ رئیس صاحب نے بھی تقریر کی، مگر ڈاکٹر محمد حسن کی خسرو پر تقریر یادگار قسم کی تھی۔ گیارہ بجے رات تک یہ محفل جاری رہی۔ دوسرے دن رئیس صاحب اور بزم انصاری ٹورنٹو کے لیے عازم سفر ہو گئے اور حسب سابق صبیح الدین کے ہاں قیام فرمایا۔ ایک طرح سے گھر واپس آ گئے۔

سفر کی طوالت نے رئیس صاحب کی صحت پر مضر اثر ڈالا۔ دوران سفر جلد جلد آب و ہوا بدلنے کی وجہ سے دمے کی تکلیف فزوں تر ہو گئی۔ طبیعت میں اضمحلال آ گیا، اور واپسی کے لیے دل مچلنے لگا۔ بہرحال کینیڈا کو خیرباد کہنے سے پیشتر نیاگرا فالز دوبارہ

جا کر دیکھا۔ محفلِ شاہ خراساں میں بھی شرکت کی اور پھر بفیلو (BUFFALO) ایرپورٹ سے جہاز کے ذریعے نیویارک پہنچ گئے۔ وہاں ان کے بعض اعزا اور بزم انصاری کی صاحبزادی پروین قیصر پیشوائی کے لیے موجود تھیں۔ رئیس صاحب نے قیام اپنی بیٹی کے گھر نیوجرسی میں کیا۔ کھانسی کی تکلیف خاصی بڑھ گئی تھی۔ کمزوری کا غلبہ بھی تھا۔ اس لیے عزاداری کی مجالس میں شرکت نہ کر سکے۔ البتہ یوسف ہارون سابق گورنر سندھ اور معروف سیاست داں سے ملاقات ضروری سمجھی۔

۸ ستمبر کو لندن میں انھیں ایک اجتماع میں شرکت کرنا تھا۔ ہر چند کہ موسم انتہائی ناخوشگوار تھا اور بہت سی پروازیں کینسل کر دی گئی تھیں مگر خدا کا شکر ہے کہ رئیس صاحب کا جہاز نیویارک سے روانہ ہو کر بخیر و عافیت لندن کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا۔ اس طرح وہ سفر ۲۸ جولائی کو شروع ہوا تھا پورے دو مہینے کے بعد اختتام کو پہنچا۔

بیٹی اور نواسے، نواسیوں سے رخصت ہوتے وقت ان کا دل بھاری تھا، دماغ پر بھی بوجھ تھا، جدائی کا مرحلہ بھی درپیش تھا اور طبیعت الگ ناساز تھی۔ بہرحال وہ شمالی امریکہ سے آخری بار با دلِ نخواستہ رخصت ہوئے۔

رئیس امروہوی بڑے مرنجان مرنج قسم کے انسان تھے۔ ان کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ ان کے اندر دجانے کتنے رنگ چھپے ہوئے تھے۔ ان کی ذات ایک قوسِ قزح کی طرح تھی جس میں سات رنگ مل کر ایک مخصوص رنگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ نئی اور پرانی اقدار کا سنگم تھے۔ قدیم و جدید کا حسین امتزاج۔ وہ لطیف احساسات کے مالک تھے اور نکھرے ستھرے ذوق کے علمبردار۔ وہ اپنی ننھی سی ذات میں ایک مکمل ادارہ تھے۔ کینیڈا والے ان کو اتنا کچھ دیکھنے کے باوجود پوری طرح نہ دیکھ پائے نہ مل پائے۔ یہ تشنگی باقی ہے اور اب یہ تشنگی

ہمیشہ ہی باقی رہے گی چونکہ وہ اب یہاں کبھی نہ آسکیں گے اور ہم لوگ جو اردو کی شمع اس دیارِ غیر میں روشن رکھنے کے لیے تن، من، دھن سے لگے ہوئے ہیں رئیس صاحب کی یاد میں سال بہ سال مذاکرے، مشاعرے اور ادبی اجتماعات کا اہتمام کرتے رہیں گے اور یہ شعر پڑھتے رہیں گے ؎

عجیب لطف ہوا، ان کی یاد سے محسوس
کہ جیسے دل کے دریچے کھلے، ہوا آئی

(سڈبری، کینیڈا سے)

○

اصغر ندیم سیّد

مرحوم رئیس امروہوی سے متعلق لکھنا میرے لیے سعادت ہے۔ محترم رئیس امروہوی پاکستانی تہذیب کا ایک منہ بولتا ثبوت تھے۔ علم و ادب کا کون سا شعبہ ہے جو ان سے پوشیدہ تھا۔ وہ تو علم و ادب و فنونِ لطیفہ کے شناور تھے۔ ایسا ہمہ جہت شخص صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ قطعہ نگاری کے امام سمجھے جاتے ہیں، لیکن وہ میرے نزدیک شاعری کے بھی امام ہیں۔

سیّد انیس شاہ جیلانی

میں نے رئیس امروہوی کا نام کبھی نہیں لیا۔ جب بھی زبان پر آیا امروہوی صاحب ہی آیا۔ ہمارے محمد آبادی حلقے میں وہ امروہوی صاحب ہی کے نام سے متعارف ہُے، امروہوی صاحب آ گئے، امروہوی صاحب کا قطعہ، امروہوی صاحب نے یہ کہا، امروہوی صاحب یوں ملے۔ امروہوی امروہوی سُن سُن کر کہنے لگے یار یہ تم لوگ میرا نام کیوں نہیں لیتے۔ ہم نے کہا، امروہوی سے مراد کوئی اور تو ہو نہیں سکتا، ہر طرف آپ ہی آپ ہیں، رئیس ہی رئیس۔ کسی اور کا گزر ہی کیوں ہو!

مجھے اگر لکھنا آ جائے تو رئیس امروہوی کے عنوان سے ایک ہزار صفحے تو اکیلے میں ہی گھسیٹ دوں۔ رئیس امروہوی "جنگ" میں لکھتے لکھتے جنگجو ہو گئے تھے۔ قریب قریب زندگی بھر وہ چومکھی لڑتے رہے۔ کم و بیش ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی بلکہ زور آزمائی، اجارہ پیمائی کی۔ کوئی میدان ہو ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ وہ کہیں پیچھے نہیں رہے۔ سرخرو نکلنے کا فیصلہ مستقبل بعید پر چھوڑنا تو پڑے گا۔ یہ خصوصیت خداداد تھی۔ کہنا چاہیے طبیعت کا اُبال ہی ایسا تھا مزاج کی اٹھان ہی ایسی تھی۔ وہ گویا اپنے بس میں نہیں رہتے تھے۔ ایک ذرا چھیڑنے کی دیر تھی۔ نہایت اَدق زمینوں میں ایک سے بڑھ کر ایک شعر انھوں نے نکالے۔ بالکل انبار لگا دیے۔ جکڑ بند، پکڑ بند، جھنگڑ بند تک کو بخشا نہیں اور اس کے لیے ہمارے حسابوں چلی ہوئی ترکیب یہی ہے، وہی انگوٹھی میں نگینے والی۔ مثنوی اگر سامنے ہے تو رہوار قلم کا چل نکلنا یوں جانیے اور تو کوئی کام حضرت نے کبھی کیا ہی نہ تھا۔ یہ محسوس ہو جیسے مرزا شوق کے چرنوں میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ وہ خود بھی اس کی تعریف اور توصیف سے نہیں چوکتے تھے، یاروں نے ایوب خاں تک کے قصیدے ان سے لکھوائے اور اپنے نام ڈال کر پڑھے۔ جمیل الدین عالی وغیرہ نے اس حد تک گھیر لیا تھا۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے لہٰذا ان سے ملنے کی حد تک آمادہ ہو گئے تھے، تاہم وہ یہ بھی کہتے تھے۔ میاں سچی بات تو یوں ہے کہ ؎

کسی مردود کے دولت کدے پر — عقیدت پیش کرنے جا رہا ہوں
مجھے ٹوکیں نہ اربابِ ملامت — گدھا ہوں گھاس چرنے جا رہا ہوں

● خراجِ عقیدت

● نذرانے

برزم انصاری

قطعہ تاریخ وفات[1] حضرت رئیس امروہوی

زہے وہ موت کہ جس موت کا یہ عالم ہو
ہر ایک سینہ ہو بریاں، ہر آنکھ پُر نم ہو
کسے نصیب ہوا بزؔم مرتبہ ایسا
کہ شہر شہر رئیس قلم کا ماتم ہو

شان الحق حقی

قطعۂ تاریخ وفات

جناب رئیس امروہوی مرحوم

چھپ گئی شکل نظر سے وہی دیکھی بھالی
آنکھ اٹھاؤں تو نظر آتی ہے دنیا خالی

سو گیا خاک میں وہ بلاغ سخن کا مالی
سو گئے جس کے نگوں سار ہے ڈالی ڈالی

حیف ہو وار شقاوت کا اُس پر جس نے
دشمنی کی تھی کسی سے نہ عداوت پالی

وہ جسے کام رہا مہر و محبت سے سدا
جس کا دل بغض و کدورت سے تھا یکسر خالی

ناملائم کبھی کیا اس سے کسی نے جو کلام
وہ مکدر نہ ہوا بات ہنسی میں ٹالی

ناسزا اُس کے لبوں کو کبھی چھو کر نہ گیا
ناروا سے نہ ملوث ہوئی طبع عالی

---

[1] یہ قطعہ رئیس کے لوحِ مزار پر کندہ ہے۔

اک عجب شان کی میراث سخن چھوڑ گیا
اک عجب ٹھاٹھ کی تاریخ رقم کر ڈالی

اس کے قطعات سے قطرات سرشک خونیں
گو ر چاٹتے رہے آنکھوں میں سدا ہریالی

جی گھڑی بھر کو نہ بہلا تھا کہ آئی دل میں
یاد پھر اس کی، وہی دل سے نہ جانے والی

سال رحلت ہوا اک نالۂ جانکاہ کے ساتھ
"وا رئیس الشعرا! مصر سخن کا والی"

۱۹۸۸ء

راغب مراد آبادی

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات

حضرت رئیس امروہوی (نوراللہ مرقدہٗ)

ان کا اک اک قطعہ تھا آئینۂ حالات دہر
قارئین "جنگ" کا تھے دل رئیس امروہوی

جانب دار البقا دنیائے فانی سے گئے
صاحب حق، شاعر کامل رئیس امروہوی

۱۴۰۹ ہجری

محشر بدایونی

قطعۂ تاریخ

وفات حضرت رئیس امروہوی

صحافت و ادب کی مملکت پہ آج
محیط رنج فرقت رئیس ہے

صدا یہ آرہی ہے گوش قلب میں
جناں مقام حضرت رئیس ہے

۱۹۸۸ء

ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی

رئیس امروہوی موصوف کیا خوب

۱۴۰۹ھ

اے رئیس امروہوی اے سر کردہ نکتہ داں
نکتہ بین و نکتہ سنج و شاعر معجز بیاں

تجھ کو قدرت نے عطا کی تھی ذہانت بے حساب
معترف ہیں قابلیت کے تری پیر و جواں

نثر ہو یا نظم دونوں ہی پہ تھا یکساں عبور
تیرے فیضِ کلک سے ان کو ملیں شادابیاں

قطعہ گوئی میں تو تیرا کوئی ثانی ہی نہیں
بند کوزے میں کیا کرتا تھا بحرِ بیکراں

زود گوئی میں بھی تھا بے مثل کوئی شک نہیں
گونگے لفظوں کو عطا کرتا تھا تو بے شک زباں

مصحفی کے بعد امروہہ کا تجھ سے نام ہے
تو نے دی تھی مصحفی کے بعد اس کو عزّ و شاں

باتوں باتوں میں پتے کی بات کہہ جاتا تھا تو
باتوں باتوں میں عیاں کرتا تھا تو سرِّ نہاں

تیرے قاری اب کہاں پائیں گے وہ طنز و مزاح
کیسے سن سکتے ہیں اب وہ تیری پاکیزہ زباں

بعد تیرے "جنگ" میں ایسے قطعے لکھے گا کون
بعد تیرے دوسرا اس شان کا شاعر کہاں

ہاں وہ نواب لچھے مرزا تیرا کردارِ لطیف
ایسی تحریرِ شگفتہ کون لکھے گا یہاں

کی قلمبند گفتگو بقراط اور سقراط کی

فلسفہ دانی تری ہوتی تھی اس سے بھی عیاں

نفسیات و مسمریزم میں بھی تجھ کو درک تھا

ان علوم خاص میں بھی تو رہا عنبر فشاں

فکر مرگِ شاعرِ امروہہ خاور کیجیے

عیسوی اور ہجری دونوں سنہ میں ہوں رطب اللساں

عیسوی میں لکھیے "غم" کے ساتھ "شرحِ شوقِ دل"

۱۰۴۰ + ۹۴۸ = ۱۹۸۸ء

ہجری سنہ میں "ہے رئیس چرخِ دوراں بے زباں"

۱۴۰۹ھ

لکھا خاور نے تجھے "آسودہ دل مرحوم شد"

۱۴۰۹ھ

"اے رئیس امروہوی بابِ جشم تو ہے کہاں"

۱۴۰۹ھ

"سوگوار رئیس کامل ذہن"

۱۴۰۹ھ

خورشید خاور امروہوی

۲۳ ستمبر ۱۹۸۸ء مطابق ۱۰ صفر ۱۴۰۹ھ بروز جمعہ

حفیظ شاہد

قطعۂ تاریخ وفات رئیس امروہوی

تیری جدائی ہے غضب، سیّد رئیس امروہوی

ہم کو ہوا معلوم اب، سیّد رئیس امروہوی

اپنوں سے ناتا توڑ کر کیوں چل دیے ہو چھوڑ کر

یہ کوچۂ علم و ادب، سیّد رئیس امروہوی

دل لاکھ روئے گا مگر ہم سے نہ ملنے آؤ گے

بچھڑے ہوئے ملتے ہیں کب، سیّد رئیس امروہوی

اے شاعرِ جنّت مکاں، دل پر ہے بارِ گراں
یہ زندگی کے روز و شب، سیّد رئیس امروہوی
اے شاہِ اقلیمِ سخن، اے آبروئے فکر و فن
کرتے ہیں تجھ کو یاد سب، سیّد رئیس امروہوی
اک شامِ غم میں کھو گئے، تو کیا گیا ہم ہو گئے
بیگانۂ صبحِ طرب، سیّد رئیس امروہوی
بے وقت رحلت پر تری، تاریخ شاہد نے کہی
ہے ویراں اب شہرِ ادب، سیّد رئیس امروہوی

۱۴۰۹ھ

عروج زیدی

بیادِ رئیس امروہوی

اے کراچی! اے دیارِ کشتگانِ اہلِ دل
تیرے گلشن سے گئی فصلِ رئیس امروہوی
ہائے اے اردو زباں کیا کہہ کر روئے گی اسے
تجھ پہ اک مدّت سے تھا فضلِ رئیس امروہوی
کیا ہوا تیری حمیّت کو بتا اے خاکِ سندھ
پوچھتا ہے تجھ سے یہ قتلِ رئیس امروہوی
ساکنانِ ارضِ جنّت سے یہ ہاتف نے کہا
ہاں مبارک ہو تمہیں وصلِ رئیس امروہوی
خدمتِ لوح و قلم اور خدمتِ اہلِ قلم
تا دمِ آخر رہا شغلِ رئیس امروہوی
کٹ گئی شعر و سخن کے سر پہ تاریخِ مرگ
۱۴۰۹ھ
ماتمِ لوح و قلم قتلِ رئیس امروہوی

لالہ و گل میں نمایاں ہو تو ہو ورنہ عرقیؔ
اب کہاں ہم اور کہاں نخلِ رئیسؔ امروہوی

(کنیڈا ۔ سے)

ظہیر نفسی

قطعات

حضرت رئیسؔ امروہوی کی یاد میں

شہید راہِ حقیقت رئیسؔ امروہوی
قتیل رسمِ شہادت رئیسؔ امروہوی
مسیح و سرمد و سقراط و اہلِ حق کی قسم
ذبیحِ حرفِ صداقت رئیسؔ امروہوی

امیر خسرو و سوداؔ ، نظیرؔ و جوشؔ و رئیسؔ
یہ پانچ ہند نے پیدا کیے عجیب شعراء
دماغ ان کے اگر تھے عمر و کی سی زنبیل
تو ان کی شاعری گویا طلسم ہوشربا

لسان قوم و وطن اور خطیبِ شہر رئیسؔ
زبانِ خلقِ خدا اور نقیبِ شہر رئیسؔ
رہا ہمیشہ سخن ہائے گفتنی کے لیے
رہین گوشِ زباں داں غریبِ شہر رئیسؔ

۱۹۸۸ء

مسلم غازی

ہوگئی نذرِ خزاں آخر بہارِ مختصر

حضرت رئیس امروہوی کی یاد میں

اے رئیس نکتہ داں اے صاحبِ علم و ہنر
تیری پروازِ تخیل شامِ تیرہ کی سحر
تو یقیناً دہر کے کمیاب انسانوں میں تھا
قتل سے تیرے ہوئی بزمِ ادب زیر و زبر
تیری فکرِ اوج پیما سے رہی رفعت بھی زیر
تیری تحریریں ادب میں حاصلِ فکر و نظر
ہوگیا رخصت جہاں سے بادشاہ نثر و نظم
اک اداسی شہرِ فن کے ہے در و دیوار پر
مل گیا اک گوہرِ نایاب غازی خاک میں
ہوگئی نذرِ خزاں آخر بہارِ مختصر!

موت پر "میرِ سخن" کی بڑھ کے ہاتف نے کہا
سالِ رحلت "موشگاف و حاملِ فکر و نظر"

۱۹۸۸ء

سید قدرت نقوی

قطعہ

بر وفاتِ حسرت آیات حضرت رئیس امروہوی

علم و ادب کی شان تھی خدمت رئیس کی
قطعاتِ یومیہ میں تھی شہرت رئیس کی
بزمِ سخن کی شمع فروزاں تھے آہ! وہ
اک تازہ غم ادب میں ہے رحلت رئیس کی

راغب مرادآبادی

یادِ رئیس

نامِ نامی جس کا ہے راغب! رئیس امروہوی
میری نظروں میں تھا دنیائے ادب کا تاجدار

فن میں، نثر و نظم کے، حاصل تھی یکتائی اسے
ایک اک صنفِ سخن تھی اس کے زیرِ اقتدار
امتیازِ رنگ و نسل اس کی نظر میں ہیچ تھا
نوعِ انسانی کی خدمت ہی رہا اس کا شعار
مال و دولت جمع کرنے کی اسے خواہش نہ تھی
فقر اثاثہ اس کا، سرمایہ تھا عجز و انکسار
اس قدر معصوم انساں کا، کراچی میں ہو قتل
آدمیت سر بہ خم، انسانیت سے شرمسار
اور قاتل کا لگا پائے نہ کوئی بھی سراغ
اہلِ دانش محوِ حیرت، چُپ ہیں اہلِ اقتدار
الغرض یہ سانحہ ایسا ہے جس پر آج بھی
ہر یہی خواہ رئیس امروہوی ہے اشکبار
اس کی یاری پر مجھے دائم رہے گا فخر و ناز
وہ تھا میرا رازدار اور میں ہوں اس کا راز
ہائے وہ پنجاہ سالہ ربط و ضبطِ باہمی
جس کا تھا بے لوثی و اخلاص باہم پر مدار
صبر کی تلقین کرتے ہیں جو ان کو کیا خبر
پارہ پارہ ہو چکا ہے دامنِ صبر و قرار
زخم رحلت کا ہو اس کی مندمل، ممکن نہیں
ساتھ ہی جائے گی تا گورِ غریباں یہ بہار
سُن کے اس محفل میں آوازِ رئیس امروہوی[1]
ضربِ غم سے ہو گیا راغب مرا سینہ فگار

---

[1] ایک سمعی ٹیپ کے ذریعے سے درج

جوشؔ ہی کے ساتھ اب دل میں رئیسؔ آباد ہے
حاصلِ عمرِ رواں راغبؔ! انھیں کی یاد ہے

قمر ہاشمی

منظوم خراجِ عقیدت
بنام
رئیس امروہوی

اے صدر نشینِ بزمِ قرطاس — اے نازشِ حرفِ سیم و الماس
اے شاعرِ ہفت رنگ و اورنگ — اے منشیِ آسمانِ ارژنگ
قطعات میں تیرے تاجِ خامہ — کالم تھا کہ تھا خراجِ خامہ
قطعات سیاستِ وطن تھے — اشعار سادتِ وطن تھے
تھا لوح و قلم کا تاجور تو — یا قومی الم کا نوحہ گر تو
بیدار ضمیر کرنے والا — تصویر میں رنگ بھرنے والا
انسان کی خوبیوں کا راقم — ہیں ذہن میں سب ترے مکارم
سینے کا فراخ تھا سمندر — احباب سے پیار کا تھا خوگر
بے ریب وہ یادِ دل حزیں تھا — اندازِ کلام دل نشیں تھا
الفاظ چلیں برقِ ندی تھے — قطعات کہ سحرِ سامری تھے
افسانہ طرازیوں کا ماہر — غزلوں کا فسوں طراز شاعر
ہر نظم پہ نثر پر تھا حاوی — اصنافِ سخن پہ بادشاہی
سلطانِ مشائخ القلم تھا — تو واصفِ خوبیٔ امم تھا
تاریخِ وطن ہیں تیرے قطعات — چلتا رہا خامہ تیرا دن رات
تو نابغۂ حیات افروز — ہر روز ترا ہی جشنِ نوروز

جب مل گیا تجھ سے ناگہانی — دیدار ترا تھا شادمانی
اب کس کو کہوں رئیس بھائی — اب کیسے سہوں تری جدائی
محفوظ ہیں سب خطوط تیرے — کرتے ہیں شبوں کے دور اندھیرے
کیوں چھوڑ گیا تقی کو تنہا — عبّاس بھی ہیں بڑے فسردہ
مغموم ہیں جون ایلیا بھی — رنجور ہیں زاہدہ حنا بھی
اک خلق ہے سوگوار تیری — قائل ہی ترا تھا صرف بیری
تجھ بن ہوں اداس میں رفیقم — سینے میں چھپا ہے شورِ ماتم
لگتا ہے بہل رہے ہو گھر میں — بچّوں سے بہل رہے ہو گھر میں
پہنچا ہوں تو آ گئے ہو باہر — تابانیٔ قلب ہے لبوں پر
آنکھوں میں ذہانت و ذکاوت — الفاظ میں پیار کی حلاوت
کل کیا ہوا یہ سنا رہے ہو — ہر شخص کے کام آ رہے ہو
انگلی میں قلم تھرک رہا ہے — خامہ چھٹی انگلی بن گیا ہے
سوجھی ہے اگر کوئی شرارت — کام آ گئی بھائی کی ظلاقت
پھر شوخ بیانی دیر تک ہے — باتوں میں مزاح کی جھلک ہے
ہر فقرہ و مصرع ارتجالاً — تھا باغ و بہار تو مزاجاً
قدروں کا بانکپن تجھی سے — تھی گرمیٔ انجمن تجھی سے
ویران سی ہو گئی حویلی — اب ایک ہی رہ گیا ہے بیلی
قدروں کا امین تو ہے وہ بھی — بے شبہ ذہین تو ہے وہ بھی
فرقت کا عذاب سہہ رہا ہے — کچھ بھائی کی بات کہہ رہا ہے
قرطاس و قلم کی شان تھے بھائی — ابلاغ کا آسمان تھے بھائی
چالیس برس قلم چلا ہے — اب دیکھیے مستقل خلا ہے
برجستہ لکھے گا کون قطعے — جھیلے گا قلم کے کون صدمے
کیا ذہن رسا تھا ہاشمی صاحب — واللہ دماغ تھا افق تاب

ماحول کو جگمگا رکھا تھا | روشن وہ دیا تھا جل رہا تھا
تھا نازشِ روزگار وہ شخص | قدرت کا تھا شاہکار وہ شخص

اب ایسا کہاں سے لائیں گے ہم
دن رات کریں گے اس کا ماتم

ہوٹل پام ریچ دوبئی ۲۱ اپریل ۱۹۸۹ء

عبدالعزیز خالد

رئیس امروہوی کی یاد میں

(۱)

کس نے جھانکا ہے خالدان دیکھا | اپنے انجام کا ہے کس کو پتہ؟
کس نے لکھا ہوا قلم کا پڑھا؟ | جانے کس سطر پر وہ سو کھ گیا
آشکارا ہے کس پہ غیب نظر؟ | کیا ہے پردے کے پیچھے کس کو خبر؟
ہونٹ نغمہ سرا ابھی، ابھی چپ | ہے ابھی لو ابھی اندھیرا گھپ
فرقِ غیب و شہود کس پہ کھلا؟ | رازِ بود و نبود کس سے کھلا؟
کس جگہ ہے قیام گاہِ اجل | ہے یہ عقدہ ازل سے لاینحل

(۲)

آفریں ہے مگر چھٹی حس پر | جھوٹ آئندہ کی پڑے جس پر
ہے بڑی بات اس سماعت کی | چاپ جس نے کہ موت کی سن لی
ذکر اس فردِ منفرد کا ہے! | جابجا سوگ جس کا برپا ہے

تھا سخن شہ رئیس امروہہ | ایک چھتنار پیڑ پُر میوہ
نرم خو، خندہ رو فغاں شیوہ | جوش مارے جو طرفہ علم اس کے
ایک طبعی مناسبت تھی اسے | سب علوم و فنون مخفی سے

(۳)

فکر وہ ہے جو خون میں حل ہو
بات وہ ہے جسے بدن سوچے
حسن ابن صباح کا پیرو
ایک انساں میں آدمی کی سو
دولت شعر کے لٹانے میں

دوسرا مصحفی کہیں جس کو
لائیں اس کے مقابل اب کس کو؟
ہو گا مشکل سے کوئی اس کا حریف:
فی زمانہ بدیہہ گوئی میں
ہر نگر میں الکھ جگاتا تھا
دھونی ہر جوہ میں رماتا تھا
سیندھ ہر قلعے میں لگاتا تھا
راس ہر رنگ میں رچاتا تھا
جسم جوگی کا نفس بھوگی کا
آنکھ روگی کی، دل نروگی کا
وہ مزاجاً کبیر پنتھی تھا
خود گرفتہ اور خود گرفتی تھا

(۴)

ایک کاہن تھا جو کراچی میں
بابل و نینوا سے آیا تھا
ساتھ لوحِ طلسم لایا تھا
جس کی مرموز لفظیات میں تھا

مصحفِ دانیال کا پرتو
ہر گھڑی سامنے ارادۂ نو
کوئی تکمیل ہو نہ بے تگ و دو
پیکرِ جذب و ہوش و عقل و جنوں
اس کی دلچسپیاں تھیں گوناگوں
تہ بہ تہ اس کی ذات کی پرتیں
باوجود ان تمام باتوں کے
اس خود آگاہ صاحبِ فن نے
اپنی طاقت کو منتشر نہ کیا
عالمِ وجد و کیف میں بھی کبھی
خارج از جادۂ ادب نہ ہوا
طبع روشن تھی صلح کل اس کی
گل و دُمل سے بھی سانجھ تھی جس کی

(۵)

آئیں یوں دیکھنے میں کم کم ہی ... ایک جا پیری و جواں سالی
جس کی پرواز لامکاں تک تھی ... ایسی اس کی تھی بے پروبالی!
جب بھی کینہ سے دل اچاٹ ہوا ... جھٹ نئی اک سبھا بنا ڈالی

وہ علمدارِ جدتِ افکار ... پہرہ دارِ خزائنِ اسرار
کہ جس سے صداقتِ اظہار ... "لا تخف فی لومۃ لائم
کف افسوس مت کبھی ملنا ... رہنا اپنے اصول پر قائم
نہیں ممکن نوشتہ کا ٹلنا ... ست پر رہنا ہے دھار پر چلنا!"
انما العلم بالتعلم کی ... زندہ تفسیر زندگی اس کی
شب کو اس کا دیا نہ بجھتا تھا ... ایسا شب زندہ دار جس نے کبھی
نہ چکھی لذتِ گراں خوابی ... تشنہ کامانِ علم کی بخدا

(۶)

ہو کبھی علم سے نہ سیرابی ... ہے مقدر ہنر کا بیتابی
اس کے تن میں تھی روحِ سیمابی ... تھی تقاضائے فکر و فن سے جسے
دہر ہو محال سرتابی ... نغمہ پرواز ترین ایسے ہی
ذوقِ نغمہ کی جب ہو کمیابی

ڈوبنا تھا ستارہ ڈوب گیا
دیکھو اس کی مگر اُفق تابی
اس کی تربت پہ جا کے پھول بکھیر
اے جگر نام اشک عنابی!

محسن بھوپالی

رئیس فرد نہیں عہد کی علامت تھے!

ادیب و شاعر و کالم نویس و نقد نگار
ہر ایک شعبۂ فن میں وہ دیو قامت تھے
رئیس یوں تو بظاہر تھا ایک شخص کا نام
رئیس فرد نہیں عہد کی علامت تھے

دیار پاک کے لاکھوں ستم نصیبوں کو
قلم سے اپنے جو لفظوں کے پھول دیتا تھا
اسے خود اپنے ہی خوں میں ڈبو دیا آخر
جو زندہ رہنے کے زرّیں اصول دیتا تھا

تھی جس سے انجمن فکر و فن میں تابانی
بھٹک رہی ہیں نگاہیں، وہ روشنی نہ رہی
جُڑے تھے جس کے سبب ہم عظیم ورثے سے
ہمارے رشتۂ ماضی کی وہ کڑی نہ رہی

مشتاق شاد

"وہ امروہہ کی روحِ جاودانی"

نذرِ رئیس امروہوی

(۱)

نگارِ فن کی رگ رگ میں رواں وہ — زمینِ فکر کا ہفت آسماں وہ

رئیس شعر و میرِ محفلِ نثر — اکیلا چل دیا جانے کہاں وہ

(۲)

وہ اک علم و ادب کا مدرسہ تھا — کسی نام و نسب کا مدرسہ تھا
ہزاروں لوگ اس سے سیکھتے تھے — وہ تنہا شخص سب کا مدرسہ تھا

(۳)

وہ اک غوّاص گہرے پانیوں کا — وہ حیرت گر، کئی حیرانیوں کا
اسے عادت تھی پروازِ نظر کی — وہ خوگر، فکر کی جولانیوں کا

(۴)

کہیں عالی، سکندر سے زیادہ — بہت گہرا، سمندر سے زیادہ
تھا باطن اس کے ظاہر سے نمایاں — وہ باہر، اپنے اندر سے زیادہ

(۵)

سخنور وہ، کہ جادوگر ہو جیسے — مکمل نظم کا پیکر ہو جیسے
تھی اک اک حرف میں تنظیم ایسی — کئی الفاظ کا لشکر ہو جیسے

(۶)

بہت اس سے اُجالا مانگتے تھے — کئی مہتاب ہالہ مانگتے تھے
اسے ازبر تھی تاریخِ ادب یوں — محقق بھی حوالہ مانگتے تھے

(۷)

محبت سے جہاں کو دیکھتا تھا — زمیں سے ہر زماں کو دیکھتا تھا
نظر اس کی ستاروں پر لگی تھی — وہ سارے آسماں کو دیکھتا تھا

(۸)

نظر دل کش، زبان نرم و ملائم — وہ نازک سا ستوں کی طرح قائم
جوانی میں بڑھاپے کی بصیرت — بڑھاپے میں جوانوں سے عزائم

(۹)

ادا اس کی ہر اک من بھاؤنی تھی
وہ اک جادو بھری سی ساؤنی تھی
وہ تنہا تھا مگر اس کے جلو میں
ادب کی ایک پوری چھاؤنی تھی

(۱۰)

بہت اس کے بچھڑ جانے کا دکھ ہے
مقدّر یوں بگڑ جانے کا دکھ ہے
شجر سے ٹوٹتے رہتے ہیں پتے
یہ دکھ، گلشن اجڑ جانے کا دکھ ہے

(۱۱)

بیاں کب تک کروں احوال اس کے
مؤدب، سارے خد و خال اس کے
کئی صدیوں پہ بھاری لگ رہے ہیں
ادب کے نام چونسٹھ سال اس کے

(۱۲)

وہ امروہہ کی روح جاودانی
چلے گی مدّتوں اس کی کہانی
کیا جب یاد صحراؤں میں اس کو
مری آنکھوں میں بھر آئے گا پانی

(۱۳)

سکونت ہو بہشت آباد اس کی
مرے دل میں رہے گی یاد اس کی
بہت جب ہجر تڑپائے گا اس کو
غزل پڑھ لوں گا کوئی شاد اس کی

(ریاض سے)

بشیر فاروقی

مزار رئیس امروہوی پر

تم مزار مقدس پر اے رئیس قلم
دُرِ نیاز و عقیدت لٹانے آیا ہوں
بھرا نہیں ترفت سے جس کے لہو ٹپکتا ہے
وہ خوں چکیدہ کہانی سنانے آیا ہوں
سلگ رہے ہیں جو سینوں میں آتش غم سے
وہ داغ ہائے محبت دکھانے آیا ہوں
ہزار لعل و گہر سے جو بیش قیمت ہیں
ان آنسوؤں سے لحد کو سجانے آیا ہوں
ترے مزار پہ یہ کہہ رہے ہیں میر خلیل
محبتوں کی میں چادر پڑھانے آیا ہوں

تمام عمر کے رشتے تھے جس سے وابستہ — تری لحد پہ میں ان کو رلانے آیا ہوں
تمھی بھی جون و ریحانہ بھی اشک ریز ہیں آج — تجھے شہیدِ وطن یہ بتانے آیا ہوں

شہیدِ علم و ادب، تیری بے گناہی پر — نگاہِ قاتلِ تیغِ جفا ابھی روتی ہے
چمن میں گریۂ شبنم کا تذکرہ کیا ہے — ترے فراق میں بادِ صبا بھی روتی ہے
قتیلِ لوح و قلم تیرے خونِ ناحق پر
عروسِ لالۂ رنگیں قبا بھی روتی ہے

نازش رضوی

رئیسِ ادب

نذر حضرت رئیس امروہوی مرحوم

وہ معروف اس عہد میں روز و شب تھے — وہ تھے ایک انساں مگر کیا عجب تھے
سخن ور تھے آبا و اجداد جن کے — قلمکار ایسے وہ اعلیٰ نسب تھے
تھی نسبت انھیں مصحفی کے وطن سے — صحیفہ نگارِ فنون و ادب تھے
عجب امتزاج ان کے کردار میں تھا — مزاجاً تھے ہندی تو نسلاً عرب تھے
یہ معراجِ ذوقِ سخن اللہ اللہ — نہ صرف ایک طالب وہ خود اک طلب تھے
تھی قطعات میں ان کے وہ معنویت — کہ مداح ان کے سخن فہم سب تھے
نوازا حکومت نے اور قوم نے بھی — عجب خوش خطاب اور عجب خوش لقب تھے
تھی نثر اور نظم ان کا سرمایہ نازش
حقیقت میں وہ اک رئیسِ ادب تھے

قلمکاروں کی عزت تھے رئیس امروہوی ایسے
صداقت ہی صداقت تھے رئیس امروہوی ایسے

بہ ہر انداز حق گوئی کا تھا فرماں روا جذبہ
شہنشاہِ صحافت تھے رئیس امروہوی ایسے

لکھے تو کیا لکھے، کس پر لکھے اور کس طرح لکھے
قلم کی اک ضرورت تھے رئیس امروہوی ایسے

رقم کرتے تھے نعتِ پاک اک مخصوص لہجے میں
کہ شیدائے رسالت تھے رئیس امروہوی ایسے

سمجھ لیتے تھے یک دم عصرِ حاضر کے تقاضوں کو
ذہانت ہی ذہانت تھے رئیس امروہوی ایسے

شکن تک ناگواری کی نہ پیشانی پہ پڑتی تھی
مجسّم آدمیت تھے رئیس امروہوی ایسے

نہ دل پر میل آتا تھا کبھی بغض و عداوت کا
بہت ہی پاک طینت تھے رئیس امروہوی ایسے

کیا کرتے تھے کچھ مدت سے ذہنی موت کی باتیں
کہ مشتاقِ شہادت تھے رئیس امروہوی ایسے

کمی محسوس ہوگی عمر بھر جس کی مجھے نازش
مکمل دستِ شفقت تھے رئیس امروہوی ایسے

شمس تسنیم

عصرِ حاضر کا نیّرِ اعظم

بحضور استادِ محترم حضرت رئیسؔ امروہوی مرحوم و مغفور

عصرِ حاضر کا نیّرِ اعظم!!   وہ رموزِ کلام کا محرم!!
نکتہ رس، نغز گو و شیریں سخن   خوش گلو، خوش خیال، پاک دہن
ترجمانِ شعور و عارفِ کل   شاخسارِ خیال کا بلبل

علمِ النفس کا ماہر و کامل   شہرِ ارواح کا وہ اک عامل

وہ امینِ پسِ غبارِ حرم
سازِ ہستی کا ایک مضطر سرگم

بات الفت کی ہو یا حکایتِ نے   ہے عیاں اس کے دم سے اک اک شے
دفترِ علم و فن کا روحِ رواں   وہ مباحث میں بحرِ بے پایاں
فلسفہ اس کی شاعری کی فصیل   فکرِ سعدی کی ایک زندہ دلیل
مثنوی میں تھا شانِ فردوسی   یعنی لفظوں کی تھی قدم بوسی

وہ رئیسِ سخن رئیسِ کلام
ادب و شعر و آگہی کا امام

اس کے ہر شعر میں ہے جولانی   یعنی خیام کی ہمہ دانی
میرؔ و مومنؔ کہ غالبؔ و اقبالؔ   سارے رنگوں میں اس کا رنگِ کمال
مرثیہ گوئی میں انیسؔ جہاں   نظم میں جوشؔ کا کمال عیاں

گوہرِ علم کا دفینہ تھا!
اک چمکتا ہوا نگینہ تھا!

اس کا ہر علم و فن تھا لافانی   وہ سمجھتا تھا رمزِ انسانی
منبعِ فیض اس کا مسکن تھا   مشعلِ راہ اس کا ہر فن تھا
وہ مخیر بھی تھا معین بھی تھا   دردمندوں کا ہم نشیں بھی تھا

اس میں سب کچھ تھا پر غرور نہ تھا
نشۂ علم کا فتور نہ تھا!

کام کرتا تھا سب وہ اپنے تئیں   وہ سمجھتا تھا خود کو نا ک نشیں
مثلِ درویش شان تھی اس کی   ہر جگہ آن بان تھی اس کی
چلتا رہتا تھا وہ مثالِ قلم   کبھی جھکتا نہیں تھا اس کا علم
نہ خمیدہ کمر نہ خم گردن   جسم کمزور حوصلہ آہن!

آہ! وہ مردِ فکر و فن نہ رہا
شمسؔ وہ مہدیٔ سخن نہ رہا

<u>خورشید احمر</u>

ہنگام حشر ہے کہ وداعِ رئیس ہے

ہے شہر شہر سلسلۂ سورش و فغاں
گریہ کناں ہیں مرد و زن و پیر و نوجواں
ہیں صاحبانِ شعر و سخن آج نوحہ خواں
جو سرنگوں قلم ہے تو کاغذ ہے خوں فشاں
دنیائے فن سے کون یہ مستور ہو گیا
ہر جلوہ شش جہات کا بے نور ہو گیا

ہر شاخ خوں فشاں ہے چمن شعلہ بار ہے
رنجور و دل گرفتہ عروسِ بہار ہے
جامہ دریدہ آج ہر اک گل عذار ہے
مرگِ رئیس ہے کہ وداعِ قرار ہے
ہیں ایلیا نڈھال تقی بے قرار ہیں
بچے و زوجِ رئیس سے سینہ فگار ہیں

دریا کو اپنی موجِ روانی پہ ناز تھا
پھولوں کو اپنی عطر فشانی پہ ناز تھا
بلبل کو اپنی رمز خوانی پہ ناز تھا
اور ہم کو اپنے حافظِ ثانی پہ ناز تھا
رونق فروشِ بزمِ سخن داں نہیں رہا
وہ آفتابِ مطلعِ عرفاں نہیں رہا

ان کی نظر ستارۂ دیدہ وریں گداز تھی
ان کی جبیں کتابِ معارف طراز تھی
ان کی نوا بہارِ گلستاں نواز تھی
ان کے قلم سے فکرِ سخن سرفراز تھی

دشتِ ہنر طلب کا حوالہ رئیسؔ تھے
لاریب فکر و فن کا ہمالہ رئیسؔ تھے

ہر سمت درد و کرب میں ڈوبی ہے زندگی
ایسا فلک نے سانحہ دیکھا تھا کیا کبھی؟
شعر و ادب پہ کیسی یہ افتاد آ پڑی
بیہات بے ردا ہوئی سلمائے شاعری

آنکھیں ہیں اشکبار تو دل غم نویس ہے
ہنگامِ حشر ہے کہ وداعِ رئیسؔ ہے

اختر سعیدی

اُس کی صداقتوں کا زمانہ گواہ تھا .....

شاعر بھی تھا، ادیب بھی تھا، فلسفی بھی تھا
وہ اہلِ فکر و فن کے لیے روشنی بھی تھا
اہلِ وطن کو اس کی صحافت پہ ناز تھا
وہ تاجدارِ علم سراپا نیاز تھا
علمِ عروض پر بھی اُسے دسترس رہی
یہ جہت اس کے پیشِ نظر ہر نفس رہی
قطعات میں بھی اُس نے رکھی روحِ انقلاب
کالم نگار اُس کا نہ تھا کوئی ہم رکاب
وہ محترم تھا اہلِ ادب کی نگاہ میں
کتنے ادب شناس تھے اُس کی پناہ میں
اُس کا وجود سایۂ ابرِ بہار تھا
ہاں وہ حریفِ گردشِ لیل و نہار تھا
اُس کے قلم نے فکر و نظر کو بہم کیا
جو بے قلم تھے ان کو بھی اہلِ قلم کیا
علم و ادب کا گوہرِ عالم پناہ تھا
اُس کی صداقتوں کا زمانہ گواہ تھا

اردو زباں کا عاشقِ صادق چلا گیا
لیکن چراغ راہ گزر میں جلا گیا

شاہانہ رئیس امروہوی

ہائے بھائی[1]

ہائے وہ شام، وہ لمحہ وہ ستمگر لمحہ
کردیا جس نے بھرے گھر کو ہمارے تنہا
ظلم کا ہاتھ بڑھا شمع بجھانے کے لیے
کس لیے چھوڑ دیا ہم کو رُلانے کے لیے
کس طرح ظلم کا وہ وقت گزرا ہوگا
سوچتی ہوں کہ مجھے تم نے پکارا ہوگا
پر غضب ہے کہ مجھے پاس بلایا بھی نہیں
زخم کھایا ہے کہاں یہ تو دکھایا بھی نہیں
کس جگہ تم کو میں ڈھونڈوں یہ بتادو آکر
میں تڑپتی ہوں ذرا شکل دکھادو آکر
شام ڈھلتی ہے تو پھر رات چلی آتی ہے
تم خفا ہو تو کوئی چیز نہیں بھاتی ہے
کیا کبھی لوٹ کے اس گھر میں نہیں آؤگے
کس طرح دل کو سنبھالیں تمہیں سمجھاؤگے
تم نہیں ہو تو خزاؤں نے جمائے ڈیرے
دل کو طوفانِ بلاخیز کھڑا ہے گھیرے
درد سینے میں ہے فریاد کیے جاؤں گی
ہائے بھائی میں تمہیں یاد کیے جاؤں گی

○

---

[1] ہم انھیں بابا کے بجائے بھائی کہا کرتے تھے۔

○ انتظاریہ ○

میر خلیل الرحمٰن

حضرت رئیس امروہوی میری نظر میں

کائنات کی تاریخ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو تاریخ بتائے گی کہ دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو کائنات کو اپنی نظر میں اور اس کی تخلیقات کو اپنے قلم کی گرفت میں رکھتے ہیں۔ رئیس امروہوی ایک ایسے ہی دانشور اور اہلِ قلم تھے جنھوں نے کائنات اور تخلیق کائنات کا مطالعہ بصیرت افروز نگاہوں سے کیا تھا اور اس کی حرکات و سکنات اور افعال کو بڑی چابک دستی سے قلمبند کیا تھا۔

حضرت رئیس امروہوی سے میری رفاقت چالیس سال کے عرصے سے بھی زیادہ رہی۔ میں نے انھیں ایک ایسا مردِ قلندر پایا جس کی سادگی پر شاہی نثار تھی۔ وہ نہ صرف انسان دوست بلکہ احترامِ آدمیت کے نقیب بھی تھے۔ وہ انسان کے کرب اور اس کے دکھوں سے بخوبی واقف تھے۔ دنیا میں احترامِ آدمیت کو کہیں بھی مجروح کیا جا رہا ہو ان کی آنکھیں نمناک ہو جاتی تھیں۔ رئیس امروہوی ایک ایسے ادیب و شاعر تھے جن کو شعر گوئی پر مکمل قدرت حاصل تھی۔ وہ دنیا کے ہر مسئلے پر اپنے قلم کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے۔ ان کی زندگی خلوصِ نیت اور انسان دوستی سے عبارت تھی۔ کسی بھی طبقے، نسل، رنگ یا مذہب و ملّت کا آدمی ہو، اُن کے نزدیک سب برابر اور لائقِ تحسین تھے۔ ان کی رہائش گاہ پر مختلف نظریات اور عقیدے کے لوگ صبح و شام حاضری دیتے تھے اور وہ سب کے ساتھ یکساں عقیدت و احترام سے پیش آتے تھے۔ کوئی بھی بزم یا تقریب جوان کے بغیر سونی لگتی تھی۔

ادب کی کوئی بھی صنف ہو یا نظم و نثر کا کوئی اسلوب، انھیں سب اصناف سخن پر دسترس حاصل تھی۔ نیز ان کے کالم اور قطعات جو اخبار جنگ میں اشاعت پذیر ہوتے تھے پاکستان کی تاریخ کا حصہ بن گئے تھے۔ بعض اہلِ علم و کمال کی زبان میں اخبار جنگ میں ہر روز ان کا ایک نیا قطعہ پاکستان کی تاریخ اور مسائل کی نشان دہی کرتا تھا۔ ان کا ہفت روزہ کالم جو نفسیات اور

مابعد النفسیات پر مبنی ہوتا تھا اس سے بے شمار اہلِ وطن مستفید ہوتے تھے۔ ان کے پتے پر روزانہ سیکڑوں کی تعداد میں مسائل سے بھرپور خطوط آتے تھے جن کے جوابات وہ ذاتی طور پر دیتے، جن سے ان کی تسکین ہوتی۔ مختلف موضوعات پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جو ادب، شاعری، انسان دوستی، نجوم اور نفسیات کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ مجھے تعجب کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان سے بیسیوں افراد روزانہ ملاقات کے لیے آتے تھے، جن کے مسائل کی دادرسی میں ان کا بے حد وقت صرف ہوتا نیز وہ سماجی اور ادبی تقریبات میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے اور سیکڑوں خطوط کے جوابات بھی ذاتی طور پر دیتے تھے۔ معلوم نہیں کہ اس کے باوجود انھیں ان بے شمار کتابوں کی تصنیف کے لیے کیسے وقت ملا کرتا تھا۔ رئیس امروہوی کی شاعری میں جہاں نیرنگیِ عشق اور ہجر و وصال کی دلچسپیاں تھیں وہاں زندگی کی تلخیاں، محرومیاں اور بنی نوعِ انسان کا کرب بھی ملتا ہے۔ زندگی کا مطالعہ انھوں نے بہت باریک بینی سے اور قریب رہ کر کیا تھا جس کا اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

ایک ایسا شخص جس کی ذات لاتنے محاسن سے عبارت تھی نہ صرف بظاہر سادہ لوح، فقیر منش اور قلندر رنگ تھا بلکہ اس کا باطن بھی تصنع اور بناوٹ سے بے نیاز تھا۔ ان کے چہرے پر مصلحت اور دنیاداری کا کوئی نقاب نہیں تھا بلکہ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا جو دوسرے ہزاروں انسانوں سے انھیں منفرد رکھتا تھا۔ ان کی شاعری کا ایک حصہ وطن پرستی اور اہلِ وطن کی محبت پر مشتمل تھا۔ جب بھی وطن پر کوئی آنچ آتی یا اس کے ناموس پر کوئی چوٹ پڑتی تو ان کا دل بے چین ہو جاتا اور ان کے ہونٹوں سے وطن کی محبت کے نغمے پھوٹ پڑتے۔

آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ رئیس امروہوی نے زندگی کے آخری نفس تک اپنے سچے اور بے باک قلم کو حرکت میں رکھا اور حرمتِ لوح و قلم پر اپنی جان نچھاور کر دی۔ رئیس امروہوی جیسا عظیم شاعر و ادیب، نقاد و کالم نویس اور احترامِ آدمیت کا نقیب بہت عرصے بعد پیدا ہوتا ہے۔

خدا حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ایم۔ایم۔بخشی

رئیس امروہوی انسانیت کے آئینے میں

دنیا میں بڑے لوگ آتے رہتے ہیں اور اپنی ذات سے وابستہ اچھے کام انجام دے کر اس دارِفانی سے کوچ کر جاتے ہیں اور یادوں کے وہ نقش چھوڑ جاتے ہیں جو ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔

حضرت رئیس امروہوی کی شخصیت بھی بلند و بالا تھی، ان کی علمی و ادبی فضیلت تو صاحبانِ علم و کمال ہی جانیں، لیکن میں نے ان کے اندر ایک بڑا انسان دیکھا تھا۔ یہاں بڑائی سے مراد قد و قامت یا دولت و ثروت نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کے لیے ان کے دل میں جو گداز گوشہ تھا وہ قابلِ احترام و ستائش تھا۔ رئیس امروہوی میرے پڑوسی بھی تھے اور مجھے یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ مجھے اکثر مشاورت اور ضرورت مند انسانوں کی مدد کے لیے بلایا کرتے تھے۔ میں ہمیشہ رئیس امروہوی مرحوم کی طلبی کو دیگر کاموں پر فوقیت دیا کرتا تھا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ یہ عظیم شخص کبھی اپنے ذاتی کام کے لیے مجھے زحمت نہیں دے گا بلکہ اس قلندر کے دربار میں حاضر ہونے والے ہزاروں غریبوں، حاجت مندوں اور دکھوں کے مارے انسانوں کا درد اس سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ رئیس صاحب کی عادت تھی کہ وہ ہر اس شخص کو گلے سے لگاتے تھے جو ان کے دربار میں پہنچ جاتا۔ ان کے یہاں امیر و غریب، رنگ و نسل اور عقیدوں کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ وہ انسان کو پیار کرتے تھے اور اسے عبادت سمجھتے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کے درج بالا مشن کو پورا کرنے کے لیے رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ تشکیل دیا گیا اور مجھے بھی ٹرسٹی ہونے کے علاوہ کچھ ذمے داری سونپی گئی۔ مجھے یقین کامل ہے کہ ٹرسٹ اس عظیم انسان کے فلاحِ انسانی کے مقاصد جاری و ساری رکھے گا۔

○

عبدالحفیظ باحلیم

تہذیب انسانیت کے علمبردار - رئیس امروہوی

حضرت رئیس امروہوی سے جنھیں مرحوم کہتے ہوئے روح میں کسک ہوتی ہے، میرا رشتہ کچھ ایسی نوعیت کا تھا جو پسندیدگی کی حد سے گزر کر عقیدت مندی کی منزل تک پہنچ گیا تھا۔ رئیس صاحب مجھ سے کچھ ایسی شفقت فرماتے تھے جیسے میں ان کے لیے صحرا میں نخلستان کی مانند ہوں۔ مجھے ادب اور اہل ادب سے ہمیشہ عشق رہا ہے۔ مجھے شوق ہے کہ جب بھی دنیائے ادب کا کوئی درخشندہ ستارہ کراچی کے افق پر نظر آتا ہے۔ میں اس سے تھوڑی سی روشنی لے کر اپنے اس ادبی آنگن میں اُجالا کر لیتا ہوں جہاں گاہے گاہے ادیب و شاعر اپنی محبتیں بکھیرتے ہیں۔ رئیس صاحب ان محافل کی جان ہوتے تھے۔ کوئی ادبی و شعری محفل ایسی نہ ہوتی جس میں حضرت رونق افروز نہ ہوتے۔ سید محمد تقی برادر رئیس ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے اور کبھی کبھی جون ایلیا رفیق بزم ہوتے۔ رئیس امروہوی صاحب کے شعری و علمی محاسن کے بارے میں اہل علم و کمال نے سیر حاصل تبصرہ فرما دیا ہے۔ میں صرف ان کی تہذیب انسانیت کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ مرحوم نہ صرف انسان دوست تھے بلکہ تہذیب انسانیت ان پر فخر کرتی تھی۔ کوئی بھی آشنا نا آشنا ان کے مسکن پر چلا جائے وہ بلا امتیاز گرم جوشی سے خوش آمدید کہتے تھے۔ ان کی شخصیت خانوں میں منقسم نہیں تھی بلکہ ان کا وجود مرکزیت پر قائم تھا۔ دوسرے کے دکھوں کو اپنا سمجھنا بلکہ ان کے دکھوں کو اپنے وجود میں سمیٹ لینا ان کا روز و شب کا معمول تھا۔ ظاہر و باطن میں یکسانیت تھی۔ چہرے سے خوشی، غم اور غصہ وغیرہ بہت ہی کم کرتے تھے، سب کا اظہار بہت آسانی سے ہو جاتا تھا۔ وہ چہرے پر نقاب ڈالنے کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کا چہرہ ایک کھلی کتاب تھا جسے بہت آسانی سے پڑھا جا سکتا تھا۔ دل آزاری کو وہ گناہ سمجھتے تھے اور دل جوئی کو عبادت۔ حضرت رئیس انسانیت کو مذہب کی

بنیاد سمجھتے تھے اور یہی تلقین اپنے ہم عصروں اور دوستوں کو کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ رئیس امروہوی جیسا عظیم انسان جس نے تہذیب انسانیت کی بقا اور اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لیے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی مدّتوں بعد پیدا ہوتا ہے۔ رئیس صاحب آخری دم تک قلم کی آبرو اور انسانیت کے فروغ کی تاریخ رقم کرتے رہے۔

○

اختر فیروز

چوہتّر سالہ تاریخی وضعداری کا پیکر۔ رئیس امروہوی

رئیس امروہوی۔ فن اور شخصیت کے عنوان سے یہ کتاب اس عظیم اہلِ قلم، شاعر قطعہ نگار، کالم نگار اور ماہرِ نفسیات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے شائع کی جا رہی ہے جس کا نام آسمانِ ادب پر ہمیشہ درخشندہ رہے گا۔ حضرت رئیس امروہوی کو جن دوستوں اور عقیدت مندوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا ان میں مجھ جیسا کم مایہ بھی جنوں بھی شامل تھا۔ اس قلم کار کے فن اور شخصیت کا احاطہ کس طرح کیا جائے جس کی ذات کے ان گنت پہلو ہوں۔ رئیس امروہوی بیک وقت شاعر و ادیب، دانشور، قطعہ نگار و کالم نویس، صوفی اور درویش صفت انسان تھے۔ ان کی شخصیت کا جو تاریخی اور منفرد پہلو مجھے نظر آیا وہ ان کی چوہتّر سالہ تاریخی اور مثالی وضع داری تھی جو آخری سانس تک قائم رہی۔ فطرت میں درویشی، لباس میں بے توجہی، مزاج میں سادگی، کیفیت میں رندی، احساس میں خودداری، وجود میں بے نیازی، خدمت میں بے غرضی اور روح میں انسان دوستی ان کے وہ محاسن تھے جو ان کی چوہتّر سالہ زندگی پر محیط تھے۔ رئیس صاحب کی شاعری میں قلبی واردات، حساس دلی اور تخیل میں ایک اعلیٰ و ارفع روشن دماغ نظر آتا ہے۔ نیز مشاہدات کے ساتھ ساتھ فکری سرمایہ خاص کا منبع، ندرتِ خیال اور زندگی کے گہرے تجربے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایسی ہمہ گیر شخصیت تھے جو کائنات، جمالیات، مابعد النفسیات اور حیاتِ انسانی کے تمام اندرونی نکتہ ہائے رموز اور بیرونی کربِ احساس اور مسائل کو ڈوب کر سمجھنے اور سمجھانے کی انوکھی اور غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ مادی کامیابی بذاتِ خود حاصل نہیں کر سکے اور ظاہری جاہ و ثروت اور مفادات کی کبھی پروا نہیں کی۔۔۔۔
غرض کہ دنیاوی آسائشوں کے لیے اپنی مثالی وضع داری، ازلی شرافت اور فکری

وجاہت کا مرتے دم تک سودا نہیں کیا۔ رئیس صاحب کو شعر گوئی پر قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے بے انتہا اشعار مختلف اصنافِ سخن میں کہے، لیکن صرف اُن کے کلام کی ضخامت ہی قابلِ تحسین نہیں بلکہ کلام کی لطافت اور ان کے اندازِ فکر میں تہذیبِ زندگی اور اقدارِ اعلیٰ کے تحفّظ کا جو جذبہ کارفرما تھا وہی ان کی عظمت اور صاحبِ بصیرت ہونے کی دلیل ہے۔

o

شاہد احمد خاں

تاجِ انسانیت

ہندوستان کی ایک مشہور ادبی شخصیت پر حضرت جوش ملیح آبادی مرحوم کے تاثرات نظر سے گزرے۔ لیکن اگر حضرت جوش مرحوم زندہ ہوتے اور ان سے حضرت رئیس امروہوی شہید کے بارے میں تاثرات تحریر کرنے کی گزارش کی جاتی تو شاید دوبارہ اُن کے تاثرات میں درج ذیل چند سطریں ضرور شامل ہوتیں۔

"میں بڑی دیانت کے ساتھ کہتا ہوں کہ جب دُنیا کے دو پاؤں پر چلنے والے اربوں درندوں کے درمیان جن کو دھوکے سے آدمی سمجھا جاتا ہے۔" رئیس امروہوی" کے سے انسان کو دیکھتا ہوں تو سوچنے لگتا ہوں کہ اس ہولناک ماحول میں رئیس امروہوی کا سا انسان پیدا کیوں کر ہوگیا۔ ہو نہ ہو یہ روزگار کا ایک عظیم اعجاز ہے۔ اُن کا کاسۂ سر اس قدر موزوں ہے کہ تاج انسانیت اس پر ٹھیک منطبق ہوجاتا ہے کہ ڈھیلا ہوتا ہے نہ تنگ"،

حقیقتِ واقعہ بھی یہی ہے کہ حضرت رئیس امروہوی شہید کا کاسۂ سر تاج انسانیت کے لیے انتہائی موزوں ہے اور دُنیا کے دو پاؤں پر چلنے والے درندوں میں سے ایک درندے نے (جس کو دھوکے سے آدمی سمجھا جاتا ہے)، اس عظیم انسان کی جان لے لی جس کو یہ درندہ زندگی کی مزید مہلت دے دیتا تو نہ صرف یہ کہ درندوں کی صف سے نکل کر آدمی کہلاتا بلکہ اس کا انسانیت پر ایک عظیم احسان ہوتا۔

اس ہولناک ماحول میں جہاں درندگی، سفّاکی کا یہ شرمناک مظاہرہ ہوا کہ حضرت رئیس امروہوی جیسے معصوم، بے ضرر، انسان دوست کو قتل کر دیا گیا وہاں اسی ہولناک ماحول میں حضرت رئیس امروہوی نے تمام رشیوں، منیوں، صوفی، اولیاء و

اقطاب کے مانند آدمیت کا وہ مقام بھی حاصل کر لیا کہ ان کے نام سے تاریخ ادب وانسانیت کی شمع تا قیامت روشن رہے گی اور اُن کے محاسن گزرے ہوئے وقت کی پیشانی پر تا ابد جھلکتے اور دمکتے رہیں گے۔

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، ایک عہد ساز شخصیت، تہذیب و شرافت کا پیکر، صوفی شاعر، ادیب، صحافی، دانشور، ماہرِ نفسیات، انسان دوست، حضرت رئیس امروہوی شہید انتہائی صبر آزما، کرب و ابتلا کے مراحل سے گزر کر جس پُر وقار انداز میں اپنی ابدی آرام گاہ تک پہنچے اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ رتبہ جو انھیں ملا وہ انسان اور انسانیت سے ان کی والہانہ وابستگی کا نتیجہ تھا۔

حضرت رئیس امروہوی شہید میدان ادب و صحافت کی ایک بھرپور اور ہمہ پہلو شخصیت تھے۔ ان کی شخصیت متنوع عقیدتوں کا مرکز تھی۔ بظاہر ان کا جسم نحیف تھا، مگر اُن کے اعصاب فولادی تھے۔ وہ بڑے فعال اور باعمل انسان تھے۔ چھوٹے چھوٹے چراغوں کی ٹمٹماتی روشنیوں میں چھپے ہوئے بڑے بڑے اُجالوں کو دیکھ لینے کا فن جانتے تھے۔ اُن کے دماغ سے اٹھنے والی سوچوں کی لہریں جب تحریر کا روپ دھارتی تھیں تو قاری کو مسحور کر دیتی تھیں۔ ان کا دل اپنے لیے کم اور دوسروں کے لیے زیادہ دھڑکتا تھا۔

○

maablib.org

حاجی محمد شفیع

سیف القلم رئیس امروہی

لکھا قلم نے جو نام رئیس امروہی
ڈھلک ڈھلک اٹھی پلکوں پہ موتیوں کی لڑی

جہانِ فن سے اٹھے یوں رئیس امروہی
خزانۂ ادب و شعر ہو گیا خالی

حدِ فنا و بقا میں رئیس امروہی
جلا کے چھوڑ گئے شمعِ زندگی جیسی

ہوئی تمام متاعِ رئیس امروہی
یہ بات آ گئی لب پر کبھی جو بات چلی

اساتذہ میں تھے ایسے رئیس امروہی
کہ جیسے شاخِ چمن پر مہک رہی ہے کلی

امیر و داغ۔ دبیر و انیس نے پائی
رئیس کو بھی وہی شہرتِ دوام ملی

تمام عمر رہے فکر کے سمندر میں
مگر جبینِ وفا پر نہ اک شکن آئی

مدِ تمام تو سیف القلم کسی نے کہا
حیات کتنے خطابات سے نوازی گئی

صحافی اور منجم۔ ادیب و دانشور
وہ ایک وقت میں کیا کیا تھے یہ خبر نہ رہی

رئیس اپنے ہی کیا تھے رئیس سب کے تھے
حیات ان کی سدا دوسروں کے دکھ میں جلی

تھے اپنے ساتھ لیے کاروانِ شعر و سخن
عطائے ربِ جہاں تھی ملی تھی راہ بڑی

جلالِ شعر و ادب چہرۂ رئیس پہ تھا
یہ شان اور یہ شوکت کبھی کسی میں نہ تھی

وہ دوستی کے پرستار شاہ کار وفا
اصول زیست پہ بنیادِ دوستی رکھی

ہزار ہا شجر شعر و فن کے سائے ہیں
زوال جس کو نہیں ہے وہ زندگی پائی

شریکِ رنج ہیں احبابِ اہلِ خانہ کے
ہر ایک چہرہ پہ تصویرِ غم عیاں دیکھی

اُداس اُداس ہوئی ہے شفیع بزمِ رئیس
جدا وہ ایسے ہوئے ہیں نہ مل سکیں گے کبھی
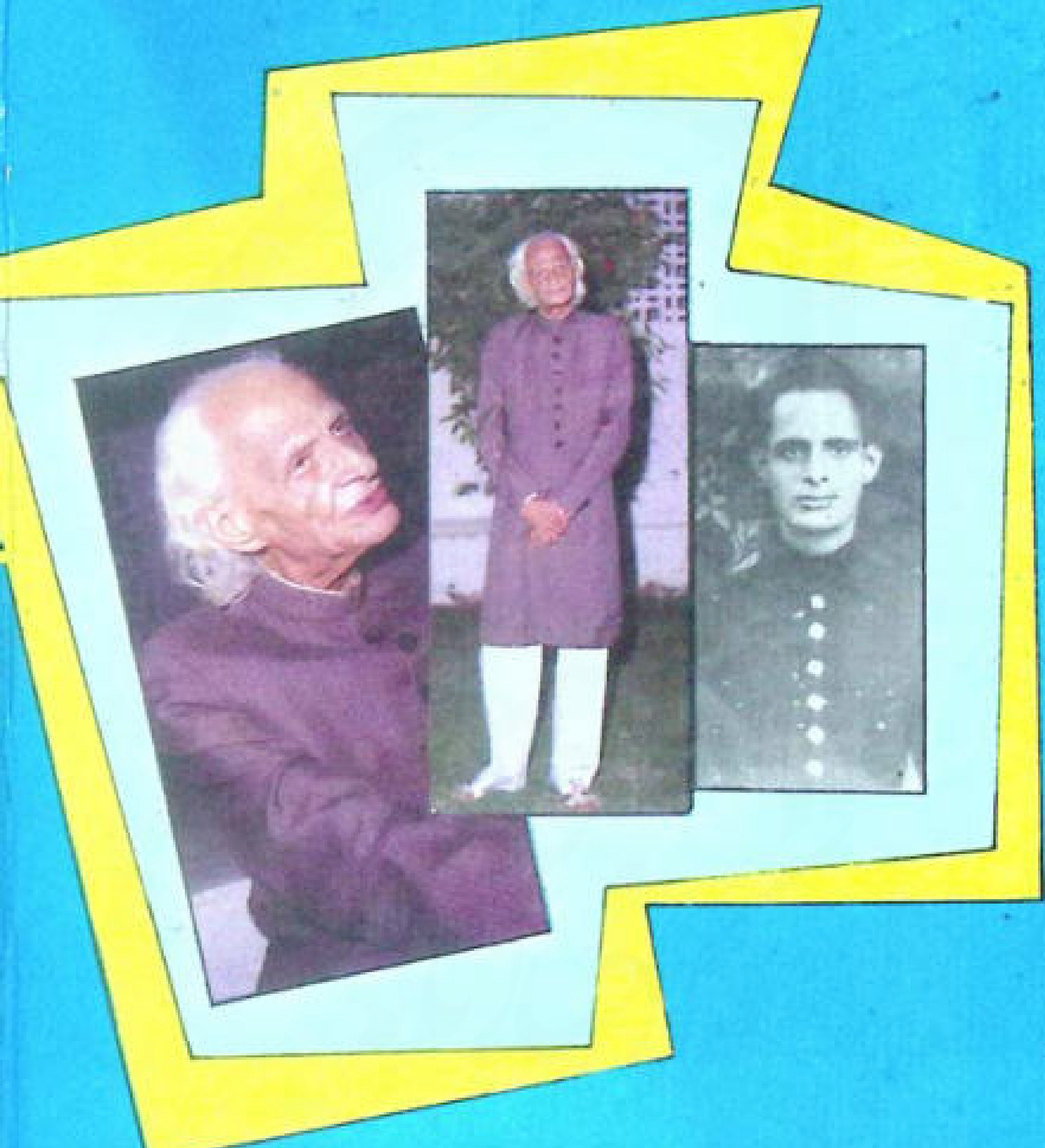
150/1